قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

مارچ 2026 قیمت 25₹

ماہنامہ اُردو دُنیا

نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

عالمی اردو کانفرنس 2026 کے شرکا

ماہنامہ
اُردو دُنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:28، شمارہ:3، مارچ 2026

مدیر : ڈاکٹر شمس اقبال
مدیر منتظم: ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی
نائب مدیر : نہاں
معاون مدیر: ڈاکٹر فیضان الحق
معاونین : ڈاکٹر عبدالرشید، محمد فرقان عالم

ناشر اور طابع
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع : سالاسار امیجنگ سسٹمس
B-19، سیکٹر 88، نوئیڈا۔ 201305 (یوپی)

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد امتیاز حسن
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/25 روپے، سالانہ -/240 روپے

صفحات: 100 Total Pages

- قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 011-35151993 | شعبۂ ادارت: 011-35152009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in

ای۔میل
editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ
- ہماری بات — مدیر — 4

خطوط
- آپ کی بات — قارئین — 5

رپورٹ
- عالمی اردو کانفرنس 2026 — ادارہ — 7

قومی تعلیمی پالیسی 2020
- قومی تعلیمی پالیسی 2020 اور ہندوستانی علاقائی زبانیں — ثوبان سعید — 16

- پنچ کوش فلسفہ اور ہمہ جہتی تعلیم — نوشاد حسین — 18
- قومی تعلیمی پالیسی اور مادری زبان — ایاز احمد خان — 23

زبان و تعلیم
- تعلیم میں مصنوعی ذہانت کا استعمال — مومن سمیہ — 27
- تعلیم اور ٹیکنالوجی — محمد جمشید عالم — 31

ڈیجیٹل انڈیا اور اردو
- ڈیجیٹل انقلاب اور اردو — گلاب سنگھ — 34
- اردو ادب میں ڈیجیٹل ثقافت کی تشکیل — عبدالرزاق — 37
- ادب اطفال میں سوشل میڈیا کے اثرات — کلدیپ راج آنند — 40

ادب، زاویے اور جہات
- معاصر اردو غزل کی شعریات — لیاقت علی — 43
- مثنویات میر میں مشترکہ ہندوستانی تہذیب — افضل مصباحی — 47

شخصیات
- رابندر ناتھ ٹیگور کی افسانہ نگاری — سراج انور، محمد میراں — 52

- شہزادی کلثوم کی شاعری — منظور احمد گنائی — 56
- راجا نرسنگھ راج عالی کی غزلیہ شاعری — پنکج کمار — 59
- شاطر گورکھپوری کی یاد میں — ارشاد احمد — 63

نیا آسمان نئے ستارے
- حسین الحق کی ناول نگاری — زبیدہ نسیم — 66
- داغ دہلوی کی شاعری میں عاشق و معشوق کا کردار — طریق العابدین — 68

کتابوں کی دنیا
- تعارف و تبصرہ — ادارہ — 71

جہان آگہی
- خبرنامہ — 81

ہماری بات

معزز قارئین!

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ موجودہ دور سائنس، ٹیکنالوجی اور ڈیجیٹل پلیٹ فارم کی برتری کا دور ہے۔ اس تبدیلی نے علوم و فنون کی تمام شاخوں کو متاثر کیا ہے۔ ایسی بہت سی کتابیں ہیں جو محض لائبریریوں تک محدود تھیں اور لوگ ان تک مشکل ہی سے پہنچ پاتے تھے۔ ڈیجیٹل پلیٹ فارم نے ان تک عام قارئین کی رسائی کو ممکن بنا دیا ہے۔ کتابوں کی اسکیننگ اور پی ڈی ایف فارمیٹ میں ان کی موجودگی تحقیق کو نہ صرف آسان بناتی ہے بلکہ اسے گہرے اور مضبوط دلائل کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ ٹیکنالوجی اور ڈیجیٹلائزیشن نے کتاب خوانی کے کلچر کو عام کرنے میں بھی نہایت اہم رول ادا کیا ہے۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ حکومت ہند بھی اس جانب خاص توجہ دے رہی ہے اور اس نے ڈیجیٹل انڈیا کے عنوان سے ایک موثر اور مثبت پلیٹ فارم تیار کیا ہے۔ یہ محض ایک نعرہ نہیں بلکہ ہندوستان میں تعلیم، تہذیب، ثقافت اور تحقیق میں نئی تبدیلیوں کی شروعات ہے۔ یہ تبدیلی اصول وضوابط کو مستحکم کرتی ہے۔ حکومت ہند کے اس اہم منصوبے کے تحت سرکاری محکموں کو ملک کے عوام سے جوڑنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس منصوبے کی مختلف جہات ہیں جن میں معاشی، معاشرتی اور ماحولیاتی فوائد شامل ہیں۔ ڈیجیٹل انڈیا بننے سے نہ صرف یہ کہ عوام سرکاری محکموں سے قریب ہوگی بلکہ وہ تمام چیزیں جن کے لیے بھاری رقم درکار تھی آسانی سے عوام تک پہنچ سکیں گی۔ اس کا ایک اہم مشن کاغذ کے استعمال کے بغیر سرکاری خدمات، علوم وفنون، اسکیموں اور دیگر معلومات کو برقی وسائل کے ذریعے عوام تک پہنچانا ہے۔ ڈیجیٹل انڈیا کے تینوں بنیادی اجزا (برقی بنیادی ڈھانچے کی تعمیر، اطلاعات وخدمات تک رسائی اور برقی خواندگی میں اضافہ) غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔

ڈیجیٹل انڈیا کی ترقی میں جہاں دیگر وسائل کا استعمال کیا جارہا ہے وہیں زبانوں کا کردار بھی نہایت اہم ہے۔ برقی ذرائع سے زبانیں مختلف معلومات اور تفصیلات عوام تک پہنچا رہی ہیں۔ ان زبانوں میں اردو کا کردار بھی غیر معمولی ہے، جس نے ڈیجیٹل پلیٹ فارمز پر اپنی موجودگی سے اردو قارئین کا حلقہ وسیع تر کر دیا ہے۔ اردو نے اپنے قارئین کو ڈیجیٹل اور سوشل پلیٹ فارم (فیس بک، انسٹاگرام، یوٹیوب، واٹس ایپ وغیرہ) پر وہ مواد فراہم کیا ہے، جو انگریزی اور دیگر زبان کے جاننے والوں کو میسر ہیں۔ موجودہ زمانے میں اردو کی اہم لغات، شعرا کی کلیات، داستانیں اور ناول وافسانے آسانی کے ساتھ ڈیجیٹل پلیٹ فارمز پر پڑھے جاسکتے ہیں۔ یونیکوڈ کی ایجاد نے رسم الخط سے جڑے مسائل کو حل کر دیا ہے۔ اب اردو زبان اپنی اصل صورت میں ہر پلیٹ فارم پر موجود ہے۔ یونیکوڈ کی ایجاد نے زبان سیکھنے کی راہ بھی ہموار کی ہے۔ شائقین کی ایک بڑی تعداد آن لائن اردو رسم الخط سیکھ رہی ہے۔ اس میں اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں مشغول تنظیموں کے ساتھ ان افراد کا بھی اہم کردار ہے جو اپنی ویڈیوز، پوسٹس اور ریلز کے ذریعہ اردو زبان کو اس کے خوبصورت تلفظ اور رسم الخط میں پیش کر رہے ہیں۔ کسی بھی پلیٹ فارم پر اردو کی موجودگی یہ احساس دلاتی ہے کہ ہندوستان کی ڈیجیٹل ثقافت کی تشکیل میں اس کا بھی اہم کردار ہے۔ اردو فن خطاطی اب نئی ٹیکنالوجی کے سہارے مزید ترقی کر رہا ہے اور نئی نئی ڈیزائنر سامنے آرہی ہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ٹیکنالوجی کسی زبان اور ثقافت کو نقصان پہنچانے کے بجائے اس کو مزید موثر بناتی ہے۔ شعر یا متن کی تحقیق میں بھی ڈیجیٹل فارم نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ڈیجیٹل پلیٹ فارمز پر موجود مواد ہر خاص وعام کے لیے دستیاب ہے۔ قومی اردو کونسل نے بھی اپنی مطبوعات کو ڈیجیٹل پلیٹ فارم عطا کرتے ہوئے انھیں ای۔ پب اور پی ڈی ایف کی شکل میں قارئین کے سامنے پیش کیا ہے اور رسائل و جرائد کے ذریعہ بھی اس اہم منصوبے کو فروغ دینے میں کوشاں ہے۔ اسی مناسبت سے ماہنامہ اردو دنیا کے تازہ شمارے میں تعلیم، ٹیکنالوجی اور ڈیجیٹلائزیشن سے متعلق مضامین شامل کیے جارہے ہیں۔

منظر اقبال

آپ کی بات

ماہنامہ'اردو دنیا' میں 'آپ کی بات' کے تحت قارئین کے تاثرات شائع کرنے کا مقصد رسالے کے مشمولات کے تئیں قارئین کی آرا سے واقفیت حاصل کرنا ہے۔ رسالے کے قلم کاروں اور قارئین سے گذارش ہے کہ مشمولات کے حوالے سے اپنے تاثرات ارسال کرنے کی زحمت کریں اور نئے موضوعات، مسائل، علاقوں اور ادبی و علمی شخصیات سے بھی مطلع فرمائیں۔ خطوط کی شکل میں موصول ہونے والے آپ کے یہ تاثرات ہمارے لیے بے حد اہم ہیں کیوں کہ ہمیں ان سے رسالے کو بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

اردو دنیا جنوری 2026 کا شمارہ رشید بک ڈپو (برہان پور، مدھیہ پردیش) پر دیکھتے ہی ہاتھ بلا اختیار اس کی جانب بڑھا اور پلک جھپکتے ہی میں نے اسے اپنی بغل میں دبا لیا۔ اس کے علاوہ وہاں سے بچوں کی دنیا اور دیگر کتابیں بھی خریدیں۔ اردو دنیا کا یہ شمارہ ایک دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی طباعت، ضخامت اور مواد کی حرارت قارئین کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتی۔ اس شمارہ میں شمس اقبال صاحب نے اردو کو سائنس و ٹیکنالوجی اور ڈیجیٹل دنیا سے جوڑنے کی جو بات کہی ہے، صد فیصد درست ہے۔ اس سلسلہ میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ شمس صاحب جس بات کے وکیل ہیں، ہم اس کے گواہ ہیں۔ اس میں علی گڑھ اردو کتاب میلہ کی تفصیلی رپورٹ بھی ہے۔ جو رواں دواں ہے۔ اس رپورٹ کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے ہم خود علی گڑھ میں موجود ہیں اور الگ الگ اسٹالوں پر جا کر اپنی پسند کی کتابیں خرید رہے ہیں۔ میر انیس پر شہیب نجمی کا مضمون، عبدالحلیم شرر پر احسان عالم کی تحریر، نیر مسعود کی تحقیقی خدمات پر صالحہ عاصم کا مختصر مقالہ، ماحولیاتی تنقید کے متعلق محمد اویس ملک کا نیا نظریہ اور ندا فاضلی کی نظم نگاری پر حبیب الرحمٰن کا آرٹیکل، ڈاکٹر منشا الرحمٰن منشا کی غزل گوئی پر شیخ عمران، قیصر الجعفری کی غزلیہ شاعری پر محمد اویس سنبھلی، ڈاکٹر بشریٰ رحمٰن کی ادبی خدمات پر ذاکر حسین ذاکر کی تحاریر پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس مرتبہ آپ نے بالی ووڈ اور اردو پر خاصہ مواد شامل اشاعت کیا ہے۔ اس کے لیے عبدالحافظ فاروقی، وسیم احمد، فرحان حنیف وارثی، منتظر قائمی، محی الدین عبداللطیف کو داد دی جانی چاہیے۔ بالخصوص فرحان حنیف وارثی کی تحریر آنجہانی دھرمیندر جی کی زندگی کے مختلف گوشہ جات کو وا کرتی ہے۔ قانونی صحافت پر خواجہ عبدالمنتقم کا مضمون بھی خاصہ کی چیز ہے۔

پروفیسر دیوان حنان خاں کی یاد میں معصوم مرادآبادی کا مضمون معلوماتی ہے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ شعبہ لسانیات کے اس ہر دل عزیز پروفیسر کے انتقال کی خبر بھی کسی اخبار میں نہ چھپ سکی۔ اس کے علاوہ حسب روایت اس شمارہ میں تحقیق وتنقید تبصرے اور کونسل کی سرگرمیوں کا جائزہ اہل اردو کو بھی مختلف سرگرمیوں کے لیے اکساتا ہے۔ کونسل کا عملہ اردو دنیا، اور خواتین کی دنیا کو مقبول و معلوماتی بنانے کے لیے شب و روز جو محنتیں کر رہا ہے، وہ رنگ لا رہی ہیں۔ یہ ہمارے رسالوں کی کامیابی ومقبولیت کی علامت ہے کہ اس ضمن میں ناچیز مدیر محترم کے ہمراہ پورے عملہ کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔

مشتاق کریمی، 342 شنی پیٹھ، جلگاؤں، مہاراشٹرا

دسمبر 2025 کے شمارہ میں غالب کی زندگی فکر وفن سے متعلق مضامین کو جگہ دی گئی ہے ذیلی عنوان بھی دیا گیا ہے کہ ہوگا کوئی ایسا بھی۔ 27 دسمبر 1797 یادگار تاریخ ہے ایسا ذہین لطیف اعلیٰ فکر، اعلیٰ اسلوب کا شاعر اردو میں اب تک نہ پیدا ہوا، مدیر ہماری بات میں یوں رقم طراز ہیں کہ میر کے بعد اردو میں غالب کا نام آتا ہے آنا بھی چاہیے۔ غالب کو پڑھنے سمجھنے افہام تفہیم کے لیے ایران، توران، اصفہان، عرب، عجم اور ہند کی تہذیب، تاریخ، تمدن، فلسفہ کو سمجھنا ناگزیر ہے غالب کا تخیل حشر خیز تھا۔ اداریہ میں ماہرین غالبیات کے ذکر کے ساتھ ان پر شرح لکھنے والوں کی تفصیل دی ہے معلومات میں اضافہ ہوا۔

کے ایم عظمت اللہ نے انڈین نالج سسٹم IKS اور موجودہ تعلیمی نظام کا تقابلی مطالعہ میں روایتی اور جدید تعلیم کی اہمیت کو مختلف جوازات ومثالوں سے واضح کیا ہے اور قدیم تعلیمی اداروں کا تعارف دیا ہے۔

مظفر اسلام نے شمولیاتی تعلیم کی روشن دنیا میں شمولیاتی تعلیم کی اہمیت ان کے تقاضے کو موثر انداز سے پیش کیا ہے صائمہ ثمرین نے خواتین میں اعلیٰ تعلیم کا فروغ میں خواتین کے تعلیمی اداروں کا تعارف کروایا ہے اسلام میں خاتون کی تعلیم کی اہمیت واضح کی ہے ایک عورت کی تعلیم ایک کنبہ خاندان نسل کی تعلیم ہے 20ویں صدی میں خواتین کی تعلیم کی طرف نسوانی تحریکات آگے آئی ہیں۔ مضمون معلوماتی اور بصیرت افروز ہے۔ رئیس انور نے اردو شاعری میں بنارس کی جھلکیاں میں جن شعرا نے بنارس کی خوبصورتی اور ایک روحانی مرکز کے طور پر منظوم خراج تحسین پیش کیا ہے۔ بنارس کی صبح اور اودھ کی شام مشہور ہے۔ بنارس ہندی تہذیب کا ایک اہم مرکز ہے ۔ ہندوؤں کا مقدس مقام ہے وہاں کی مکمل تصویر کشی کی ہے۔ ریاض توحیدی کشمیری نے اقبال مجید کی افسانہ نگاری میں ان کے مختلف افسانوی مجموعوں اور افسانوں کا تجزیہ کیا ہے ثمر آور ہوگا اگر طلبہ اس کو پڑھیں فائدہ اٹھائیں اقبال احمد نے جموں میں اردو کی صورت حال پر اچھا مضمون تحریر کیا ہے وہاں اس کا کیا موقف ہے حالات سے آگہی ہوئی ویسے پورے ہندوستان میں اب اردو کا اساس زمینی کام کرنے کی ضرورت ہے ہر صوبے میں نسل کو اردو لکھا اور سم الخط سے آگاہ کر و تحریک وعمل شروع کریں یہ وقت وحالات اردو زبان کا تقاضہ ہے ،نئی نسل ہی اردو کو آئندہ صدیوں میں لے جائے گی پھر بڑے لوگ چلے جائیں گے۔ اردو نسل نو سے ہی زندہ رہے گی۔ دانش وران اردو ایک نقطہ پر غور کریں۔

غالب پر چار مضامین میں غالب کے حالات زندگی اور ان کی شاعری کا تنقیدی تجزیہ ملتا ہے یہ چار مضامین غالب شناسی میں معتبر مستند اضافہ ہے۔ شخصیات کے تحت پانچ ادبی شخصیتوں پر مضامین ہیں ان کی زندگی اور ادبی تحریروں کا تجزیہ ملتا ہے۔ یاد رفتگان کے تحت بھی ڈاکٹر راہی معصوم رضا پر بھی مضمون ہے ۔ معصوم رضا نے اردو کو بہت کچھ دیا۔ لوگ بھول گئے ۔ ہندی والوں کو بھی نئے تراکیب الفاظ دیے۔ یہ پرچہ معیاری نوعیت کا ہے اردو دنیا میں تمام مضمون نگاروں کو مبارک باد دیتا ہوں اور اردو دنیا کے اسٹاف کو کہ وہ 21ویں صدی میں اردو کا ایسا معیاری رسالہ فراہم کر رہے ہیں اور اس میں اردو ادب کے عصری تقاضوں کے تحت مضامین، موضوعات ہوتے ہیں یہی عصری دور کا تقاضا ہے 100 صفحات میں قاری کو مختلف علوم وفنون سے آگہی کے ساتھ اردو ادب عمومی طور پر پیش کر رہا ہے۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی 17.7.335، یاقوت پورہ، حیدرآباد

گوشہ خوشونت سنگھ کے لیے حرف مبارکباد ذرا کم ہے، اس لیے قومی اردو کونسل کی اس کوشش کو مستحسن قرار دیتے ہوئے لائق تقلید یہ شمارہ کہنے کا حق رکھتا ہوں۔ بالخصوص جاوید عالم کا ترجمہ اور اس میں دی گئی جانکاری دلچسپی سے پڑھی۔ ترجمہ کی خوبی قاری کو مضمون پڑھنے پر آمادہ کرتی ہے پس ایک سطر عام فہم زبان میں کیے گئے ترجمہ کی پیش کر رہا ہوں، پڑھنے کے بعد لگتا ہے ترجمہ نہیں اصل متن کی قرات کی ہے۔ ''ٹیک کی لکڑی کے فرنیچر سے آراستہ یہ خوبصورت کمرہ مجھے مطالعہ کے لیے میرے والد نے دیا تھا''۔ جاوید عالم ابھی نوجوان ہیں ان سے مزید بہتر سلیس اور سادہ ترجمہ کی امید رکھی جائے۔ اپنے دور کی سماجی خرابیوں، ظلم وزیادتیوں کا تذکرہ بڑی بے باکی سے اس لیے بھی آنجہانی نے کیا کہ وہ کسی بھی سطح پر کمزور نہ تھے۔ قومی اردو کونسل نے خصوصی طور سے یہ کام کر کے کفارہ ادا کیا ہے۔ آنجہانی خوشونت سنگھ جی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے حوالے سے پیش کی گئی تحریریں مشعل راہ ہیں۔

قومی تعلیمی پالیسی اور اردو درس وتدریس کے امکانات بہترین تحریر ہے۔ ادارہ کی جانب سے قابل تحسین عمل دیکھنے کا اتفاق ہوا، مجھے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ قومی اردو کونسل اپنے قلمکاروں کو اتنی عزت دے گا، یا انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ شمارے کی اے آئی سے بنائی داخلی جاذبیت تصاویر کے ساتھ مواد سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ مدیر کی حیثیت سے آپ کا حسن نظر بہر طور پر سراہنے کے قابل ہے، توقع ہے اردو دنیا کے معیار میں کسی طرح کمی واقع نہیں ہوگی۔ تبصرہ وتعارف کے گوشے میں عمدہ کتابوں کا انتخاب قابل ستائش ہے۔ ادارتی ٹیم کی علمی استعداد قائل بناتی ہے، جن کے روشن مستقبل اور کامیابی کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کی دعا کرتا ہوں۔

ڈاکٹر حبیب سیفی حوض رانی، نئی دہلی

ماہ نامہ اردو دنیا کا تازہ شمارہ فروری 2026 موصول ہوا، اداریہ کے ساتھ مشمولات نے کافی متاثر کیا، سرورق کی دیدہ زیبی اور صفحات کی عمدگی بھی ہمیشہ کی طرح برقرار رہی۔ اس شمارے کی خاص بات گوشۂ خوشونت سنگھ کی شمولیت رہی، اس گوشے نے واقعی معلومات میں اضافہ کیا، خوشونت سنگھ کی ادبی شناخت مسلم رہی ہے، ان کے فکشن میں الگ دنیا آباد ہے، ان کی خدمات کا دائرہ وسیع اور متنوع ہے، ایسے میں ان کی شخصیت کو بنیاد بنا کر ایک گوشے کا التزام مدیر مکرم کا بہت ہی مستحسن قدم محسوس ہوا، جس کے لیے ان کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد، اس گوشے کے مضامین سے خوشونت سنگھ کی تفہیم میں کافی مدد ملی اور معلومات میں غیر معمولی اضافہ ہوا، اس کے ساتھ دیگر مشمولات بھی اہم معلوم ہوئے، جس میں تعلیم وتہذیب کے پہلوؤں کی مختلف نشاندہی ممکن ہو سکی۔ مجموعی طور پر اردو دنیا کا تازہ شمارہ فروری 2026 قارئین کے لیے قابل مطالعہ ہے جس کے مشمولات سے بھرپور استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ جس کے لیے رسالے کے مدیر اور ان کی پوری ٹیم کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد۔

عبدالرحمن گولہ گنج لکھنؤ

ادارہ

عالمی اردو کانفرنس

عالمی اردو کانفرنس کے ذریعہ قومی اردو کونسل مختلف موضوعات کے تحت ملک اور بیرون ملک کے ادیبوں اور دانشوروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرتی رہی ہے۔ گذشتہ برس انڈیا انٹرنیشنل سینٹر، نئی دہلی میں منعقد ہونے والی عالمی اردو کانفرنس کا موضوع ''وکست بھارت کاوژن، اردو زبان کا مشن'' تھا وہیں اس سال ''کثیر لسانی ہندوستان میں اردو زبان و تہذیب'' کے عنوان سے یہ کانفرنس منعقد کی گئی، جس میں قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے تناظر میں متعدد مقالے پیش کیے گئے۔ اس کانفرنس میں تقریباً 90 دانشوروں نے شرکت کی، جن میں ہندوستان کے علاوہ یو کے، سویڈن، فرانس، جرمنی، موریشس، جاپان، مصر اور قطر جیسے ممالک کے ادبا شامل ہیں۔ کانفرنس میں افتتاحی اور اختتامی سیشن کے علاوہ، چھ تکنیکی سیشن اور تین ثقافتی تقاریب (ہیومر باز، شام غزل، مشاعرہ) کا بھی اہتمام کیا گیا، جن میں کثیر تعداد میں سامعین موجود رہے۔ پیش ہے اس کی یومیہ رپورٹ۔ (ادارہ)

6 فروری، 2026

آج وزیر اعظم میوزیم، تین مورتی مارگ، دہلی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے منعقد کیے جانے والے عظیم الشان تین روزہ عالمی اردو کانفرنس کا افتتاح عمل میں آیا۔ 'کثیر لسانی ہندوستان میں اردو زبان و تہذیب' کے عنوان سے منعقد ہونے والی اس کانفرنس کا افتتاح شمع روشن کرکے کیا گیا۔ اس موقعے پر جناب ایم۔ جے۔ اکبر (معروف صحافی و سابق وزیر مملکت برائے امور خارجہ، حکومت ہند)، پروفیسر طارق منصور (رکن لیجسلیٹو کونسل، اتر پردیش و سابق وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)، پروفیسر سید عین الحسن (وائس چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد) و محترمہ کامنا پرساد (بانی جشن بہار ٹرسٹ) موجود رہے۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے شال پوشی و مومنٹو کے ذریعہ ان تمام مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس ملک میں بولی جانے والی بے شمار زبانوں میں اردو زبان کئی اعتبار سے منفرد ہے۔ اردو کا کوئی مخصوص علاقہ نہیں لیکن اردو ہر علاقے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ 2047 میں جب ملک وکست بھارت کا جشن منا رہا ہوگا اس وقت ملک کی زبانوں کا کردار بھی قابل دید ہوگا۔ اس لیے اردو زبان کی ترقی کے لیے اسے نئی ٹیکنالوجی سے جوڑنا اور نئے تقاضوں کے مطابق بنانا ضروری ہے۔ انھوں نے کانفرنس کے حوالے سے مختلف موضوعات و مسائل کا بھی ذکر کیا اور ملک و بیرون ملک سے تشریف لانے والے مہمانوں کا استقبال کیا۔ آپ نے وزیر تعلیم عزت مآب جناب دھرمیندر پردھان اور حکومت ہند کا بھی شکریہ ادا کیا۔ مہمان اعزازی کامنا پرساد نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کثیر لسانی ہندوستان کے منظر نامے پر روشنی ڈالی اور ملک میں زبان کی صورت حال سے آگاہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو کا وجود ہندوستان کی ہزاروں سال کی تہذیبوں کے میل جول سے عمل میں آیا ہے اور مختلف ہندوستانی زبانوں میں اس کے اثرات نظر آتے ہیں۔ عربی، فارسی، سنسکرت اور دیگر زبانوں

ہے جو اسے محسوسات کی زبان بنا دیتا ہے۔ اردو نے لوگوں کو حساسیت کا مزاج عطا کیا۔ مہمان ذی وقار پروفیسر طارق منصور (رکن لیجسلیٹو کونسل، اتر پردیش وسابق وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) نے عالمی اردو کانفرنس کے انعقاد کو خوش آئند قرار دیتے ہوئے ڈاکٹر شمس اقبال کو مبارکباد پیش کی اور کہا کہ ہندوستان زبانوں کے اعتبار سے بیحد ثروت مند ہے۔ انھوں نے ملک کے مختلف شہروں میں قومی اردو کونسل کے کامیاب کتاب میلوں کا ذکر کرتے ہوئے اسے اردو زبان کی مقبولیت قرار دیا اور اعداد وشمار سے ثابت کیا کہ اس کے بولنے والے ملک کے ہر خطے میں پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان کی مقبولیت میں اضافہ کرنے کے لیے ذاتی طور پر کوششیں کرنی بھی ضروری ہیں۔ اردو زبان کے رسم الخط کو باقی رکھنا اور اسے سیکھنا اس کی بقا کے لیے بیحد اہم ہیں۔ اردو کا دیگر قدیم ہندوستانی زبانوں سے بھی رشتہ ہے۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں مادری زبان کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے اور اردو آبادی کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اردو خالص ہندوستان کی زبان ہے اور اس کا

کی آمیزش کا سلسلہ بہت قدیم ہے اور اس طرح یہ زبان شیریں تر ہوتی گئی۔ انھوں نے کہا اردو کہیں عشق کے اظہار کی زبان بنی تو کہیں ملک کی آزادی کے لیے انقلاب کی آواز بنی۔ وقت گزرنے کے ساتھ لسانی آمیزش کا سلسلہ جاری ہے اور یہ وقت کی ضرورت ہے۔ اردو ہندوستانی زبان ہونے کے ساتھ اس کی تہذیب وثقافت کی نمائندہ ہے۔ کشادہ دلی، اعلیٰ ظرفی اور ملائمیت اس زبان کی بڑی خوبیاں ہیں۔ انھوں نے ڈاکٹر شمس اقبال کو اس اہم زبان سے متعلق جشن بپا کرنے کے لیے مبارکباد پیش کی اور شکریہ بھی ادا کیا۔ دوسرے مہمان اعزازی پروفیسر سید عین الحسن (وائس چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد) نے اردو زبان کی کشادہ قلبی اور دوست نوازی پر اظہار خیال کیا اور دیگر زبانوں کے ساتھ اردو کے خوبصورت میل جول پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے اردو زبان کی شیرینی کے ساتھ اس میں پائے جانے والے طنز، اشارہ اور کنایہ کی خوبیوں کا بھی ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو نے ہر کسی کا احترام کیا۔ فلمی نغموں نے خوش کلامی کے خوبصورت نمونے پیش کیے۔ ایسی صورت میں اس کی مقبولیت سے کسے انکار ہوسکتا ہے۔ اردو میں ایک نمک

تعلق کسی مخصوص طبقے سے نہیں۔ عالمی اردو کانفرنس اردو کی کامیابی اور ترویج کا سبب بنے گی۔ مہمان خصوصی جناب ایم۔ جے۔ اکبر (معروف صحافی وسابق وزیر مملکت برائے امور خارجہ، حکومت ہند) نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان میں نے اپنی ماں سے سیکھی۔ اردو ایک ایسی زبان ہے جو صرف محبت سے نہیں آتی بلکہ اس کے لیے جنون چاہیے۔ اردو زبان کسی مذہب کی زبان نہیں لیکن 1947 کا سانحہ اس غلط فہمی کا سبب بنا۔ البتہ ہمیں اس غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ ہم آج جس مجلس میں بیٹھے ہیں اس میں اردو پر یقین کرنے والے اور اسے اپنا بنانے والے افراد موجود ہیں۔ اردو ہماری شناخت ہے، اس کے بغیر ہندوستان کمزور ہو جائے گا۔ یہ محبت کی زبان ہے اور کتاب میلوں کی کامیابی سے اس کے قارئین کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اردو کے تئیں اپنا ذہن و دماغ صاف رکھنا بھی ضروری ہے۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کی مطبوعہ کتاب "دکست بھارت کا وژن اور اردو زبان" کا اجرا بھی کیا گیا۔ یہ کتاب گزشتہ عالمی اردو کانفرنس اور پٹنہ سمینار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ ہے، جسے ڈاکٹر محمد شمس اقبال نے ترتیب دیا ہے۔ اس افتتاحی سیشن کی نظامت ڈاکٹر حفیظ الرحمن (کنوینر، خسرو فاؤنڈیشن، نئی دہلی) نے اور شکریے کی رسم ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک، این سی پی یو ایل) نے انجام دی۔ تقریب کا اختتام راشٹر گان پر ہوا۔ افتتاحی سیشن کے بعد ایم اے انصاری آڈیٹوریم (جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) میں "ہیومر باز" کے عنوان سے ایک مزاحیہ ثقافتی تقریب بھی منعقد کی گئی، جس میں معروف اداکار اور کامیڈین جناب رحمان خان نے اپنے رفقا کے ساتھ فن کاری کا مظاہرہ کیا۔ ڈاکٹر جاوید حسن نے اس پروگرام کا تعارف پیش کیا۔ اس موقع پر ملک اور بیرون ملک کے مہمانوں کے علاوہ کونسل کے معزز اراکین، افسران اور سامعین کی بڑی تعداد موجود رہی۔

7 فروری، 2026

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام عالمی اردو کانفرنس' بہ عنوان' کثیر لسانی ہندوستان میں اردو زبان و تہذیب' کے موضوع پر انڈیا انٹرنیشنل سینٹر نئی دہلی میں آج تین تکنیکی سیشنز منعقد ہوئے۔ پہلے تکنیکی سیشن میں بہ حیثیت صدور پروفیسر امتیاز حسنین اور پروفیسر چندر شیکھر شامل ہوئے، جب کہ محترم جانکی پرساد شرما، پروفیسر محمد قطب الدین، پروفیسر رضوان احمد، ڈاکٹر کے پی شمس الدین اور جناب فیروز احمد بحیثیت مقالہ نگار شریک ہوئے۔ اس سیشن کی نظامت ڈاکٹر عبدالرزاق زیادی نے کی۔ پروفیسر امتیاز حسنین نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ جنون نے ہی اردو کو کوسمو پولیٹن زبان بنایا۔ اردو نے دیگر زبانوں پر اپنے اثرات مرتب کیے اور ان کے مصنفین نے دیگر زبانوں اور تہذیبوں کو بھی متاثر کیا۔ بالخصوص شبلی کی 'شعرالعجم' اور سید سلیمان ندوی کی تصانیف گہرے طور پر اثر انداز ہوئیں۔ انھوں نے سیشن کے تمام مقالوں پر گفتگو کرتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا اور ترجمہ پر زور دیتے ہوئے اس کو موجودہ وقت کی اہم ضرورت قرار دیا۔ پروفیسر چندر شیکھر نے صدارتی تقریر میں زبان و ادب کے مابین رشتے پر گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ عوامی زبان ادب سے مقبول نہیں ہوتی ہے۔ زبان کہیں بھی جائے وہ اپنی صورت میں زندہ رہتی ہے۔ مثلاً ایک ہندوستانی مزدور کسی دوسرے ملک میں جائے تو وہ اپنی عام بول چال میں مادری زبان کا استعمال کرتا ہے۔ اردو زبان کی تعلق سے انھوں نے کہا کہ جب تک اس زبان کے بولنے والے خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں، موجود ہیں تب تک یہ زبان زندہ رہے گی۔ محترم جانکی پرساد شرما نے 'اردو اور ہندی : باہمی اثر پذیری اور اثر انگیزی' پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ دنیا کی کسی بھی زبان کا رسم الخط اپنے آپ میں مکمل نہیں ہے۔ اس بابت انھوں نے زبانوں کے باہمی رشتوں پر دلائل کے ساتھ گفتگو کی۔ اردو اور ہندی زبانوں کے

بارے میں کہا کہ انھوں نے ایک دوسرے کے الفاظ کو کثیر تعداد میں اپنی زبان کا حصہ بنایا ہے۔ پروفیسر محمد قطب الدین نے 'اردو زبان وادب کی توسیع واشاعت میں تراجم کا حصہ' کے موضوع پر عربی ادب کے تراجم کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اس کے ذریعے اردو زبان کے اسلوب اور تراکیب و الفاظ کو بہت تقویت حاصل ہوئی۔ عربی سے آنے والے الفاظ ومحارات اردو میں بہت مقبول ہوئے ہیں۔ پروفیسر رضوان احمد نے 'قطر کی علاقائی زبانوں پر اردو کے اثرات' کی صورت حال پر نہایت اہم گفتگو کی۔ اس موقعے پر انھوں نے ہندوستان اور عرب ممالک میں تہذیب وثقافت اور عام بول چال میں مروج الفاظ کے استعمال کے تعلق سے مفید باتیں بتائیں۔ جناب کے۔ پی۔ شمس الدین نے 'کیرلہ میں اردو زبان و ادب' کے موضوع پر پرمغز مقالہ پیش کیا۔ جناب فیروز احمد نے 'لداخ کی علاقائی زبانوں پر اردو زبان وادب کے اثرات' کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔ دوسرے تکنیکی سیشن کی صدارت پروفیسر مظفر علی شہ میری نے کی۔ جب کہ مقالہ نگاران میں پروفیسر احمد محفوظ، پروفیسر اخلاق احمد آہن، پروفیسر وبھا شرما، ڈاکٹر نسیم احمد نسیم، محترم مامیا کینسا کو شامل ہوئے۔ اس سیشن کی نظامت جناب مالک اشتر نے کی۔ پروفیسر مظفر علی شہ میری نے صدارتی تقریر پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس کانفرنس کا موضوع بہت اہم ہے اس کے لیے میں قومی

اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال اور دیگر عملے کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ انھوں نے تمام مقالہ نگاروں کے مقالوں پر تفصیلی گفتگو کی۔ انھوں نے اردو تہذیب کے حوالے سے کہا کہ موجودہ دور میں تہذیب دراصل ٹیکنالوجی اور مشینوں کے ذریعے سمجھنے کا نام ہے۔ پروفیسر احمد محفوظ نے' کلاسیکی اردو شاعری پر فارسی کے اثرات' کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ بیشک فارسی زبان اردو سے بہت الگ ہے لیکن کلاسیکی اور ادبی تہذیب کے لحاظ سے دونوں کا رشتہ بہت قریبی ہے۔ پروفیسر اخلاق احمد آہن نے 'کثیر لسانی ہندوستان میں فارسی اور اردو کے ادبی وتہذیبی رشتے' کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان میں فارسی کے اثرات دوسری زبانوں میں بھی کثرت سے

نظر آتے ہیں۔ پروفیسر وبھا شرما نے کہا کہ اردو انگریزی ہی کی طرح ایک انگلوز یولینگویج ہے۔ اس کا موازنہ انگریزی سے ہی کیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر نسیم احمد نسیم نے اردو اور بھوجپوری کے رشتے پر پرمغز گفتگو کی۔ جاپان سے تشریف لائے محترم مامیا کینسا نے اردو اور ہندی کے رشتے کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ میں نے جاپان میں اردو کے علاوہ ہندی زبان بھی سیکھی ہے۔ انھوں نے اپنے مقالے میں رسم الخط کے حوالے سے بھی اہم نکات پیش کیے۔ تیسرے سیشن کے صدر پروفیسر انیس الرحمن نے مقالہ نگاران کے مقالوں کے تعلق سے گفتگو کرتے ہوئے اہم نکات کی نشاندہی کی۔ انھوں نے کہا کہ تقابلی مطالعات کے پیرامیٹرز طے کرنا بنیادی کام ہے۔ یہاں یہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ تقابلی مطالعہ زبان کا ہورہا ہے، یا لہجے کا۔ میرے حساب سے ہم پیرامیٹرز کو زبان کے ذریعے ہی طے کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ترجمے کے وقت اسے تھیورٹائز کرنا بھی بہت ضروری ہے۔ پہلے مہمانِ اعزازی جناب فیروز بخت احمد نے کہا کہ کئی لوگ اردو کو مذہب اور کلچر کی زبان کہتے ہیں، میرے حساب سے یہ مناسب نہیں ہے، اردو سب کی ہے۔ دوسرے مہمانِ اعزازی پروفیسر فاروق انصاری نے کہا کہ ترجمہ تخلیق سے مشکل کام ہے اور اس کی ضرورت ہے۔ ترجمہ اردو کے فروغ و اشاعت میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ ڈاکٹر ماہر منصور نے 'کنڑ اور اردو زبان کے باہمی تراجم پر ایک نظر' کے موضوع پر مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ کنڑ زبان نے اردو اور فارسی سے

بہت زیادہ اخذ و استفادہ کیا ہے، یہ اور بات کہ اردو سے کنڑ میں تراجم کم ہوئے ہیں۔ کنڑ اور اردو کے مابین رشتے کو وسیع کرنے کے لیے مزید تراجم کی ضرورت ہے۔ جناب اسلم مرزا نے 'اردو زبان وادب کی توسیع و اشاعت میں تراجم کا حصہ' کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اردو کو ثروت مند بنانے میں مختلف زبانوں کے تراجم کا نمایاں حصہ ہے۔ اس بابت انھوں نے فورٹ ولیم کالج کی مثال پیش کی۔ ڈاکٹر شفق سوپوری نے 'اردو کے کشمیری زبان پر جمالیاتی، تہذیبی و ثقافتی اور ادبی و لسانی اثرات' پر بات کرتے ہوئے کہا کہ زبانوں کو زندہ رکھنے میں قواعد کا بہت اہم کردار ہے۔ ہم نے اردو کے ان الفاظ کو قبول کیا جو قومی جمالیات کے مطابق تھے اور جو اس کے خلاف تھے انھیں رد کردیا۔ یہ زبان کی صوتی خوبی کو ظاہر کرتا ہے۔ پروفیسر احمد عبدالرحمن القاضی نے 'مصر میں ہندوستانی زبانوں کی تعلیم اور عربی شعور کی تشکیل میں ترجمہ نگاری کا کردار' پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ جب بھی عرب اور ہندوستان کو ایک دوسرے کو سمجھنے اور احساسات کو محسوس کرنے کی ضرورت پڑی تو اس میں تراجم نے نہایت اہم رول ادا کیا۔ مصر کی کچھ جامعات اور یونیورسٹیز میں اردو کو بطور نصاب بھی شامل کیا گیا۔ ڈاکٹر آصف علی مودو نے 'ماریشس میں بولی جانے والی مختلف زبانوں پر اردو کے اثرات' کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ماریش میں اردو کے فروغ میں مہاجرین کا اہم کردار ہے۔ جن میں اتر پردیش، بہار، مہاراشٹر اور دکن کے کچھ صوبے قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر امان اللہ ایم بی نے 'تمل اور اردو: لسانی و ادبی تقابل، افکار واقدار اور باہمی اشتراک' کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو اور تمل کا بہت پرانا رشتہ ہے۔ اس کا سہرا دکن کو جاتا ہے، دونوں زبانوں کی گرامر بھی تقریباً ملتی جلتی ہے۔ تکنیکی سیشنز کے بعد ایم اے انصاری آڈیٹوریم (جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) میں ''شام غزل'' کے عنوان سے ایک شاندار ثقافتی تقریب کا اہتمام کیا گیا، جس میں معروف غزل سنگر جناب راجیش سنگھ نے اپنے رفقا کے ساتھ مختلف غزلوں اور نغموں سے محظوظ کیا۔ ڈاکٹر فیضان الحق نے اس پروگرام کا تعارف پیش کیا اور مہمانوں کا استقبال کیا۔ اس موقعے پر ملک اور بیرون ملک سے تشریف لانے والے مہمانوں کے علاوہ کونسل کے افسران، اراکین اور عملہ کے ساتھ سامعین کی بڑی تعداد موجود رہی۔

8فروری، 2026

کثیر لسانی ہندوستان میں اردو زبان وتہذیب کے عنوان سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کی جانب سے منعقد کیے جانے والے عالمی اردو کانفرنس کے تیسرے دن تین اہم تکنیکی سیشنز اور مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ ان تینوں سیشنز میں اردو زبان کے دیگر زبانوں سے لسانی، ثقافتی، ادبی اور تہذیبی انسلاکات پر مختلف دانشوروں کی جانب سے اظہار خیال کیا گیا۔ صدور اجلاس نے عالمی اردو کانفرنس کے اس موضوع کو وقت کی ضرورت قرار دیتے ہوئے قومی اردو کونسل اور اس کے ڈائرکٹر کو مبارکباد پیش کی اور اسے اردو کی ترویج و اشاعت کا ایک سنگ میل قرار دیا۔ پہلے سیشن میں ڈاکٹر خواجہ افتخار احمد بطور صدر، پروفیسر شافع قدوائی اور پروفیسر روی ٹیک چندانی بطور مہمانان اعزازی شریک ہوئے۔ جبکہ پروفیسر شمبھوناتھ تیواری، پروفیسر انتخاب حمید، جناب خاور نقیب، جناب شبیر احمد اور محترمہ اسما امروز نے مقالات پیش کیے۔ اس سیشن کی نظامت محترمہ نہاں رباب نے کی۔

صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر خواجہ افتخار احمد نے کہا کہ ہندوستان جڑ کا نام ہے اور اس کی بہت سی شاخیں ہیں۔ اس کی ہر شاخ کو ہرا رکھنا ہماری ذمہ داری ہے۔ نیز اردو کو عام فہم اور دور رس بنانے کے لیے آسان الفاظ کا استعمال ضروری ہے۔ اردو مسلمان کا نام نہیں، ہندوستان کا نام ہے۔ اس طرح کی کانفرنس ملک میں ہر طرح کی ہم آہنگی کا باعث ہوتی ہے۔ بین المذاہب ہم آہنگی میں زبان بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس اعتبار سے بھی یہ کانفرنس بے حد خاص ہے۔ پہلے مہمان اعزازی پروفیسر روی ٹیک چندانی نے سندھی و اردو کے لسانی روابط پر اظہار خیال کیا اور زبانوں کے فروغ پانے کے اصول وضوابط پر بھی روشنی ڈالی۔ دوسرے مہمان اعزازی پروفیسر شافع قدوائی نے کانفرنس کے عنوان کے مختلف پہلوؤں کی جانب اشارہ کیا اور ملٹی لنگولزم کی افادیت اور اس کے خطرات سے بھی آگاہ کیا۔ انھوں نے پانی، آنند وردھن اور ابھینو گپت کا ذکر کرتے ہوئے اردو زبان و ادب پر ان کے افکار و نظریات کے اثرات کی بھی

نشاندھی کی۔ محترمہ اسما امروز نے تیلگو اور اردو زبان کے لسانی روابط پر اپنا مقالہ پیش کیا اور مثالوں کے ذریعہ ایسے کئی الفاظ کی نشان دہی کی جو دونوں زبانوں میں معمولی تبدیلی کے ساتھ رائج ہیں۔ دوسرے مقالہ منطق اور نتائج کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا اور کانفرنس کے موضوعات کو قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے عین مطابق قرار دیا۔ پروفیسر شمبھوناتھ تیواری نے اردو میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے متعلق اپنے

نگار جناب خاور نقیب نے انڈین نالج سسٹم کے حوالے سے اپنا مقالہ پیش کیا اور مختلف تہذیبوں سے جوڑنے میں اردو تراجم کو اہم قرار دیا۔ جناب شبیر احمد نے قومی وراثت و ثقافت اردو تراجم کے آئینے میں کے عنوان سے مقالہ پیش کیا اور کئی اہم نکات کی جانب توجہ دلائی۔ پروفیسر انتخاب حمید نے زبان کی معاملاتی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مقالہ پیش کیا اور مختلف تہذیبوں کی آمیزش کو ہندوستان کی سب سے بڑی خوبصورتی بتایا۔ دوسرے سیشن میں بطور صدر پروفیسر سید عین الحسن اور مہمان اعزازی کی حیثیت سے ڈاکٹر جمیل اختر شریک ہوئے۔ مقالہ نگاروں میں پروفیسر مشتاق عالم قادری، پروفیسر جلال الحفناوی، ڈاکٹر تاشیانہ شمتلی، ڈاکٹر ایلن ڈسولیریس اور ڈاکٹر سفینہ بیگم کے نام شامل ہیں۔ اس سیشن کی نظامت ڈاکٹر نثار احمد خان نے انجام دی۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر عین الحسن نے تمام مقالہ نگاروں کے مقالات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اردو کو کم آنکنے کی ضرورت نہیں، اس نے مختلف علوم وفنون کو اپنے اندر جذب کرلیا ہے۔ انھوں نے مختلف زبانوں کے لسانی روابط سے اردو کے فروغ کی جانب بھی اشارہ کیا۔ مہمان اعزازی ڈاکٹر جمیل اختر نے لسانی روابط کے حوالے سے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردو نے دوسری زبانوں پر جو اثرات مرتب کیے ان پر گفتگو ہونی ضروری ہے۔ ڈاکٹر سفینہ بیگم نے روبندر ناتھ ٹیگور کی کہانیوں کے دو تراجم کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ ماریشس سے تشریف لائیں ڈاکٹر تاشیانہ شمتلی نے اردو اور ماریشی زبان کے لسانی روابط سے متعلق خیالات کا اظہار کیا اور ان دونوں کے مابین ہم آہنگی کے پہلو تلاش کیے۔ پروفیسر مشتاق عالم قادری نے گوجری غزل پر اردو زبان کے اثرات کے عنوان سے مقالہ پیش کرتے ہوئے اس کی متعدد مثالیں پیش کیں۔

پروفیسر جلال الحفناوی (مصر) کے مقالے کا موضوع اردو اور عربی زبان کے لسانی روابط سے متعلق رہا۔ انھوں نے اردو میں رائج عربی کے مرکبات اور محاورات پر بھی اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر ایلن ڈسولیر لیس (فرانس) نے ''تصوف اور تصور، ہسپانوی اور اردو'' کے موضوع پر اظہار خیال کیا اور کچھ مترجم نمونے بھی پیش کیے۔ تیسرے سیشن کی صدارت پروفیسر قدوس جاوید نے کی اور مہمانان اعزازی کے طور پر پروفیسر اعجاز علی ارشد اور پروفیسر ارتضیٰ کریم شریک ہوئے۔

پروفیسر ہینز ورنر، اور جناب محمد سیفی عمری نے اپنے مقالے پیش کیے۔ اس سیشن میں نظامت کے فرائض ڈاکٹر احسن ایوبی نے انجام دیے۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر قدوس جاوید نے کہا کہ ہندوستان محض جغرافیائی خطے کا نام نہیں بلکہ کثیر الجہات تہذیبوں کا نام ہے۔ ہماری مشترکہ تہذیب کی جڑیں ویدک کال میں پیوست ہیں۔ آپ نے کہا کہ اردو کی شناخت اس کی علامات، استعارات اور کنایوں سے قائم ہوتی ہے۔ لفظ محض لفظ نہیں بلکہ ایک تصویر، آواز اور طویل تاریخ وتہذیب کا نمائندہ ہوتا ہے۔ مہمان اعزازی پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ دیگر زبانوں کے جاننے والوں کو بھی اردو زبان وتہذیب کی نمائندگی کے متعلق غور کرنا چاہیے اس سے زبان کے فروغ کا دو طرفہ عمل سامنے آئے گا۔ دوسرے مہمان اعزازی پروفیسر اعجاز علی ارشد نے کہا کہ دیگر زبانوں کے الفاظ اور اثرات قبول کرنا کسی بھی زبان کی ترقی کے لیے خوش آئند ہے۔ انھوں ل ے اردو زبان کو لسانی جمہوریت کا بہترین نمونہ قرار دیا۔ مقالہ نگاروں میں جناب محمد سیفی عمری نے اردو اور تمل زبان کا ادبی ارتباط اور اشتراک کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا اور ان کے مابین صرفی اور ہیئتی مطابقت پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر ہینز ورنر (سویڈن) نے کثیر لسانی ہندوستان میں اردو زبان وتہذیب کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے مختلف زبانوں کے آپسی میل جول اور اثرات کی نشاندہی کی۔ اس سہ روزہ عالمی اردو کانفرنس کا اختتام قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شمس اقبال کے کلمات پر ہوا۔ انھوں نے کانفرنس کے متعلق وزیر اعظم عزت مآب شری نریندر مودی کا پیغام سنایا اور اپنے

خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس میں مختلف علاقوں کی نمائندگی ہوئی ہے۔ کثیر لسانی ہندوستان میں اردو زبان وتہذیب کے متعلق انھوں نے کہا کہ ہمیں کسی ہر مقام پر ہے۔ اردو کو دور رس بنانے کے لیے تلفظ اور ادائیگی کی گرفت سے باہر نکلنا ہوگا۔ یہ ہندوستان کی زندہ زبان ہے اور ملک کی ترقی میں اپنا تعاون پیش کر

ایک دائرے میں محدود رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مختلف علاقوں سے اس کی نمائندگی ہونا یہ بتاتا ہے کہ اردو میں مختلف تہذیبوں کی شمولیت ہے۔ زبانوں کی ادبیات کا لین دین ہوتے رہنا چاہئے۔ اردو ہر صوبہ، ہر ضلع اور رہی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ جس طرح ہم اردو کے الفاظ دیگر زبانوں میں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اسی طرح اردو میں دیگر زبانوں کے الفاظ استعمال کرنے پر بھی فراخ دلی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ قومی اردو کونسل نے حالیہ سرگرمیوں میں قریب سات سو افراد کو شامل کیا ہے اور نئی نسل کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے عالمی اردو کانفرنس کے لیے منتخب ہونے والے تین نوجوان اسکالرس محمد فیروز احمد (لداخ) اسما امروز (تلنگانہ)، محمد سیفی عمری (تامل ناڈو) کو مبارکباد پیش کی اور ملک و بیرون ملک کے تمام مہمانوں، مقالہ نگاروں، اراکین اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ کانفرنس کے اختتام پر ایک خوبصورت مشاعرے کا بھی انعقاد کیا گیا جس کی صدارت بزرگ شاعر محترم چندربھان خیال نے کی۔ اس مشاعرے میں پروفیسر شہپر رسول، ڈاکٹر پاپولر میرٹھی، جناب شکیل جمالی، پروفیسر سراج اجملی، جناب نعمان شوق، جناب افضل منگلوری، ڈاکٹر ماجد دیوبندی، جناب مظفر ابدالی، جناب منیش شکلا اور ڈاکٹر قمر سرور نے بطور شاعر شرکت کی اور اپنے کلام سے نوازا۔ مشاعرے کی نظامت کے فرائض جناب معین شاداب نے انجام دیے اور تعارف واستقبال جناب محمد اکرام نے پیش کیا۔

■

قومی تعلیمی پالیسی 2020 اور ہندوستانی علاقائی زبانیں

ثوبان سعید

قومی تعلیمی پالیسی (NEP2020) ہندوستانی تعلیمی نظام میں ایک بنیادی فکری اور ساختی تبدیلی کی نمائندہ ہے، جس میں زبان کو محض ذریعہ تعلیم نہیں بلکہ تہذیبی شناخت، سماجی شمولیت، فکری ارتقا اور قومی یکجہتی کا ستون قرار دیا گیا ہے۔ پالیسی مادری زبان اور علاقائی زبانوں میں ابتدائی تعلیم، سہ لسانی فارمولے میں لچک، اعلیٰ تعلیم میں مقامی زبانوں کے استعمال، ترجمہ و تالیف کے فروغ، اور ڈیجیٹل پلیٹ فارمز پر ہندوستانی زبانوں میں مواد کی تیاری جیسے اقدامات پر زور دیتی ہے۔ زیر نظر مقالہ NEP2020 کے لسانی وژن کا تجزیہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس امر کی نشان دہی کرتا ہے کہ یہ پالیسی کس طرح ہندوستانی اور علاقائی زبانوں کے فروغ کے لیے نئے امکانات پیدا کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عملی نفاذ کے چیلنجز، سماجی رویے، ادارہ جاتی رکاوٹیں، اور مستقبل کی حکمت عملی پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ مقالہ میں یہ موقف اختیار کیا گیا ہے کہ اگر NEP2020 کو خلوص نیت، منظم منصوبہ بندی، اور سماجی تعاون کے ساتھ نافذ کیا جائے تو ہندوستانی زبانیں تعلیمی نظام میں اپنی کھوئی ہوئی مرکزی حیثیت دوبارہ حاصل کر سکتی ہیں اور عالمی علمی منظرنامے میں موثر کردار ادا کر سکتی ہیں۔

ہندوستان دنیا کے ان چند ممالک میں شامل ہے جہاں لسانی تنوع غیر معمولی حد تک وسیع ہے۔ آئین ہند کے آٹھویں شیڈول میں بائیس زبانیں شامل ہیں اور اس کے علاوہ سیکڑوں علاقائی، مقامی اور قبائلی زبانیں مختلف ریاستوں اور خطوں میں رائج ہیں۔ یہ لسانی تنوع ہندستان کی تہذیبی دولت اور اجتماعی شناخت کا اہم جزو ہے۔ اس کے باوجود نوآبادیاتی دور کے بعد سے تعلیمی اور انتظامی نظام میں انگریزی زبان کو غیر معمولی بالادستی حاصل رہی، جس کے نتیجے میں مقامی زبانیں علمی، تحقیقی اور پیشہ ورانہ میدان میں پس منظر میں چلی گئیں۔ اس رجحان نے کئی منفی اثرات مرتب کیے۔ ایک طرف تعلیمی عدم مساوات میں اضافہ ہوا کیونکہ دیہی اور پسماندہ طبقات کے بچے انگریزی زبان میں تعلیم حاصل کرنے میں دشواری محسوس کرتے تھے، دوسری طرف مقامی زبانوں میں علم کی ترویج اور اشاعت کا عمل سست پڑ گیا۔ نتیجتاً زبان اور تعلیم کے درمیان فطری رشتہ کمزور ہو گیا۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 اس صورت حال کو بدلنے کی ایک سنجیدہ کوشش ہے۔ یہ پالیسی زبان کو محض تدریسی وسیلہ نہیں بلکہ قومی شناخت، سماجی ہم آہنگی، اور فکری خود مختاری کا بنیادی عنصر قرار دیتی ہے۔ اس مقالے کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ NEP2020 کس طرح ہندوستانی اور علاقائی زبانوں کے فروغ کے لیے عملی امکانات فراہم کرتی ہے، اور ان امکانات کو حقیقت میں بدلنے کے لیے کن اقدامات کی ضرورت ہے۔

NEP2020 کی بنیادی روح ہندوستانی تہذیبی جڑوں سے وابستگی پر قائم ہے۔ پالیسی اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ زبان ثقافت، ادب، تاریخ اور اجتماعی یادداشت کا آئینہ دار ہوتی ہے۔ لہٰذا زبانوں کے تحفظ اور فروغ کے بغیر کسی بھی قوم کی فکری خود مختاری ممکن نہیں۔ پالیسی کے مطابق مادری زبان میں ابتدائی تعلیم بچوں کی فہم و ادراک کو بہتر بناتی ہے۔ اسی طرح کثیر لسانیت ذہنی نشوونما کے لیے مفید ہے اور بچوں میں تخلیقی صلاحیتوں کو فروغ دیتی ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستانی زبانوں کو اعلیٰ تعلیم اور تحقیق کی زبان بنانے کی ضرورت ہے تاکہ علم کی تخلیق مقامی سطح پر ہو سکے۔ پالیسی یہ بھی تسلیم کرتی ہے کہ گذشتہ چند دہائیوں میں ہندوستان میں دو سو سے زائد زبانیں معدوم ہو چکی ہیں اور یونیسکو کے مطابق تقریباً دو سو زبانیں معدومی کے خطرے سے دوچار ہیں۔ اس تناظر میں زبانوں کے تحفظ کو تہذیبی بقا کا مسئلہ قرار دیا گیا ہے۔

یہ پالیسی مادری زبان میں تعلیم اور تعلیمی شمولیت کی اہمیت کی قائل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ NEP2020 کم از کم پانچویں جماعت تک اور ترجیحاً آٹھویں جماعت تک مادری زبان یا مقامی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی سفارش کرتی ہے۔ یہ سفارش تحقیقی شواہد پر مبنی ہے جو ظاہر کرتے ہیں کہ بچے اپنی مادری زبان میں زیادہ تیزی سے اور گہرائی کے ساتھ سیکھتے ہیں۔ مادری زبان میں تعلیم کے فوائد اس صورت میں سامنے آتے ہیں کہ بچوں کے اندر سیکھنے کی فطری صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے، اس کے علاوہ پیچیدہ تصورات کی بہتر تفہیم ممکن ہو پاتی ہے۔ اسکول چھوڑنے کی شرح میں کمی آنے کا امکان ہے، نیز سب سے بڑھ کر یہ ہوگا کہ اس سے تعلیمی عدم مساوات میں کمی آئے گی۔

مادری زبان میں تعلیم دینے کے اقدام سے خاص طور پر دیہی اور پسماندہ طبقات کے بچوں کے لیے مثبت نتائج مرتب ہوں گے، کیوں کہ انگریزی یا ہندی میں تعلیم کی دشواری کے سبب ایسے بچے تعلیمی نظام سے کٹ جاتے ہیں۔ مادری زبان میں تعلیم ان بچوں کو تعلیمی دھارے میں واپس لانے کا موثر ذریعہ بن سکتی ہے۔

NEP2020 سہ لسانی فارمولے کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں لچک پیدا کرنے کی وکالت کرتی ہے۔ مثال کے طور پر پالیسی کے مطابق کسی بھی ریاست پر کوئی زبان مسلط نہیں کی جائے گی۔ اس کے علاوہ طلبہ کو کم از کم دو ہندوستانی زبانیں سیکھنے کی ترغیب دی جائے گی۔ طلبہ کو جماعت ششم یا ہفتم میں زبان تبدیل کرنے کی آزادی ہوگی بشرطیکہ وہ تین زبانوں میں بنیادی مہارت حاصل کر لیں۔ اس لچک کا فائدہ اس طرح سے مرتب ہوگا کہ ہندوستان کے وفاقی ڈھانچے اور لسانی حساسیت کے پیش نظر مثبت فکر میں اضافہ ہوگا، اور زبانوں کی سیاست پر قابو پانے میں یہ اقدام مفید ہوگا، اس سے نہ صرف علاقائی زبانوں کو فروغ ملے گا بلکہ قومی یک جہتی بھی مضبوط ہوگی۔

پرائمری اور ثانوی تعلیم کے ساتھ ساتھ NEP2020 اعلیٰ تعلیم میں مادری اور علاقائی زبانوں کے استعمال کی بھرپور حمایت کرتی ہے۔ پالیسی دستاویز میں اس امر کو یقینی بنانے کی کوشش نظر آتی ہے کہ جامعات میں مادری یا علاقائی زبان میں تعلیم دینے کے لیے ذو لسانی پروگرام متعارف کرائے جائیں گے۔ نجی تعلیمی اداروں کو بھی ہندوستانی زبانوں میں تعلیم دینے کی ترغیب دی جائے گی۔ اسی طرح سائنس اور ریاضی کے مضامین کے لیے معیاری ذولسانی نصابی مواد تیار کیا جائے گا۔ یہ اقدامات خاص طور پر ان طلبہ کے لیے مفید ہوں گے جو انگریزی زبان کی کمزوری کے سبب اعلیٰ تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ اقدامات علم کی مقامی تخلیق کو فروغ دے سکتے ہیں۔

پالیسی میں ترجمہ و تالیف کے فروغ پر خصوصی زور دیا گیا ہے۔ اس کے تحت مختلف ہندوستانی زبانوں میں معیاری نصابی کتب کی تیاری کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ عالمی ادب اور سائنسی مواد کا مقامی زبانوں میں ترجمہ کرنے کا نظم دیا گیا ہے۔ اس بات پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے کہ ڈیجیٹل پلیٹ فارمز پر ہندوستانی

> **NEP2020 زبان کو ثقافت سے جدا نہیں کرتی بلکہ دونوں کو لازم و ملزوم قرار دیتی ہے۔ پالیسی سازوں نے اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش کی ہے کہ فنون لطیفہ اور ادب کو نصاب کا حصہ بنایا جائے گا۔ علاقائی زبان وثقافت کو فروغ دینے کے لیے مقامی فنکاروں اور ادیبوں کو ماسٹر انسٹرکٹر کے طور پر تعینات کیا جائے گا۔ ہر تعلیمی ادارے میں آرٹسٹ ان ریزیڈنس کا تصور اپنایا جائے گا۔ یہ اقدامات زبانوں کو عملی زندگی اور تہذیبی وراثت سے جوڑنے میں مدد دیں گے اور طلبہ میں ثقافتی خود اعتمادی کو فروغ دیں گے۔**

زبانوں میں تعلیمی مواد کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے گا۔ ان اقدامات پر اگر کامیابی کے ساتھ عمل درآمد ممکن ہوسکا تو اس سے ہندوستانی زبانوں کو جدید علمی میدان میں داخل ہونے کے امکانات مزید روشن ہوں گے، نیز ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کے استعمال سے ہندوستانی زبانوں میں علم کی ترسیل تیز اور وسیع ہوسکتی ہے۔

NEP2020 زبان کو ثقافت سے جدا نہیں کرتی بلکہ دونوں کو لازم وملزوم قرار دیتی ہے۔ پالیسی سازوں نے اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش کی ہے کہ فنونِ لطیفہ اور ادب کو نصاب کا حصہ بنایا جائے گا۔ علاقائی زبان وثقافت کو فروغ دینے کے لیے مقامی فنکاروں اور ادیبوں کو ماسٹر انسٹرکٹر کے طور پر تعینات کیا جائے گا۔ ہر تعلیمی ادارے میں آرٹسٹ اِن ریزیڈنس کا تصور اپنایا جائے گا۔ یہ اقدامات زبانوں کو عملی زندگی اور تہذیبی وراثت سے جوڑنے میں مدد دیں گے اور طلبہ میں ثقافتی خود اعتمادی کو فروغ دیں گے۔

NEP2020 کے تحت ہندوستانی اور علاقائی زبانوں کے فروغ کے لیے جو عملی امکانات نظر آتے ہیں، ان میں مادری زبان میں ابتدائی تعلیم کے ذریعے تعلیمی شمولیت میں اضافہ، اعلیٰ تعلیم میں ذولسانی پروگراموں کا آغاز، ترجمہ وتالیف کے قومی مراکز کا قیام، ڈیجیٹل پلیٹ فارمز پر ہندوستانی زبانوں میں مواد کی دستیابی نیز علاقائی ادب اور ثقافت کو نصاب کا حصہ بنانا؛ جیسے عناصر شامل ہوں گے۔ یہ امکانات ہندوستانی زبانوں کو تعلیمی نظام کے مرکز میں واپس لانے میں مدد دے سکتے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ قومی تعلیمی پالیسی میں امکانات ہی امکانات ہوں۔ اس میں اگرچہ امکانات روشن ہیں، لیکن عملی نفاذ میں کئی رکاوٹیں بھی ہیں۔ جن میں چند کا سرسری ذکر یہاں کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر معیاری اساتذہ کی کمی، ہندوستانی زبانوں میں سائنسی اصطلاحات کا فقدان، والدین کی انگریزی نواز ذہنیت، نصابی مواد کی تیاری میں تاخیر نیز ریاستی حکومتوں کے درمیان ہم آہنگی کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ ان چیلنجز سے نمٹنے کے لیے منظم منصوبہ بندی اور سرکاری و نجی شعبے کے اشتراک کی ضرورت ہے۔

اگرچہ NEP2020 ایک جامع لسانی وژن پیش کرتی ہے، مگر اس کی کامیابی کا انحصار عملی نفاذ پر ہے۔ ہندوستان میں انگریزی زبان کو سماجی حیثیت اور معاشی ترقی سے جوڑنے کی ذہنیت آج بھی مضبوط ہے۔ اس ذہنیت کو بدلنے کے لیے شعور بیداری مہمات، میڈیا کے ذریعے مثبت بیانیہ، اور تعلیمی اداروں میں مقامی زبانوں کے وقار کو بڑھانے کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی ریاستی حکومتوں کو اساتذہ کی تربیت، نصابی مواد کی تیاری، اور ترجمہ وتالیف کے مراکز کے قیام پر خاطر خواہ سرمایہ کاری کرنا ہوگی۔ ڈیجیٹل ٹیکنالوجی اس عمل میں کلیدی کردار ادا کرسکتی ہے۔ آن لائن کورسز، ای-کتب، اور تعلیمی ایپس کے ذریعے ہندوستانی زبانوں میں علم کی ترسیل کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔

اس طرح اگر دیکھا جائے تو قومی تعلیمی پالیسی 2020 ہندوستانی اور علاقائی زبانوں کے فروغ کے لیے ایک تاریخی موقع فراہم کرتی ہے۔ اگر اس پالیسی کو خلوص نیت، منظم منصوبہ بندی، اور سماجی تعاون کے ساتھ نافذ کیا جائے تو ہندوستانی زبانیں نہ صرف تعلیمی نظام میں اپنی مرکزی حیثیت بحال کرسکتی ہیں بلکہ عالمی علمی منظرنامے میں بھی اپنا مقام بنا سکتی ہیں۔

■

Prof. Sauban Sayeed
Khawaja Moinuddin Chisti Language University
Lucknow (U.P)
Mob.:9411827716
E-mail: saubansayeed@kmclu.ac.in

پنج کوش فلسفہ اور ہمہ جہتی تعلیم

قدیم ہندوستانی حکمت کی عصری معنویت

نوشاد حسین

تعلیم کا بنیادی مقصد صرف معلومات فراہم کرنا نہیں بلکہ انسان کی ہمہ جہت نشوونما اور اس کی فکری، اخلاقی اور روحانی تربیت ہے۔ حقیقی تعلیم وہ ہے جو انسان کے ظاہر و باطن دونوں کو جلا دے، اس میں علم کے ساتھ کردار، فہم کے ساتھ عمل اور ذہانت کے ساتھ وجدان کی بیداری شامل ہے۔ مسابقتی اور پیشہ ورانہ تقاضوں تک محدود ہو چکا ہے۔ آج تعلیم کا مرکز توجہ انسان نہیں بلکہ معاشی پیداوار بن گیا ہے۔ نتیجتاً طلبہ میں جذباتی توازن، اخلاقی انحطاط اور روحانی شعور کا فقدان ہے۔

یہی وہ بحران ہے جس نے جدید تعلیم کو ''انسان سازی'' کے بجائے ''معلوماتی تربیت'' تک محدود کر دیا ہے۔ اس تناظر میں قدیم ہندوستانی فلسفہ ایک متوازن اور باطنی تربیت کا متبادل پیش کرتا ہے۔ ہندوستانی فکری روایت میں تعلیم کا مقصد صرف روزگار نہیں بلکہ موکش (Moksa) یعنی نجات، آزادی اور خودی کی تکمیل تھا۔ اس خیال کا سرچشمہ ''ویدانت'' اور ''اُپنشد'' ہیں جنھوں نے انسان کو ایک جامع وجود کے طور پر دیکھا — جسم، ذہن، عقل، توانائی اور روح کی مربوط وحدت کے طور پر۔

انھی اپنشدوں میں ''تیتریہ اپنشد'' نے ایک غیر معمولی تصور پیش کیا جسے ''پنچ کوش'' (Panchakosha) کہا جاتا ہے۔ یہ نظریہ انسانی وجود کی پانچ پرتوں کی وضاحت کرتا ہے۔ یہ پانچوں پرتیں تعلیم کے مختلف پہلوؤں — جسمانی صحت، جذباتی توازن، عقلی بصیرت اور روحانی آگہی — کی نمائندگی کرتی ہیں۔ قدیم ہندوستانی فلسفہ اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ حقیقی تعلیم وہی ہے جو انسان کے ان تمام پہلوؤں کو یکجا کر کے اس میں اندرونی توازن پیدا کرے۔

اس مضمون کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ ''پنچ کوش'' کا یہ قدیم تصور موجودہ تعلیم میں کس طرح نئی معنویت اختیار کر سکتا ہے۔ یہ تحریر اس سوال کا جواب تلاش کرتی ہے کہ موجودہ تعلیمی نظام کے بحران کو ختم کرنے کے لیے کیا ہم دوبارہ اس فکری ورثے کی طرف لوٹ سکتے ہیں جہاں علم کا مقصد محض مادی وسائل تک رسائی نہیں بلکہ انسان کی باطنی و روحانی ترقی تھا۔

فلسفہ تعلیم کی قدیم ہندوستانی روایت

قدیم ہندوستانی تہذیب میں تعلیم محض علمی یا پیشہ ورانہ تربیت کا نام نہیں تھی بلکہ یہ انسان کے باطنی ارتقا، اخلاقی استحکام اور روحانی بیداری کا عمل سمجھی جاتی تھی۔ ویدوں، اپنشدوں، دھرم شاستروں اور مختلف تہذیبی وثقافتی روایات میں تعلیم کو ''ودیا'' (Vidya) یعنی بصیرت، آگہی اور خود شناسی کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس ''اَودیا'' (Avidya) جہالت نہیں بلکہ وہ حالت ہے جس میں انسان اپنے حقیقی وجود سے غافل رہتا ہے۔ چنانچہ قدیم ہندوستانی فکر و فلسفہ میں تعلیم کا مقصد انسان کو اس غفلت سے نکال کر خود آگہی و خود شناسی کی اس منزل تک پہنچانا تھا جو اس کا اصل منصب تھی۔

ویدک عہد میں تعلیم کی بنیاد ''رت'' (Rta) یعنی کونی نظم اور سچائی کے ازلی اصول پر رکھی گئی تھی۔ اس تصور کے مطابق کائنات کی ہر شے ایک اخلاقی و روحانی نظم کے تحت قائم ہے اور تعلیم کا فریضہ اس نظم کی تفہیم اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کا شعور پیدا کرنا ہے۔ ''رت'' دراصل وہ داخلی قانون ہے جو کائنات میں توازن، عدل اور ہم آہنگی کو برقرار رکھتا ہے۔ اسی سے سچ (Satya) اور دھرم (Dharma) کے اصول جنم لیتے ہیں۔ اس پس منظر میں تعلیم انسان کو نہ صرف خارجی دنیا کی سمجھ دیتی ہے بلکہ وہ اپنے باطن کے اس قانون فطرت سے بھی واقف ہوتا ہے جو اسے اپنی فطری نیکی اور سچائی کی طرف لے جاتا ہے۔

اپنشدوں میں تعلیم کو روحانی بیداری کا ایک طاقتور وسیلہ قرار دیا گیا ہے۔ وہاں ''ودیا'' کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے اندر موجود الوہی جوہر (Atman) کو پہچانے۔ تعلیم کے ذریعے فرد اپنی جہالت (Avidya) کو ترک کر کے عرفان کی اس منزل تک پہنچتا ہے جہاں وہ ''برہمن'' یعنی کُل وجود سے اپنی وحدت کو محسوس کرتا ہے۔ اس اعتبار سے تعلیم انسان کو ''میں'' (Ahankar) کے محدود دائرے سے نکال کر اس عالمی شعور (Universal Consciousness) سے جوڑتی ہے جو ہر شے میں رچا بسا ہے۔

اسی فکری روایت کے مطابق، تعلیم کا اصل مرکز ''گرو'' اور ''ششیہ'' (استاد و شاگرد) کا مقدس رشتہ تھا۔ گروکل نظام میں تعلیم محض کتابی علم نہیں بلکہ زندگی

گزارنے کا طریقہ تھی۔ یہاں علم، عمل اور اخلاق — تینوں ایک ساتھ پروان چڑھتے تھے۔ شاگرد اپنے گرو کی صحبت میں رہ کر صرف علم حاصل نہیں کرتا تھا بلکہ ضبط نفس، احترام، سچائی، عاجزی اور خدمت جیسے اوصاف بھی اپناتا تھا۔ اس نظام کا مقصد ایک ایسے انسان کی تشکیل تھا جو خود باخبر ہو، سماج کے لیے مفید ہو اور فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔

قدیم ترین ہندوستانی فلسفوں کی رو سے تعلیم کے مختلف زاویے سامنے آتے ہیں۔ سانکھیا درشن میں انسان کو دو بنیادی اصولوں — پرکرتی (فطرت) اور پورش (روح) — کا مرکب سمجھا گیا ہے۔ یہاں تعلیم کا مقصد یہ شعور پیدا کرنا ہے کہ انسان اپنی فطری مادی خواہشات پر قابو پا کر اپنی روحانی حقیقت سے جڑ جائے۔ یوگ درشن تعلیم کو ذہن کی یکسوئی اور داخلی سکون کا ذریعہ مانتا ہے۔ پتنجلی کے نزدیک تعلیم دراصل ''چِت ورتّی نرودھ'' یعنی ذہن کے ارتعاشات کو روکنے کا عمل ہے، تاکہ انسان اپنی اصل ذات سے ہم آہنگ ہو سکے۔

فلسفہ پنچ کوش کا تعارف

ہندوستانی فلسفے میں انسان کو ایک کثیر الجہت اور باطنی طور مربوط وجود کے طور پر دیکھا گیا ہے، جس میں جسم، ذہن، علم، توانائی اور روح ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ ویدانت فلسفہ کے مطابق انسان محض ایک جسمانی مخلوق نہیں بلکہ وہ ایک روحانی ہستی ہے جو مختلف پرتوں (Sheaths) سے گزر کر اپنی اصل حقیقت یعنی ''آتما'' (Atman) تک پہنچتا ہے۔ اسی روحانی ارتقا کو ''پنچ کوش'' (Panchakosha) کے نظریے میں نہایت گہرائی سے بیان کیا گیا ہے۔ ''پنچ کوش'' کا ذکر تیتریہ اُپنشد (Taittiriya Upanishad) میں ملتا ہے، جو ویدانت کے بنیادی متون میں سے ایک ہے۔ یہاں انسان کو پانچ پرتوں یا غلافوں (Sheaths) کے مجموعے کے طور پر بیان کیا گیا ہے، جو اس کے وجود کو بیرونی جسمانی سطح سے لے کر اندرونی روحانی شعور تک محیط کرتی ہیں۔ لفظ کوش (Kosha) سنسکرت کے لفظ غلاف یا پوشش سے ماخوذ ہے، جس کا مطلب ہے کوئی ایسا پردہ جو اصل حقیقت کو ڈھانپتا ہو۔ ان پانچ غلافوں کے ماوراء ہی ''آتما'' کا وہ نورانی جوہر ہے جو انسانی وجود کی حقیقی شناخت ہے۔ انسانی ارتقا کے ان پانچ مرحلوں کو مندرجہ ذیل انداز میں بیان کیا جاتا ہے:

1 انّمی کوش (Annamaya Kosha) — جسمانی پرت

یہ انسانی وجود کی بیرونی پرت ہے جو جسم، خوراک اور مادی عناصر سے بنی ہے۔ ''انّمی'' کا مطلب ہے ''خوراک سے بنا ہوا''۔ اس پرت کا تعلق جسمانی صحت، قوت اور عملی سرگرمیوں سے ہے۔ تعلیم کے ابتدائی مرحلوں میں جسمانی تندرستی، نظم وضبط اور صحت مند طرز زندگی اسی کوش سے متعلق ہے۔ یہ وہ بنیاد ہے جس پر باقی تمام پرتوں کی تعمیر ہوتی ہے۔

قدیم ترین ہندوستانی فلسفوں کی روسے تعلیم کے مختلف زاویے سامنے آتے ہیں۔ سانکھیا درشن میں انسان کو دو بنیادی اصولوں — پرکرتی (فطرت) اور پورش (روح) — کا مرکب سمجھا گیا ہے۔ یہاں تعلیم کا مقصد یہ شعور پیدا کرنا ہے کہ انسان اپنی فطری مادی خواہشات پر قابو پا کر اپنی روحانی حقیقت سے جڑ جائے۔ یوگ درشن تعلیم کو ذہن کی یکسوئی اور داخلی سکون کا ذریعہ مانتا ہے۔ پتنجلی کے نزدیک تعلیم دراصل ''چِت ورتّی نرودھ'' یعنی ذہن کے ارتعاشات کو روکنے کا عمل ہے، تاکہ انسان اپنی اصل ذات سے ہم آہنگ ہو سکے۔

2 پرانمی کوش (Pranamaya Kosha) — حیاوی یا توانائی کی پرت

یہ پرت زندگی کی قوت محرکہ (Vital Energy) کی نمائندہ ہے۔ ''پران'' (Prana) کا مطلب ہے سانس، توانائی یا حیات کا اصول۔ یہ کوش جسم کو زندگی اور حرکت عطا کرتا ہے۔ سانس، نظم نفس اور یوگ کی مشقیں اسی سطح سے تعلق رکھتی ہیں۔ تعلیم میں اگر سانس، سکون اور توانائی کا توازن شامل کیا جائے تو طلبہ میں یکسوئی، ذہنی قوت اور مثبت طرز عمل پیدا ہوتا ہے۔

3 منوئی کوش (Manomaya Kosha) — ذہنی و جذباتی پرت

یہ پرت احساسات، جذبات اور خیالات پر مشتمل ہے۔ ''منس'' (Manas) یعنی ذہن کے ذریعے انسان سوچتا، محسوس کرتا اور ردعمل ظاہر کرتا ہے۔ اگر یہ پرت غیر متوازن ہو جائے تو انسان میں خوف، غصہ، حسد یا اضطراب جنم لیتا ہے۔ تعلیم کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ طلبہ کے جذبات کو مثبت رخ دیا جائے اور ان میں ہمدردی، صبر اور توازن پیدا ہو۔ منوئی کوش کی تربیت دراصل جذباتی ذہانت کی بنیاد ہے۔

4 وجنان مئی کوش (Vijnanamaya Kosha) — علمی و شعوری پرت

یہ پرت عقل، فہم، شعور اور فیصلہ سازی کی علامت ہے۔ ''وِجنان'' (Vijnana) کا مطلب ہے علم بصیرت یا تجزیاتی فہم۔ یہ سطح وہ ہے جہاں انسان حق و باطل میں تمیز کرنا سیکھتا ہے۔ تعلیم کے ذریعے طلبہ میں تنقیدی سوچ، تخلیقی فہم اور اخلاقی فیصلے کی صلاحیت اسی کوش سے وابستہ ہے۔ اگر یہ پرت مضبوط ہو تو انسان نہ صرف علمی طور پر باشعور بنتا ہے بلکہ اخلاقی طور پر بھی مستحکم رہتا ہے۔

5 آنندمئی کوش (Anandamaya Kosha) — روحانی پرت

یہ انسانی وجود کی سب سے داخلی اور لطیف ترین پرت ہے۔ ''آنند'' (Ananda) کا مطلب ہے مسرت یا روحانی خوشی۔ یہ وہ سطح ہے جہاں انسان اپنی اصل ہستی یعنی آتما سے جڑتا ہے۔ اس کوش کا تجربہ داخلی سکون، اطمینان، محبت اور وحدت کے احساس سے عبارت ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں تعلیم کا حقیقی مقصد پورا ہوتا ہے — یعنی انسان اپنے آپ اور کائنات کے درمیان ہم آہنگی محسوس کرتا ہے۔

ان پانچوں پرتوں کا مجموعہ دراصل انسان کی مکمل شخصیت کا خاکہ پیش کرتا ہے۔ جسم سے لے کر شعور تک، ہر سطح ایک دوسرے سے مربوط ہے۔ اگر کسی ایک پرت میں عدم توازن پیدا ہو تو باقی تمام سطحیں متاثر ہوتی ہیں۔ ویدانت کے مطابق تعلیم کا اصل فریضہ یہی ہے کہ وہ ان پانچوں کوشوں کے درمیان توازن پیدا کرے تاکہ انسان اپنی حقیقت — ''آتما'' — تک رسائی حاصل کر سکے۔

''پنچ کوش'' دراصل جسم سے روح تک کا ایک ارتقائی سفر ہے۔ یہ انسان کو بتاتا ہے کہ اس کا وجود محض مادی نہیں بلکہ اس کے اندر ایک لامحدود روحانی جوہر پوشیدہ ہے۔ تعلیم کے تناظر میں اس فلسفے کا مطلب یہ ہے کہ سیکھنے کا عمل محض ذہنی سرگرمی نہیں بلکہ ایک داخلی بیداری ہے جو انسان کو خود شناسی کی طرف لے جاتی ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ ''پنچ کوش'' فلسفہ انسان کے اندر موجود اس وحدتی شعور کی نمائندگی کرتا ہے جو علم، عمل، محبت اور آگہی — چاروں کو ایک ساتھ جوڑتا ہے۔ یہی فلسفہ تعلیم کو ایک مقدس عمل بناتا ہے — ایسا عمل جو انسان کو خود سے، سماج سے اور کائنات سے جوڑتا ہے۔

تعلیم کے تناظر میں پنچ کوش فلسفہ

قدیم ہندوستانی فلسفے میں تعلیم کا مقصد محض معلومات حاصل کرنا نہیں بلکہ خود شناسی ہے۔ ویدانت کے مطابق علم کا اعلیٰ ترین درجہ وہ ہے جو انسان کو اپنے حقیقی وجود یعنی ''آتما'' (Self) کی پہچان تک پہنچا دے۔ ''پنچ کوش'' کا نظریہ تعلیم کو اسی باطنی شعور کے راستے سے جوڑتا ہے۔ یہ فلسفہ سکھاتا ہے کہ حقیقی تعلیم وہی ہے جو جسم، ذہن، عقل، جذبات اور روح کی تربیت کرے اور انسان کو باطنی توازن و سکون عطا کرے۔ تعلیم کے تناظر میں ''پنچ کوش'' فلسفہ ایک جامع ماڈل فراہم کرتا ہے، جو سیکھنے کو انسان کی پانچوں سطحوں سے جوڑتا ہے۔ ہر ''کوش'' تعلیم کے ایک مخصوص پہلو کی نمائندگی کرتا ہے اور ان سب کی ہم آہنگی ہی مکمل تربیت کی ضامن ہے۔ تعلیم کے تناظر میں پنچ کوش فلسفہ کی پانچوں پرتوں کی تفصیل مندرجہ ذیل ہیں:

1 انّمی کوش (Annamaya Kosha) — جسمانی صحت، خوراک اور سرگرمی

تعلیم کی ابتدائی بنیاد جسمانی تربیت پر ہے۔ اگر جسم صحت مند نہ ہو تو دماغ اور روح کی نشوونما بھی ممکن نہیں۔ ''انّمی کوش'' جسمانی طاقت، متوازن غذا، نیند، صفائی اور جسمانی مشقوں پر زور دیتا ہے۔ اسکول اور کالج کے نصاب میں کھیل، یوگ، جسمانی سرگرمیاں اور متوازن طرز زندگی کو شامل کرنا اسی کوش کی عملی صورت ہے۔ قدیم گروکل نظام میں شاگردوں کے لیے جسمانی محنت (Sharirik Sadhana) لازمی تھی تاکہ جسم طاقتور، ذہن پرسکون اور حواس متوازن رہیں۔

2 پرانمی کوش (Pranamaya Kosha) — توانائی، سانس اور یوگ کی اہمیت

یہ کوش زندگی کی توانائی اور سانس کے نظم سے متعلق ہے۔ ''پران'' (Prana) دراصل وہ حیاتی قوت ہے جو جسم کو متحرک رکھتی ہے۔ اگر یہ توانائی غیر متوازن ہو تو انسان میں بے چینی، تھکن اور انتشار پیدا ہوتا ہے۔ تعلیم میں اس کوش کی اہمیت اس وقت سامنے آتی ہے جب ہم یوگ، پرانایام، سانس لینے کی مشقیں اور ارتکاز (Concentration) جیسی سرگرمیوں کو سیکھنے کے عمل میں شامل کرتے ہیں۔ جب طلبہ سانس کی طاقت کو متوازن طور پر استعمال کرتے ہیں تو اُن کے اندر توانائی، ارتکاز اور ذہنی استحکام بڑھتا ہے۔ جدید تعلیم میں ''Mindfulness'' اور ''Meditation'' کی تکنیکیں اسی کوش کی جدید تشریحات ہیں۔

3 منومَی کوش (Manomaya Kosha) — ذہنی نظم، جذباتی تربیت اور ہمدردی

یہ کوش انسانی احساسات، تخیل اور ذہنی کیفیتوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر ذہن مضطرب ہو تو سیکھنے کا عمل رُک جاتا ہے۔ تعلیم کے ذریعے طلبہ کے ذہنی و جذباتی توازن کو برقرار رکھنا لازمی ہے۔ منومَی کوش کے ذریعے ہم جذباتی ذہانت (Emotional Intelligence)، ہمدردی، احترام، تعلق اور اعتماد جیسے اوصاف پیدا کر سکتے ہیں۔ اس کوش کی تربیت سے طلبہ صرف عقلی طور پر نہیں بلکہ انسانی طور پر بہتر سیکھنے والے بنتے ہیں۔ معلم کا کردار یہاں محض معلومات دینے والے کا نہیں بلکہ ایک رہنما اور مشیر کا ہوتا ہے جو شاگردوں کے دلوں میں اعتماد اور سکون پیدا کرتا ہے۔

4 وجنانمی کوش (Vijnanamaya Kosha) — عقلی و تخلیقی صلاحیت، علم و استدلال

یہ کوش شعور، عقل اور فہم سے وابستہ ہے۔ تعلیم کا یہ مرحلہ طلبہ کی علمی صلاحیت، تجزیاتی سوچ اور تخلیقی قوت کو پروان چڑھاتا ہے۔ اس سطح پر نصاب میں منطق، سائنسی استدلال، مشاہدہ اور تحقیق کو اہمیت دی جاتی ہے۔ وجنانمی کوش کی تربیت طلبہ کو علم کے ساتھ بصیرت بھی عطا کرتی ہے، تاکہ وہ صرف کتابی ذہانت تک محدود نہ رہیں بلکہ سماج کے لیے مثبت اور باخبر کردار ادا کریں۔ یہ کوش ہمیں یہ سمجھاتا ہے کہ ''علم'' اگر شعور سے خالی ہو تو وہ بوجھ بن جاتا ہے اور ''شعور'' اگر علم کے ساتھ ہو تو وہ روشنی بن جاتا ہے۔

5 آنندمَی کوش (Anandamaya Kosha) — اخلاق، مسرت اور روحانی سکون

یہ پانچواں اور سب سے لطیف کوش ہے، جو انسان کے باطنی سکون، محبت اور روحانی یکسوئی کی علامت ہے۔ تعلیم کا اعلیٰ مقصد اسی سطح پر پورا ہوتا ہے — جہاں طالب علم اپنے اندر اور کائنات کے درمیان وحدت کا احساس کرتا ہے۔ آنندمَی کوش کی تربیت کے لیے مراقبہ، خاموش مطالعہ، خدمتِ خلق اور اقداری تعلیم کو فروغ دیا جانا چاہیے۔ یہاں تعلیم انسان کو صرف کامیاب نہیں بلکہ پرسکون، بامقصد اور بااخلاق بناتی ہے۔

موجودہ تعلیمی نظام کے مسائل اور چیلنجز

اکیسویں صدی کا تعلیمی نظام بظاہر ترقی یافتہ اور سائنسی معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کے اندرون میں آج تعلیم کا مقصد انسان کی ہمہ جہت تربیت نہیں بلکہ معاشی ترقی، مادی کامیابی اور مسابقتی برتری حاصل کرنا بن چکا ہے۔ نتیجتاً تعلیم کا محور ''انسان'' سے ہٹ کر ''بازار'' کی ضروریات پر مرکوز ہو گیا ہے۔ یہ وہ موڑ ہے جہاں سے تعلیم نے اپنی اصل روح یعنی اخلاق، کردار اور روحانیت کو کھو دیا ہے۔ موجودہ نظامِ تعلیم کا سب سے نمایاں مسئلہ مادیت پرستی (Materialism) ہے۔ علم کا تعلق اب اقدار اور شعور سے نہیں بلکہ پیشے، پیداوار اور منافع سے جوڑ دیا گیا ہے۔ تعلیم نے انسان کو علم تو دیا، مگر انسانیت چھین لی۔ طلبہ محض امتحانات اور نمبروں کی دوڑ میں مصروف ہیں اور علم کی اصل غایت یعنی تفکر، تخلیق اور خود آگہی پس منظر میں چلی گئی ہے۔

اس مادی رجحان نے ایک اور سنگین مسئلہ پیدا کیا ہے — مقابلہ آرائی۔ آج تعلیم کا ماحول ایک دوڑ میں تبدیل ہو گیا ہے، جہاں کامیابی کا مطلب دوسروں سے آگے نکلنا ہے، نہ کہ اپنی ذات کو بہتر بنانا۔ اس غیر صحت مند مقابلے نے طلبہ میں حسد، اضطراب، دباؤ اور ناکامی کا خوف پیدا کر دیا ہے۔ تعلیم کے ادارے ذہنی دباؤ اور جذباتی انتشار کے مراکز بنتے جا رہے ہیں۔ مزید یہ کہ جدید تعلیم نے شخصیت کے توازن کو توڑ دیا ہے۔ انسان اب ''شخص'' نہیں بلکہ ''پروجیکٹ'' بن چکا ہے۔ علم کا مقصد شخصیت سازی کے بجائے کارکردگی بن گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں فرد کا وجود ٹکڑوں میں بٹ گیا ہے — جسم الگ، ذہن الگ،

روح الگ۔ یہ شخصیت کا ٹکراؤ تعلیم کے سب سے بڑے بحرانوں میں سے ایک ہے۔ یہی صورتحال اخلاقی بحران کی صورت میں بھی سامنے آتی ہے۔ تعلیم نے انسان کو ذہانت تو بخشی، مگر دیانت نہیں۔ وہ سوچ تو سکتا ہے مگر محسوس نہیں کرتا۔ سائنسی ترقی اور تکنیکی سہولتوں کے باوجود انسان کے اندر انصاف، ہمدردی، محبت اور قربانی جیسے جذبات کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ معاشرے میں بڑھتا ہوا خود غرضی، تشدد اور عدم برداشت کا رجحان اسی تعلیمی خلا کا نتیجہ ہے۔

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اس بحران کے علاج کے لیے اپنی قدیم علمی روایت سے رہنمائی لیں۔ ''پنچ کوش'' جیسا فلسفہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ تعلیم کا عمل صرف دماغ کی تربیت نہیں بلکہ شعور کی بیداری ہے۔ جب تعلیم جسم، ذہن، جذبات، علم اور روح — سب کا احاطہ کرے، تب ہی وہ انسان کو مکمل بناتی ہے۔ عصری تعلیم کو دوبارہ انسانیت کے محور پر لانے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں اخلاقی اور روحانی اقدار کو شامل کیا جائے۔ تعلیم میں توازن، سکون اور خدمت کے اصولوں کو زندہ کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ جدید تعلیم اگر ''پنچ کوش'' جیسے فلسفے سے ہم آہنگ ہو جائے تو وہ نہ صرف ذہانت بلکہ انسانیت کی بھی پرورش کرے گی۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 اور پنچ کوش فلسفہ

ہندوستان کی قومی تعلیمی پالیسی 2020 دراصل ایک فکری و عملی انقلاب کی حیثیت رکھتی ہے جس کا بنیادی مقصد تعلیم کو مادی و اقتصادی فتوحات کے ساتھ ساتھ انسانی ترقی کا ذریعہ بنانا ہے۔ اس پالیسی نے پہلی بار تعلیم کو ''ہمہ جہت، کثیر الشعبہ اور قدر پر مبنی تعلیم'' کے اصول پر استوار کیا، جو براہِ راست قدیم ہندوستانی فلسفے خصوصاً ''پنچ کوش'' کے نظریات سے مطابقت رکھتا ہے۔

یہ پالیسی تسلیم کرتی ہے کہ تعلیم محض علم کا حصول نہیں بلکہ شعور، کردار اور اقدار کی تربیت کا عمل ہے۔ اسی لیے NEP 2020 نے تعلیم کو ''علم + کردار + شعور'' کے مثلث پر قائم کرنے کی تجویز دی ہے، جو دراصل ''پنچ کوش'' فلسفے کی عملی توسیع ہے۔

قدیم ہندوستانی تعلیم میں جن اصول و نظریات پر زور دیا گیا تھا — یعنی جسمانی صحت، ذہنی یکسوئی، اخلاقی شعور اور روحانی بیداری — وہی NEP 2020

NEP 2020 کا ایک اہم پہلو ہندوستانی نظام علم کی شمولیت ہے۔ پالیسی میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ ہندوستانی علم و فلسفے کی قدیم روایات کو جدید نصاب میں شامل کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے ''آیوش''، ''یوگ''، ''آیور وید''، ''نیائے''، ''ویدانت'' اور دیگر نظامِ فکر کو تعلیمی نظام میں رائج کرنے کی تجویز پیش کی گئی ہے۔

کے مرکزی نکات میں نمایاں ہیں۔ مثال کے طور پر، اس پالیسی میں ''ہمہ جہت اور کثیر الشعبہ تعلیم'' کے ذریعے طلبہ کی ہمہ جہت نشوونما پر زور دیا گیا ہے تاکہ تعلیم صرف ذہنی یا معلوماتی نہ رہے بلکہ انسانی شخصیت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرے۔

اسی طرح پالیسی میں ''اخلاقی اقدار پر مبنی تعلیم'' کو ایک کلیدی جزو کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ اس کے تحت کردار سازی، اخلاقیات، ہمدردی، سچائی اور انسانیت پسندی کو تعلیم کے بنیادی مقاصد میں شمار کیا گیا ہے۔ یہ تمام اصول ''پنچ کوش'' فلسفے کے پانچوں مراحل — جسم، توانائی، ذہن، علم اور روح — کے عملی اظہار ہیں۔

NEP 2020 کا ایک اہم پہلو ہندوستانی نظام علم کی شمولیت ہے۔ پالیسی میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ ہندوستانی علم و فلسفے کی قدیم روایات کو جدید نصاب میں شامل کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے ''آیوش''، ''یوگ''، ''آیور وید''، ''نیائے''، ''ویدانت'' اور دیگر نظامِ فکر کو تعلیمی نظام میں رائج کرنے کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ ''پنچ کوش'' فلسفہ، جو تیتریہ اپنشد میں انسانی ارتقا کے پانچ درجات کے طور پر پیش کیا گیا تھا، اسی سلسلے کا ایک لازمی جزو ہے۔

مزید برآں، NEP 2020 نے مادری زبان کو ابتدائی تعلیم کا ذریعہ قرار دے کر لسانی تنوع (Linguistic Diversity) اور ثقافتی رشتے کو مضبوط کیا ہے۔ مادری زبان میں تعلیم محض لسانی سہولت نہیں بلکہ جذباتی ربط اور فکری آزادی کا ذریعہ ہے۔ ''پنچ کوش'' فلسفے میں جس طرح انسان کے اندرونی وجود کی پرتیں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں، اسی طرح زبان، ثقافت اور تعلیم کا تعلق بھی گہری ہم آہنگی پر مبنی ہے۔ پالیسی میں روحانی تربیت اور انسانی اقدار پر بھی خاص زور دیا گیا ہے۔ اس کا مقصد طلبہ میں باطنی سکون، خود آگہی اور خدمت خلق کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔ اس تربیت کی بنیاد ''آتما'' (Self) کی آگہی پر ہے، جو ''پنچ کوش'' فلسفے کا مرکزی نکتہ ہے۔

تعلیم کا نیا تصور اب صرف ''کیا جاننا ہے'' (What to Know) پر مبنی نہیں رہا بلکہ ''کیسے جاننا ہے'' (How to Know) اور ''کیوں جاننا ہے'' (Why to Know) جیسے سوالات کو بھی شامل کرتا ہے۔ یہ تبدیلی دراصل تعلیم کو شعور، وجدان اور اقدار کے ساتھ جوڑنے کی سمت میں ایک اہم قدم ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ NEP 2020 نے قدیم ہندوستانی فکری ورثے کو جدید عصری ضرورتوں سے ہم آہنگ کر کے تعلیم کو ایک ''پنچ کوشی'' نظامِ تربیت میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ یہ پالیسی اس بات کی علامت ہے کہ تعلیم اب صرف ''علم کی منتقلی'' نہیں بلکہ ''شعوری تبدیلی'' کا عمل ہے — یعنی علم سے شعور تک اور شعور سے کردار تک کا سفر۔ یہی ''پنچ کوش'' فلسفہ کا خلاصہ ہے: تعلیم وہی ہے جو انسان کو اپنی اندرونی روشنی سے آشنا کرے، تاکہ وہ خود بھی منور ہو اور سماج کے لیے بھی روشنی کا ذریعہ بنے۔

پنچ کوش فلسفہ کی عصری معنویت

اکیسویں صدی کی تعلیم اگرچہ تکنیکی طور پر ترقی یافتہ ہے، مگر فکری و اخلاقی لحاظ سے ایک شدید بحران سے گزر رہی ہے۔ آج کے تعلیمی ادارے ذہانت تو پیدا کر رہے ہیں، لیکن شعور نہیں۔ انسان کے اندر معلومات تو بڑھ رہی ہیں، مگر معنی اور مقصد کا احساس ماند پڑ رہا ہے۔ اسی تناظر میں ''پنچ کوش'' فلسفہ ایک ایسا فکری و اخلاقی ماڈل پیش کرتا ہے جو جدید تعلیم کو توازن، سکون اور معنویت کی نئی سمت عطا کر سکتا ہے۔ قدیم ہندوستانی فکر کے مطابق تعلیم کا مقصد صرف ذہانت نہیں بلکہ انسان کی روحانی بیداری ہے۔ ''پنچ کوش'' فلسفہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسان کے اندر پانچ پرتیں ہیں — جسم، توانائی، ذہن، علم اور روح — اور ان سب کی ہم آہنگی ہی حقیقی تعلیم کا مقصد ہے۔ یہی اصول آج کی دنیا میں ہمہ جہت تعلیم اور اقدار پر مبنی تعلیم کے نام سے دوبارہ ابھر رہے ہیں۔ پنچ کوش فلسفہ کی عصری معنویت کو مندرجہ ذیل سمجھا جا سکتا ہے:

1 جدید تعلیم میں اخلاقی و روحانی پہلو کی واپسی

پچھلی چند دہائیوں میں تعلیم کی مادّی سمت نے انسان

کے اخلاقی اور روحانی توازن کو متاثر کیا ہے۔ اس کے نتیجے میں ذہنی دباؤ، خودغرضی اور سماجی انتشار میں اضافہ ہوا ہے۔ اب دنیا بھر میں تعلیمی ماہرین یہ محسوس کر رہے ہیں کہ تعلیم کو دوبارہ اخلاقی اور روحانی بنیادوں پر استوار کرنا ضروری ہے۔ ''پنچ کوش'' فلسفہ اس ضرورت کا فطری جواب فراہم کرتا ہے، کیونکہ یہ تعلیم کو جسم سے روح تک ایک ہمہ گیر عمل سمجھتا ہے۔ یہ نظریہ سکھاتا ہے کہ علم اگر اخلاق سے جڑا نہ ہو تو وہ صرف ہتھیار ہے، روشنی نہیں۔

2 ذہنی صحت، کردار سازی اور سماجی ہم آہنگی

جدید سماج میں ذہنی صحت ایک عالمی مسئلہ بن چکا ہے۔ طلبہ اور اساتذہ دونوں ذہنی دباؤ، بے چینی اور تنہائی کے شکار ہیں۔ ''پنچ کوش'' فلسفہ تعلیم کو ذہنی سکون اور کردار سازی کے عمل سے جوڑتا ہے۔ اگر نصاب میں جسمانی سرگرمی، سانس کی مشق، مراقبہ، اخلاقی تربیت اور تخلیقی اظہار شامل ہوں تو طلبہ کے اندر اعتماد، ہم آہنگی اور مثبت توانائی پیدا ہوتی ہے۔ یہ فلسفہ تعلیم کو صرف علم دینے والا نہیں بلکہ شخصیت سازی کا عمل بناتا ہے۔ سماجی سطح پر بھی یہ نظریہ ہم آہنگی، برداشت اور ہمدردی کو فروغ دیتا ہے — وہ اقدار جن کی آج کے تقسیم شدہ معاشرے میں شدید ضرورت ہے۔

3 عالمی رجحانات اور پنچ کوش کی مماثلت

دنیا بھر میں تعلیمی نظام اب ''بچے کی ہمہ جہت تعلیم'' اور ''سماجی و جذباتی اکتساب'' جیسے ماڈلز کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ان کا مقصد بچے کی ہمہ جہتی نشوونما — جسمانی، ذہنی، جذباتی اور سماجی — کو یقینی بنانا ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ یہ تمام رجحانات دراصل ''پنچ کوش'' فلسفے کے قدیم اصولوں سے مطابقت رکھتے ہیں۔ جہاں مغرب میں سماجی و جذباتی اکتساب طلبہ کی جذباتی اور سماجی ذہانت پر زور دیتا ہے، وہیں ''منومَی'' اور ''وِجنانَمی کوش'' انہی اصولوں کو ہزاروں برس پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اس طرح ''پنچ کوش'' نہ صرف ہندوستانی تعلیم کا روحانی ماڈل ہے بلکہ وہ عالمی سطح پر تعلیم کے لیے ایک پائیدار فلسفیانہ بنیاد بھی فراہم کرتا ہے۔

4 ہندوستانی فلسفہ کا عالمی کردار

جدید دنیا میں تعلیم زیادہ تر علم (Knowledge) تک محدود ہے، مگر ''پنچ کوش'' فلسفہ اسے دانائی (Wisdom) میں تبدیل کرتا ہے۔ علم اور دانائی میں یہی فرق ہے کہ علم ہمیں یہ بتاتا ہے کہ کیا ہے، جبکہ دانائی ہمیں سکھاتی ہے کہ کیا ہونا چاہیے۔ ''پنچ کوش'' انسان کو اپنی اندرونی روشنی کے ذریعے دانائی کی طرف لے جاتا ہے۔ اسی لیے یہ فلسفہ آج عالمی تعلیمی مباحث میں مرکزی مقام حاصل کر رہا ہے۔ یوگ، دھیان، شعوری بیداری، اخلاقی اقدار کی تعلیم، کردار سازی اور امن کے مطالعے جیسے موضوعات ''پنچ کوش'' کے جدید مظاہر ہیں۔

5 تعلیم برائے امن، توازن اور خوشی

آج دنیا کو سب سے زیادہ ضرورت ایسی تعلیم کی ہے جو انسان کے اندر امن، توازن اور خوشی پیدا کرے۔ ''پنچ کوش'' فلسفہ اس مقصد کے لیے ایک جامع فریم ورک مہیا کرتا ہے۔ اگر تعلیم انسان کو اپنی حقیقت پہچاننے، دوسروں کے ساتھ ہمدردی کرنے اور کائنات کے ساتھ ہم آہنگی میں جینے کا ہنر سکھائے تو وہ محض پیشہ نہیں بلکہ عبادت بن جاتی ہے۔ تعلیم برائے امن دراصل ''آنندمَی کوش'' کا مظہر ہے، جہاں علم انسان کو سکون، محبت اور خدمت کا ذریعہ بناتا ہے۔ یہ فلسفہ ہمیں بتاتا ہے کہ تعلیم کا اصل مقصد مقابلہ نہیں بلکہ مکمل ہونا ہے۔

عصری تعلیم میں 'پنچ کوش' کے عملی نفاذ کے امکانات

موجودہ تعلیمی نظام میں ''پنچ کوش'' فلسفے کو متعدد طریقوں سے عملی طور پر نافذ کیا جا سکتا ہے۔ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ایسا نصاب تیار کیا جا سکتا ہے جو جسمانی صحت، ذہنی توازن، جذباتی تربیت، تخلیقی سوچ اور روحانی بیداری — پانچوں کو یکجا کرے۔ یہ ماڈل طلبہ کو محض پیشہ ور نہیں بلکہ بامقصد انسان بننے کی ترغیب دیتا ہے۔ عصری تعلیم میں ''پنچ کوش'' کے عملی نفاذ کے لیے کچھ سفارشات مندرجہ ذیل ہیں:

1 نصاب میں فلاح و بہبود اور ذہنی یکسوئی کی شمولیت

ہر سطح کی تعلیم میں جسمانی و ذہنی سکون، ارتکاز اور توازن کے اصول شامل کیے جائیں۔ اسکولوں میں روزانہ پانچ منٹ کی مراقبہ مشق یا یوگ سیشن طلبہ کی کارکردگی اور رویے دونوں پر مثبت اثر ڈال سکتا ہے۔

2 اساتذہ کی تربیت میں روحانی و اخلاقی اصول

معلمین کو ''شعوری تدریسیات'' کے اصولوں پر تربیت دی جائے تاکہ وہ محض معلومات فراہم کرنے والے نہیں بلکہ کردار ساز، رہنما اور بیدار شعور کے مبلغ بن سکیں۔

3 طلبہ کے لیے یوگ، دھیان اور شخصیت سازی کے ماڈیول

طلبہ کی ہمہ جہتی تربیت کے لیے یوگ، سانس کی مشقیں، خدمتِ خلق اور اخلاقی تعلیم کے مختصر ماڈیول نصاب کا حصہ بنائے جائیں۔

4 تعلیم میں کردار، خدمت اور خودشناسی پر مبنی جائزہ نظام

امتحانات اور جانچ صرف علمی کارکردگی تک محدود نہ رہیں بلکہ طلبہ کے کردار، ہمدردی اور سماجی شرکت کو بھی شامل کیا جائے۔

اختتامیہ

تعلیم ہمیشہ سے انسانی تہذیب کی روح رہی ہے، مگر اس کا حقیقی مقصد محض معلومات کا حصول نہیں بلکہ خودشناسی (Realization-Self) اور اخلاقی بیداری (Moral Awakening) ہے۔ انسان کی اصل ترقی اس وقت ممکن ہوتی ہے جب وہ اپنی ذات، سماج اور کائنات کے درمیان توازن اور ربط کو پہچان لے۔ ''پنچ کوش'' فلسفہ اسی داخلی توازن کا علم دیتا ہے — ایک ایسا فکری ماڈل جو جسم سے روح تک انسان کی مکمل تربیت کا راستہ دکھاتا ہے۔ قدیم ہندوستانی علمیات نے تعلیم کو ایک روحانی اور اخلاقی عمل کے طور پر پیش کیا تھا، جبکہ جدید تعلیم اسے ایک سائنسی اور تکنیکی سرگرمی کے طور پر دیکھتی ہے۔ ''پنچ کوش'' فلسفہ ان دونوں کے درمیان ایک فکری سنگم پیدا کرتا ہے یعنی قدیم حکمت اور جدید تعلیم کا حسین امتزاج۔ یہ فلسفہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ تعلیم کا سفر باہر کی دنیا سے نہیں بلکہ انسان کے اندر سے شروع ہوتا ہے، جہاں شعور، محبت، خدمت اور دانائی کی روشنی بستی ہے۔ عصرِ حاضر میں جب تعلیم مسابقت، مادیت اور سطحی مقاصد کا شکار ہو چکی ہے، ''پنچ کوش'' فلسفہ ہمیں ایک نئی سمت عطا کرتا ہے — ایسی سمت جہاں علم کے ساتھ سکون، عقل کے ساتھ محبت اور ترقی کے ساتھ توازن ہو۔ یہ فلسفہ تعلیم کو ''کمانے کے لیے سیکھنا (Learning for Earning)'' سے نکال کر ''وجود سازی کے لیے سیکھنا (Learning for Being)'' — یعنی وجود کے ادراک — تک لے جاتا ہے۔

■

Prof. Noushad Husain
Principal, Maulana Azad National Urdu University (MANUU)Campus Bhopal
Near Prakash Vidyalava, Airport Road
Gandhi Nagar, Bhopal-462036
(Madhya Pradesh)
Mob.: 7063594144
E-mail: noushadhusain@gmail.com

قومی تعلیمی پالیسی اور مادری زبان

ایاز احمد خان

تعلیمی پالیسی کسی بھی قوم کی فکری، سماجی اور معاشی ترقی کی بنیاد ہوا کرتی ہے، جو اس بات کا تعین کرتی ہے کہ علم کو دوسرے تک کیسے منتقل کیا جائے، مہارتوں کو کس طرح حاصل کیا جائے، اور تعلیمی نظام کو کیسے معاشرتی تقاضوں، ثقافتی اقدار اور عالمی مطالبات سے ہم آہنگ کیا جائے۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 ایک انقلابی وژن کی علمبردار ہے جو نہ صرف تعلیمی ڈھانچے کو اکیسویں صدی کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرتی ہے بلکہ قومی ورثے کے تحفظ کی بھی بات کرتی ہے۔ اس پالیسی کی سب سے نمایاں خصوصیت اور اختراعی پہلو مادری زبان میں درس و تدریس کی وکالت و ترجمانی ہے، جو تعلیمی فہم و فراست کو بہتر بنانے، ثقافتی شناخت کو محفوظ رکھنے، اور لسانی تنوع کی روشنی میں تعلیم و تعلم کو زیادہ جامع اور قابل رسائی بنانے کی حمایت کرتی ہے۔ ہندوستان میں قومی تعلیمی پالیسیوں کا سفر 1968 میں اس وقت شروع ہوا جب پہلی مرتبہ ایک مربوط تعلیمی خاکہ تیار کیا گیا۔ اس پالیسی نے سائنس و ٹیکنالوجی، پیشہ ورانہ تعلیم (Professional Education) اور علاقائی زبانوں کے فروغ پر زور دیا۔ بعد ازاں 1986 کی پالیسی نے تعلیمی مساوات، سب کے لیے تعلیم، اور بنیادی سطح پر تعلیمی ڈھانچے کو بہتر بنانے جیسے اقدامات پر توجہ دی، جن میں ''آپریشن بلیک بورڈ'' جیسی اسکیمیں شامل تھیں۔ موجودہ پالیسی جو 29 جولائی 2020 کو حکومت ہند کی منظوری سے نافذ ہوئی، ایک ہمہ جہت اور بصیرت افروز اقدام ہے جو ہندوستان کو ایک عالمی طاقت میں ڈھالنے کے خواب کو حقیقت میں بدلنے کے لیے ترتیب دی گئی ہے۔

سابقہ پالیسیوں کے برعکس، یہ پالیسی ایک لچکدار، بین لسانی، اور طالب علم مرکوز (Child Centeric) نقطہ نظر کی حامل ہے، جو عالمی تعلیمی رجحانات سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے ہندوستان کی ثقافتی و لسانی جڑوں سے جڑی رہتی ہے۔ اس پالیسی کا سب سے اہم جزو یہ ہے کہ یہ ابتدائی تعلیمی مراحل میں مادری زبان یا علاقائی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی بات کرتی ہے، یعنی کم از کم پانچویں جماعت تک، اور ترجیحاً آٹھویں جماعت بلکہ اس سے بھی آگے تک، بعد ازاں دیگر زبانوں کو تدریجاً شامل کرنے کی بات کرتی ہے۔ جب بچے اپنی مانوس زبان میں تعلیم حاصل کرتے ہیں، تو وہ زیادہ بہتر طریقے سے سیکھتے ہیں، سوالات کرتے ہیں۔ تعلیمی پالیسی کسی بھی قوم کی فکری، سماجی اور معاشی ترقی کی بنیاد ہوتی ہے، جو علم کی ترسیل اور مہارتوں کی آبیاری کا وہ خاکہ فراہم کرتی ہے جس کے تحت ایک صحت مند، باشعور اور ترقی یافتہ معاشرہ پروان چڑھتا ہے۔

معیاری زبان کا تاریخی پس منظر

ہندوستان میں زبان سے متعلق تعلیمی پالیسیوں کی تاریخ کو عموماً تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: پیش از نوآبادیاتی دور، نوآبادیاتی دور، اور آزادی کے بعد کا دور۔

1 پیش از نوآبادیاتی دور (Pre-Colonial Period):

پیش از نوآبادیاتی دور میں تعلیم زیادہ تر مقامی زبانوں جیسے سنسکرت، فارسی، تمل، بنگالی اور دیگر علاقائی زبانوں میں دی جاتی تھی، جو ہر خطے کے ثقافتی و تمدنی ماحول سے ہم آہنگ تھی۔ اس دور کے گروکل، مدارس، پاٹھشالائیں، اور دیگر روایتی تعلیمی ادارے مقامی زبانوں میں تعلیم دیتے تھے، جو طلبہ کی ذہنی و لسانی دنیا سے مربوط ہوتی تھی۔ ان اداروں میں ادب، ریاضی، منطق اور دینیات جیسے علوم مادری زبان میں پڑھائے جاتے تھے، جس سے نہ صرف علم کا حصول آسان ہوتا تھا بلکہ زبان و ثقافت کا رشتہ بھی مضبوط ہوتا تھا۔

2 نوآبادیاتی دور (Colonial Period):

نوآبادیاتی دور میں تعلیمی نظام میں ایک بنیادی تبدیلی رونما ہوئی، خصوصاً جب انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا۔ لارڈ میکالے کی ''منٹ آن ایجوکیشن'' (1835) اس تبدیلی کی بنیاد بنی، جس میں مقامی زبانوں اور ہندوستانی علوم کو کمتر قرار دے کر انگریزی زبان و تعلیم کو برتر قرار دیا گیا۔ مقصد ایک ایسا طبقہ تیار کرنا تھا جو انگریزی میں سوچے، انگریزی میں بولے، اور نوآبادیاتی حکمرانوں کے لیے مقامی عوام سے رابطے کا ذریعہ بنے۔ چنانچہ انگریزی میڈیم اسکول اور کالج قائم کیے گئے جو صرف اشرافیہ تک محدود رہے، جب کہ

مقامی زبانوں اور روایتی اداروں کو دانستہ طور پر نظر انداز کیا گیا۔ اس پالیسی نے ایک لسانی درجہ بندی کو جنم دیا جس میں انگریزی کو ترقی، طاقت، اور عزت کی زبان بنا دیا گیا اور یہی درجہ بندی آج تک تعلیمی و سماجی نظام پر حاوی ہے۔

3 آزادی کے بعد (Post-Independence):

آزادی کے بعد ہندوستان نے ایک ایسا تعلیمی ڈھانچہ تشکیل دینے کی کوشش کی جو قومی اتحاد کو فروغ دے، مگر ساتھ ہی لسانی و ثقافتی تنوع کا احترام بھی کرے۔ 1968 کی قومی تعلیمی پالیسی (NPE1968) اس ضمن میں پہلا سنگ میل ثابت ہوئی، جس میں ''سہ لسانی فارمولے'' کو متعارف کرایا گیا۔ اس کا مقصد کثیر لسانی مہارتوں کو فروغ دینا تھا، جس کے تحت طلبہ کو اپنی مادری زبان، ہندی اور انگریزی سیکھنا تھا۔ اس پالیسی نے نظریاتی طور پر مادری زبان کی اہمیت کو تسلیم کیا، لیکن اس کا عملی نفاذ غیر متوازن رہا۔ بہت سی ریاستوں اور شہری علاقوں نے معاشی اغراض کے پیش نظر ہندی یا انگریزی کو ترجیح دی، جس سے مقامی زبانیں پیچھے رہ گئیں۔ 1986 کی تعلیمی پالیسی نے ''سہ لسانی فارمولے'' کو مزید مضبوط کرنے اور تعلیم کی ہمہ گیر رسائی پر زور دیا، لیکن یہ بھی علاقائی زبانوں کو بطور ذریعہ تعلیم لازم قرار دینے میں ناکام رہی۔

مادری زبان کے حوالے سے قومی تعلیمی پالیسی کی تجاویز

ہندوستان جیسے لسانی، ثقافتی اور جغرافیائی طور پر ثروت مند ملک میں، تعلیم کا شعبہ صرف کتابوں اور کلاس روم تک محدود نہیں بلکہ یہ اس بچے کی زبان، شناخت اور ثقافت سے براہ راست جڑا ہوا ایک حساس میدان ہے۔ خاص طور پر وہ طلبہ جو دیہی، قبائلی یا لسانی طور پر پسماندہ برادریوں سے تعلق رکھتے ہیں، اور جن کی مادری زبان نہ ہندی ہے نہ انگریزی، ان کے لیے ہندوستان کا موجودہ تعلیمی نظام اکثر ایک اجنبی زمین کی مانند ہوتا ہے۔ یونیسکو، NCERT اور کئی عالمی و قومی تحقیقی ادارے اس حقیقت کی تصدیق کر چکے ہیں کہ ابتدائی تعلیم اگر بچے کی مادری زبان میں ہو تو اس کا ذہن نہ صرف تیزی سے سیکھتا ہے بلکہ اس کے اندر سوالات اٹھانے، مفاہمت قائم کرنے، اور فکری ارتقاء کی صلاحیت بھی فروغ پاتی ہے۔ لیکن افسوس کہ کروڑوں ہندوستانی بچے آج بھی ایسی زبانوں میں تعلیم حاصل کرنے پر مجبور ہیں جو ان کے لیے نہ صرف اجنبی بلکہ بعض اوقات خوف کا باعث بن جاتی ہیں۔ جب ایک چھوٹے گاؤں کا بچہ، جس کی مادری زبان مثلاً سنتھالی یا بنگالی ہو، پہلی جماعت میں داخل ہوتا ہے تو وہ تعلیم سے زیادہ زبان کی جنگ لڑ رہا ہوتا ہے۔ اسے

آزادی کے بعد ہندوستان نے ایک ایسا تعلیمی ڈھانچہ تشکیل دینے کی کوشش کی جو قومی اتحاد کو فروغ دے، مگر ساتھ ہی لسانی و ثقافتی تنوع کا احترام بھی کرے۔ 1968 کی قومی تعلیمی پالیسی (NPE1968) اس ضمن میں پہلا سنگ میل ثابت ہوئی، جس میں ''سہ لسانی فارمولے'' کو متعارف کرایا گیا۔

حروف تہجی سیکھنے سے پہلے اس زبان کو سمجھنا ہوتا ہے جس میں وہ بولنا تک نہیں جانتا۔ اس کی دنیا، اس کی بولی، اس کا ماحول۔ سب پیچھے رہ جاتے ہیں اور وہ ایک ایسے تعلیمی نظام کی طرف دھکیل دیا جاتا ہے جو اس کے لیے اجنبی، بے جان اور سرد ہے۔

پانچویں یا آٹھویں جماعت تک مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی اہمیت:

قومی تعلیمی پالیسی کے مطابق کم از کم پانچویں جماعت (اور ترجیحاً آٹھویں جماعت یا اس سے آگے تک) تک مادری زبان یا علاقائی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی بات کی گئی ہے۔ یہ سفارش یونیسکو، این سی ای آر ٹی اور دیگر قومی و بین الاقوامی تحقیقی اداروں کی تحقیق پر مبنی ہے، جن کے مطابق بچے ابتدائی تعلیمی سالوں میں اپنی مادری زبان میں زیادہ بہتر سیکھتے ہیں، کیونکہ یہ زبان ان کے ذہن سے ہم آہنگ اور فطری ہوتی ہے۔ جب تعلیم کسی ناواقف زبان میں دی جائے، تو طالب علم کو بیک وقت مضمون کو بھی سمجھنا پڑتا ہے اور زبان کو بھی، جو ان کے ذہنی بوجھ میں اضافہ کرتا ہے اور سیکھنے کی صلاحیت کو متاثر کرتا ہے۔ یہ تجویز ان کروڑوں ہندوستانی طلبہ کی لسانی بیگانگی کا تدارک کرتی ہے جو دیہی، قبائلی یا لسانی اقلیتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً چھتیس گڑھ کے کسی قبائلی علاقے میں رہنے والا بچہ، جس کی مادری زبان گونڈی ہے، اگر اسے ہندی یا انگریزی میں تعلیم دی جائے تو وہ نہ صرف تعلیمی لحاظ سے پیچھے رہ جاتا ہے بلکہ تعلیم سے ذہنی طور پر کٹ بھی جاتا ہے۔ آٹھویں جماعت تک مادری زبان میں تعلیم کی ترجیح اس بات کا اعتراف ہے کہ زبان کے تسلسل سے ہی علمی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں۔ اس کے بعد کسی دوسری زبان جیسے ہندی یا انگریزی کی جانب بتدریج منتقل ہو، تاکہ طالب علم کو اچانک کسی اجنبی زبان کے بوجھ تلے نہ دبنا پڑے۔

معیاری زبان (Standard language) کے متعلق ریاستوں کو اختیارات:

قومی تعلیمی پالیسی کے تحت ریاستوں اور خطوں کو اپنے مقامی، لسانی و ثقافتی حالات کے مطابق پالیسی نافذ کرنے کی اجازت ہے۔ چونکہ ہر ریاست کی لسانی شناخت جداگانہ ہے، مثلاً بنگال میں بنگالی، کیرلہ میں ملیالم، تمل ناڈو میں تمل، آسام میں آسامیہ اور دیگر قبائلی زبانیں۔ اس کا مقصد اس زمینی حقیقت کو تسلیم کرنا ہے کہ ہندوستان جیسے ملک میں ایک ہی زبان تمام طلبہ کے لیے موثر ذریعہ تعلیم نہیں بن سکتی۔ مثال کے طور پر ناگالینڈ یا منی پور میں جہاں ایک ہی علاقے میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں، وہاں اسکولوں کو مختلف زبانوں میں تعلیم کا بندوبست کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح شہری علاقوں میں جہاں مہاجرین کی تعداد زیادہ ہے، اسکولوں کو دو یا تین زبانوں میں تعلیم فراہم کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ موجودہ پالیسی میں سہ لسانی فارمولے (Three Language Formula) کو ایک نئی جہت کے ساتھ دوبارہ متعارف کرایا گیا ہے۔ یہ فارمولا سب سے پہلے 1968 کی قومی تعلیمی پالیسی میں پیش کیا گیا تھا۔ اس کے تحت طلبہ کو تین زبانیں سیکھنے کی ترغیب دی گئی ہے: مادری یا مقامی زبان، قومی زبان (جیسے ہندی)، اور ایک بین الاقوامی زبان (عمومی طور پر انگریزی)۔ اس

پالیسی کے تحت اس فارمولے میں لچک فراہم کی گئی ہے تاکہ ہر ریاست یا اسکول اپنے مخصوص لسانی وثقافتی حالات کے مطابق زبانوں کا انتخاب کر سکے۔

مادری زبانوں میں درسی کتب اور تدریسی مواد کی تیاری:

حالیہ پالیسی کی سب سے اہم سفارشات میں سے ایک یہ ہے کہ علاقائی زبانوں میں معیاری درسی کتابیں اور تدریسی مواد تیار کیا جائے۔ تاریخ گواہ ہے کہ مادری زبان میں تعلیم کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ رہی ہے کہ مقامی زبانوں میں تعلیمی مواد دستیاب نہیں تھا۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے پالیسی مرکز، ریاستوں، اور تعلیمی اداروں جیسے این سی ای آر ٹی اور ایس سی ای آر ٹی کے درمیان باہمی اشتراک کی تجویز پیش کرتی ہے۔ اس مقصد کے لیے ڈیجیٹل پلیٹ فارمز جیسے DIKSHA کا استعمال کیا جا سکتا ہے تاکہ بنگالی، مراٹھی، تیلگو، آسامی جیسی زبانوں میں معیاری مواد تیار اور فراہم کیا جا سکے۔ نیز پالیسی مقامی علم، لوک کہانیوں اور ثقافتی تناظر کو نصابی مواد میں شامل کرنے کی سفارش کرتی ہے۔ مثلاً اڑیسہ میں سائنس کی کتاب میں مقامی زرعی مثالیں یا ماحولیاتی چیلنجز کو شامل کرنا، طلبہ کے لیے تعلیم کو مزید مربوط اور بامعنی بناتا ہے۔ یہ نہ صرف سمجھ میں بہتری لاتا ہے بلکہ ثقافتی افتخار اور شناخت کو بھی تقویت دیتا ہے۔ پالیسی میں مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے پر جو زور دیا گیا ہے، وہ محض ایک لسانی فیصلہ نہیں بلکہ ایک ہمہ جہت علمی، نفسیاتی، معاشرتی اور ثقافتی منطق پر مبنی انقلابی قدم ہے۔ ابتدائی تعلیمی مراحل میں مادری یا علاقائی زبان کے استعمال کو ترجیح دینا اس پالیسی کا ایک کلیدی پہلو ہے، جو ہندوستان کے لسانی طور پر متنوع تعلیمی نظام میں موجود تدریسی، نفسیاتی اور معاشرتی چیلنجز کا حل پیش کرتا ہے۔

مادری زبان بولنے والے طلبہ کو درپیش چیلنجز:

پالیسی میں خاص طور پر ابتدائی جماعتوں میں مادری زبان یا علاقائی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے پر زور دیا گیا ہے تاکہ تدریسی نتائج بہتر ہوں، ثقافت کا تحفظ ممکن ہو اور شمولیت کو فروغ ملے۔ لیکن ہندوستان جیسے لسانی اور سماجی و اقتصادی طور پر متنوع ملک میں اس اصلاحات پر موثر طریقے سے عمل درآمد کے لیے کئی سنگین رکاوٹیں درپیش ہیں۔ ان میں مادری زبان میں تدریس کے لیے بنیادی ڈھانچے اور اہل اساتذہ کی کمی، علاقائی زبانوں میں تعلیمی اور ڈیجیٹل مواد کی قلت، انگریزی تعلیم کے حق میں شہری متوسط طبقے کی مزاحمت، اور بین ریاستی مہاجرین وکثیر لسانی جماعتوں جیسے پیچیدہ مسائل شامل ہیں۔ تعلیمی اداروں میں معیاری زبان کے طور پر مادری زبان کو اختیار کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ ہمارے تعلیمی ادارے، خاص طور پر دیہی اور پسماندہ علاقوں میں، مناسب انفرا اسٹرکچر اور علاقائی زبانوں پر عبور رکھنے والے تربیت یافتہ اساتذہ کی شدید قلت ہے۔ اگرچہ پالیسی پانچویں جماعت تک مادری زبان یا علاقائی زبانوں میں تعلیم دینے کی بات کرتی ہے، لیکن اکثر سرکاری اسکولوں کے پاس اس پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے درکار وسائل موجود نہیں ہیں۔ کم بولی جانے والی یا معدوم ہوتی زبانوں جیسے سنتھالی میں تدریس کے لیے اہل اساتذہ دستیاب نہیں ہیں۔ بیشتر اساتذہ ہندی یا انگریزی میں تعلیم دینے کی تربیت رکھتے ہیں اور انھیں ان مقامی زبانوں پر عبور حاصل نہیں ہوتا جو طلبہ گھروں میں بولتے ہیں۔

مادری زبان میں درس وتدریس: اصول وضوابط:

اس پالیسی کی روح یہ ہے کہ ہر بچہ اپنے ابتدائی تعلیمی سال اپنی مادری زبان میں گزارے تاکہ وہ علم سے جڑنے کے ساتھ ساتھ اپنی جڑوں سے بھی وابستہ رہے۔ یہی وابستگی آگے چل کر نہ صرف تعلیمی کارکردگی کو بہتر بناتی ہے، بلکہ شناخت کے بحران کا ازالہ بھی کرتی ہے۔ لیکن ایک ایسی سرزمین پر جہاں ہزاروں زبانیں اور بولیاں زندہ ہیں، وہاں یہ خواب صرف سیاسی ارادے سے حقیقت میں نہیں بدل سکتا۔ یہ عمل ایک مربوط، منظم اور ہمہ گیر کاوش کا تقاضا کرتا ہے، جو تعلیمی اداروں، اساتذہ، طلبہ، والدین، زبان دانوں، اور حکومتی وغیر حکومتی اداروں کی باہمی شراکت سے ہی ممکن ہے۔ مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لیے سب سے بنیادی شرط یہ ہے کہ اساتذہ اس زبان میں نہ صرف مہارت رکھتے ہوں، بلکہ وہ جدید تدریسی طریقوں سے بھی واقف ہوں۔ ان کے لیے ایسی تربیت درکار ہے جو انہیں زبان کی تدریس کے ساتھ ساتھ جدید سائنسی وفکری مضامین کو بھی مقامی تناظر میں پڑھانے کے قابل بنائے۔ اس کے لیے نہ صرف مرکز اور ریاستی اداروں کی جانب سے باقاعدہ تربیتی پروگرام

پالیسی میں مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے پر جو زور دیا گیا ہے، وہ محض ایک لسانی فیصلہ نہیں بلکہ ایک ہمہ جہت علمی، نفسیاتی، معاشرتی اور ثقافتی منطق پر مبنی انقلابی قدم ہے۔ ابتدائی تعلیمی مراحل میں مادری یا علاقائی زبان کے استعمال کو ترجیح دینا اس پالیسی کا ایک کلیدی پہلو ہے، جو ہندوستان کے لسانی طور پر متنوع تعلیمی نظام میں موجود تدریسی، نفسیاتی اور معاشرتی چیلنجز کا حل پیش کرتا ہے۔

تشکیل دینا ہوگا بلکہ علاقائی زبانوں میں معیاری نصاب، درسی کتابیں، اور تدریسی مواد بھی تیار کرنا ہوگا۔ جب بچے مقامی مثالوں جیسے برہماپتر اندی، ہزار دواری، نواب بنگال و اودھ، راجستھان کے قلعے کو اپنی زبان میں پڑھتے ہیں تو ان کے ذہن میں مفاہمت کا عمل زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ تعلیم ان کے لیے اجنبی چیز نہیں رہتی، بلکہ وہ اسے اپنی زندگی کا حصہ سمجھنے لگتے ہیں۔

مادری زبان کی تدریس: خواب اور حقیقت:

جب قومی تعلیمی پالیسی 2020 نے یہ اعلان کیا کہ ابتدائی تعلیم بچوں کو ان کی مادری یا علاقائی زبان میں دی جائے گی، تو بظاہر یہ ایک روشن خیال، انقلابی اور ثقافتی طور پر مربوط نظریہ معلوم ہوا۔ ایسا نظریہ جو نہ صرف تعلیم کو آسان اور فطری بنا دے گا، بلکہ زبان و تہذیب کے رشتے کو نئی زندگی بھی عطا کرے گا۔ لیکن جوں جوں اس تصور کو زمینی سطح پر اتارنے کی کوششیں شروع ہوئیں، ایک ایک کر کے وہ تلخ حقیقتیں سامنے آنے لگیں جو صرف تعلیمی ڈھانچے ہی نہیں بلکہ ہمارے سماجی، لسانی، نفسیاتی اور سیاسی نظام کی پیچیدگیوں کی آئینہ دار تھیں۔ ہندوستان کا لسانی تنوع ابتدا ہی میں سب سے بڑی رکاوٹ بن کر ابھرا۔ جہاں ایک ہی گاؤں میں دو یا تین زبانیں بولی جاتی ہوں، وہاں یہ طے کرنا کہ تدریس کس زبان میں ہو، کسی پیچیدہ مسئلہ کو سلجھانے جیسا تھا۔ بعض زبانیں تو محض زبانی وراثت کی صورت میں موجود ہیں جن کا کوئی تحریری رسم الخط نہیں، اور بعض ایسی ہیں جن کے بولنے والے معدودے چند ہیں۔ ان زبانوں میں نصاب تیار کرنا، اساتذہ فراہم کرنا، اور معیاری تدریسی وسائل مہیا کرنا ایک بڑا انتظامی اور مالی چیلنج ہے۔

ایک اور بڑا سوال یہ تھا کہ جہاں اسکولوں میں اساتذہ کی شدید قلت ہے، اور جو موجود ہیں بھی تو وہ ہندی یا انگریزی میں تدریس کے عادی ہیں تو وہ مادری زبان میں بچوں کو کیسے تعلیم دیں گے؟ نہ ان کے پاس لسانی تربیت ہے، نہ ان زبانوں کے تدریسی اصول و قواعد سے وہ واقف ہیں۔ اور اگر کسی اسکول میں ایک ہی استاد ہو، اور کلاس میں بچے مختلف لسانی پس منظر سے تعلق رکھتے ہوں، تو وہاں تدریس کا عمل عملاً تعطل کا شکار ہو جاتا ہے۔ مزید برآں، ایک ایسی رکاوٹ جو شاید سب سے زیادہ نظر انداز کی جاتی ہے، وہ والدین کی انگریزی زبان سے نفسیاتی وابستگی و مرعوبیت ہے۔

> **ہندوستان کا لسانی تنوع ابتدا ہی میں سب سے بڑی رکاوٹ بن کر ابھرا۔ جہاں ایک ہی گاؤں میں دو یا تین زبانیں بولی جاتی ہوں، وہاں یہ طے کرنا کہ تدریس کس زبان میں ہو، کسی پیچیدہ مسئلہ کو سلجھانے جیسا تھا۔ بعض زبانیں تو محض زبانی وراثت کی صورت میں موجود ہیں جن کا کوئی تحریری رسم الخط نہیں، اور بعض ایسی ہیں جن کے بولنے والے معدودے چند ہیں۔ ان زبانوں میں نصاب تیار کرنا، اساتذہ فراہم کرنا، اور معیاری تدریسی وسائل مہیا کرنا ایک بڑا انتظامی اور مالی چیلنج ہے۔**

خلاصہ یہ ہے کہ مادری زبان میں تعلیم طلبا کا صرف لسانی حق نہیں بلکہ اساتذہ اور ہمارے تعلیمی نظام کا ایک تہذیبی فریضہ بھی ہے۔ ایسا فریضہ جو نسلوں کو ان کی جڑوں سے جوڑتا ہے، تعلیم و تعلم کو فطری بناتا ہے، اور شناخت کو مضبوطی عطا کرتا ہے۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 نے اگرچہ ایک روشن راستہ دکھایا ہے، لیکن اس راستے پر کامیابی کے ساتھ چلنے کے لیے ہمیں ذہنی تیاری، سماجی تبدیلی، تعلیمی جدت، اور سیاسی قوتِ ارادی وغیرہ کی ضرورت ہے۔ ہمیں لچکدار تعلیمی ماڈلز کی طرف بڑھنا ہوگا، جہاں مکمل طور پر ایک ہی زبان پر انحصار کے بجائے بین لسانی اشتراک (Translanguaging) کو فروغ دیا جائے۔ اس میں استاد ایک سے زائد زبانوں کو بیک وقت استعمال کرتا ہے، تصورات کو مقامی زبان میں سمجھاتا ہے، اصطلاحات کو قومی یا عالمی زبان میں ادا کرتا ہے، اور مختلف زبانوں میں مشق کرواتا ہے۔ یہ ماڈل خاص طور پر ان اسکولوں میں مفید ثابت ہو سکتا ہے جہاں لسانی تنوع ہو۔ اساتذہ کی تربیت اس پورے عمل کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ ریاستی جامعات، تربیتی کالجز اور ادارے، علاقائی زبانوں میں تدریسی مہارتوں پر مبنی خصوصی تربیت کا اہتمام کریں۔ آن لائن کورسز، تدریسی ماڈیولز، اور لسانی مراکز اس خلا کو پر کر سکتے ہیں۔ ساتھ ہی، مقامی کمیونٹیز کی شمولیت اور مقامی علما و ماہرینِ لسانیات کی شرکت سے نہ صرف تعلیمی مواد بہتر بنایا جا سکتا ہے بلکہ زبان کے ساتھ وابستگی کو بھی مضبوط کیا جا سکتا ہے۔ والدین کی نفسیات کو بدلنے کے لیے ہمیں کہانیوں، نظیروں اور میڈیا مہمات کا سہارا لینا ہوگا۔ کامیاب شخصیات کی مثالیں، جنھوں نے ابتدائی تعلیم مادری زبان میں حاصل کی اور بعد ازاں عالمی سطح پر پہچان بنائی، والدین کو مطمئن کر سکتی ہیں۔ سوشل میڈیا، اسکول پروگرام، ریڈیو اور کمیونٹی اجلاس ان تاثرات کو مثبت سمت میں موڑنے کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ جہاں تک درسی مواد کا تعلق ہے، تو مصنوعی ذہانت، مشینی ترجمہ، اور اوپن سورس پلیٹ فارمز ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ قومی سطح پر ایک ''لسانی مواد تیار کنندہ یونٹ'' قائم کرے جو تمام ریاستی بورڈز اور جامعات کے ساتھ مل کر علاقائی زبانوں میں معیاری نصاب، لغات، اور تربیتی مواد تیار کرے۔ ساتھ ہی، مترجمین کی تربیت اور ترجمہ کی اخلاقیات پر مشتمل کورسز متعارف کروائے جائیں۔ یہ تمام کوششیں تبھی بارآور ہوں گی جب مضبوط قوت ارادی ہو، بجٹ مختص کیا جائے، اور شفاف نگرانی کا نظام قائم ہو۔ ہر ریاست میں ایک خود مختار ''مادری زبان تعلیمی بورڈ'' قائم کیا جانا چاہیے جو سالانہ رپورٹ پیش کرے، نفاذ کی سطح کا تجزیہ کرے اور مقامی سطح پر ماہرین کے مشوروں کو عملی صورت دے۔ اگر ہم یہ سب حاصل کر لیں، تو نہ صرف ہمارا تعلیمی نظام عالمی معیار پر کھڑا ہوگا، بلکہ ہندوستان مادری زبانوں کی تدریس میں دنیا کے لیے ایک عملی ماڈل بھی بن کر ابھرے گا۔

■

Dr. Aiyaz Ahmad Khan
Asstt. Prof., Deptt. of Education
AMU Centre Murshidabad
Jangipur Barrage (Ahiran)
West Bengal-742223
Mob.: 8348564789
E-mail:aakhan_co@myamu.ac.in

مومن سمیہ

تعلیم میں مصنوعی ذہانت (AI) کا استعمال

امکانات، چیلنجز اور مستقبل

اکیسویں صدی کو اگر علم، تحقیق اور ٹیکنالوجی کی صدی کہا جائے تو اس میں کسی طور پر بھی مبالغہ نہیں ہوگا، کیونکہ اس دور میں انسانی زندگی کا کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں ہے جو جدید سائنسی اور تکنیکی ترقی سے متاثر نہ ہوا ہو۔ معلوماتی انقلاب Information Revolution نے نہ صرف انسان کے طرزِ زندگی کو بدل دیا ہے بلکہ اس کے سوچنے، سیکھنے اور فیصلہ کرنے کے انداز میں بھی بنیادی تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ خصوصاً انفارمیشن ٹیکنالوجی (Information Technology) کی حیرت انگیز ترقی نے دنیا کو ایک عالمی گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے، جہاں علم کی رسائی آسان، تیز اور ہمہ گیر ہو چکی ہے۔ ان تبدیلیوں کے اثرات اگرچہ معیشت، صحت، صنعت اور مواصلات سمیت تمام شعبوں میں نمایاں طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ شعبۂ تعلیم بھی بڑے پیمانے پر اس سے متاثر ہوا ہے۔

جدید دور میں تعلیمی نظام کو جن پیچیدہ چیلنجز کا سامنا درپیش ہے، ان میں طلبہ کی انفرادی ضروریات کو پورا کرنا، معیاری تعلیم تک مساوی رسائی، تدریسی معیار میں بہتری، اور علم کو عملی زندگی سے ہم آہنگ بنانا شامل ہیں۔ انھیں چیلنجز کے پس منظر میں حالیہ برسوں کے دوران مصنوعی ذہانت Artificial Intelligence ایک ایسی طاقتور، ہمہ جہت اور تیزی سے ترقی کرنے والی ٹیکنالوجی کے طور پر سامنے آئی ہے جس نے تعلیمی نظام کو بنیادی سطح پر تبدیل کرنے کی صلاحیت کا عملی مظاہرہ کیا ہے۔ مصنوعی ذہانت محض کمپیوٹر یا مشین کو انسانی ذہانت کی نقل کرنے کے قابل بنانے کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک ایسا مربوط نظام ہے جو Data کی بنیاد پر سیکھنے، تجزیہ کرنے، فیصلہ کرنے اور مسائل کے حل کی خودکار صلاحیت رکھتا ہے۔ یہی خصوصیات اسے تعلیم کے شعبے میں غیر معمولی اہمیت عطا کرتی ہیں۔

تعلیم کے میدان میں مصنوعی ذہانت نے سیکھنے کے روایتی تصور کو ایک نئے زاویے سے متعارف کرایا ہے۔ جہاں ماضی میں تعلیم زیادہ تر معلومات کی یک طرفہ منتقلی تک محدود تھی، وہیں AI نے اسے ایک تعاملی، شخصی اور Learner Centered عمل میں تبدیل کر دیا ہے۔ آج تعلیم محض کتاب، تختۂ سیاہ اور روایتی کلاس روم تک محدود نہیں رہی، بلکہ ڈیجیٹل پلیٹ فارمز، آن لائن لرننگ سسٹمز، ورچوئل کلاس رومز، ای-لرننگ ماڈیولز اور اب مصنوعی ذہانت پر مبنی تعلیم، نظامِ تعلیم کا لازمی حصہ بنتے جا رہے ہیں۔ ان جدید ذرائع نے سیکھنے کے عمل کو نہ صرف زیادہ لچک دار اور آسان بنایا ہے بلکہ ایسے طلبہ کے لیے بھی تعلیمی مواقع پیدا کیے ہیں جو روایتی تعلیمی نظام سے کسی وجہ سے مکمل استفادہ نہیں کر سکتے تھے۔

مزید برآں، مصنوعی ذہانت نے تعلیم کے تمام اہم اجزا، جیسے تدریس، احتساب Assessment، رہنمائی، انتظامی امور اور تعلیمی منصوبہ بندی کو متاثر کیا ہے۔ AI پر مبنی نظام طلبہ کی تعلیمی کارکردگی کا مسلسل جائزہ لیتا ہے، ان کی کمزوریوں اور صلاحیتوں کی نشاندہی کرتا ہے اور اسی بنیاد پر تعلیمی مواد اور تدریسی حکمت عملی ترتیب دیتا ہے۔ اس طرح تعلیم ایک جامد اور یکساں نظام کے بجائے ایک متحرک اور انفرادی تجربے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ تاہم اس تکنیکی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ سوال بھی اہم ہو جاتا ہے کہ کیا مصنوعی ذہانت تعلیم کے اخلاقی، سماجی اور انسانی اقدار سے ہم آہنگ ہے یا نہیں، اور اگر ہے تو کس حد تک؟

مصنوعی ذہانت کا تصور اور پس منظر

مصنوعی ذہانت Artificial Intelligence ایک ہمہ جہت اور بین المضامین Interdisciplinary علمی شعبہ ہے جو بنیادی طور پر کمپیوٹر سائنس، ڈیٹا سائنس، ریاضی، شماریات، علمِ نفسیات اور علمِ اعصاب Neuroscience کے اشتراک سے وجود میں آیا ہے۔ اس شعبے کا مرکزی ہدف ایسی ذہین مشینیں اور نظام تیار کرنا ہے جو انسانی ذہانت سے مشابہ افعال انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ ان افعال میں انسانی زبان کو سمجھنا اور اس کا تجزیہ کرنا، بصری معلومات جیسے تصاویر اور ویڈیوز کی شناخت کرنا، منطقی استدلال کرنا، تجربے سے سیکھنا، خودکار طور پر معلومات کی درجہ بندی کرنا اور حالات کے مطابق فیصلے کرنا شامل ہیں۔ مصنوعی ذہانت دراصل انسانی ذہنی عمل کی نقل ہی نہیں کرتی بلکہ ڈیٹا کی بنیاد پر ایسے نتائج اخذ کرتی ہے جو بعض اوقات انسانی صلاحیت سے بھی زیادہ تیز اور

درست ہو سکتے ہیں، خصوصاً ایسے معاملات میں جہاں بڑی مقدار میں معلومات کا تجزیہ درکار ہو۔

تاریخی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو مصنوعی ذہانت کا تصور بیسویں صدی کے وسط میں سامنے آیا، تاہم تعلیم کے میدان میں اس کے عملی استعمال کا آغاز نسبتاً سادہ اور محدود نوعیت کے نظاموں سے ہوا۔ ابتدائی طور پر AI کو خودکار احتسابی نظام Automated Assessment Systems، کمپیوٹر پر مبنی امتحانات Computer-Based Testing اور لرننگ مینجمنٹ سسٹمز Learning Management Systems میں استعمال کیا گیا، جن کا مقصد انتظامی امور کو سہل بنانا، جانچ کے عمل کو تیز کرنا اور تعلیمی ڈیٹا کو منظم کرنا تھا۔ یہ نظام اگرچہ تکنیکی طور پر محدود تھے، تاہم انھوں نے تعلیم میں ڈیجیٹلائزیشن Digitalization کی بنیاد رکھ دی۔ وقت کے ساتھ ساتھ ڈیٹا اینالیٹکس، Data Analytics مشین لرننگ Machine Learning اور ڈیپ لرننگ Deep Learning میں ہونے والی پیش رفت نے مصنوعی ذہانت کے تعلیمی استعمال کو ایک نئے مرحلے میں داخل کر دیا۔ آج تعلیم میں مصنوعی ذہانت محض انتظامی یا احتسابی سہولت تک محدود نہیں رہی بلکہ یہ تدریسی عمل کا ایک فعال اور بااثر حصہ بن چکی ہے۔ AI پر مبنی ذہین ٹیوٹرز Intelligent Tutoring Systems طلبہ کی تعلیمی سرگرمیوں کا مسلسل تجزیہ کر کے انھیں انفرادی رہنمائی فراہم کرتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے ایک نجی استاد طالب علم کی ضرورت کے مطابق درس دیتا ہے۔ اسی طرح ایڈاپٹو لرننگ سسٹمز Adaptive Learning Systems طالب علم کی کارکردگی، سیکھنے کی رفتار اور دلچسپیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے تعلیمی مواد میں خود بخود تبدیلی کرتا ہے، جس سے سیکھنے کا عمل زیادہ مؤثر اور شخصی Individualisation بن جاتا ہے۔

تعلیم میں مصنوعی ذہانت کے جدید مظاہر میں چیٹ بوٹس، ذہین تعلیمی ایپلیکیشنز اور لرننگ اینالیٹکس نمایاں ہیں۔ AI چیٹ بوٹس نہ صرف طلبہ کے سوالات کے فوری جوابات فراہم کرتا ہے بلکہ انھیں نصابی رہنمائی، مطالعے کے طریقوں اور تعلیمی منصوبہ بندی میں بھی مدد فراہم کرتا ہے۔ AI Applications، جیسے زبان سیکھنے یا ریاضی کی مشقوں کی ایپس، طالب علم کی غلطیوں کا تجزیہ کر کے آئندہ مشقوں کو اسی بنیاد پر ترتیب دیتی ہیں۔ اسی طرح ڈیٹا اینالیٹکس کے ذریعے تعلیمی ادارے طلبہ کی مجموعی کارکردگی، مشغولیت اور تعلیمی رجحانات کا مطالعہ کر کے بہتر تعلیمی فیصلے کر سکتے ہیں۔

یہ تمام ترقیات اس بات کی غماز ہیں کہ مصنوعی ذہانت نے تعلیم کو محض معلومات کے حصول کا ذریعہ نہیں رہنے دیا بلکہ اسے ایک متحرک، اشتراکی اور نتائج پر مبنی عمل میں تبدیل کر دیا ہے۔ مصنوعی ذہانت کے ذریعے تدریسی عمل زیادہ مؤثر، تدبر پر مبنی اور طفل مرکوز ہو گیا ہے، جس کے نتیجے میں سیکھنے کے نتائج بہتر ہونے کے ساتھ ساتھ تعلیمی معیار میں بھی نمایاں بہتری دیکھنے میں آ رہی ہے۔ تاہم اس کے ساتھ یہ امر بھی ضروری ہے کہ مصنوعی ذہانت کا استعمال تعلیمی مقاصد، انسانی نگرانی اور اخلاقی اصولوں کے دائرے میں کیا جائے تاکہ تعلیم کا انسانی اور سماجی پہلو متاثر نہ ہو۔

تعلیم میں AI کی ضرورت اور اہمیت

عالمی سطح پر تعلیمی نظام اس وقت جن پیچیدہ اور ہمہ جہت مسائل کا سامنا کر رہا ہے، وہ محض کسی ایک خطے یا ملک تک محدود نہیں بلکہ ایک عالمی چیلنج کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی، اکتساب (Learning) کے بدلتے ہوئے تقاضے، معلومات کی تیزی سے وسعت اور وسائل کی محدود دستیابی نے تعلیمی نظام کو شدید دباؤ میں مبتلا کر دیا ہے۔

> مصنوعی ذہانت ایسے جدید نظام فراہم کرتی ہے جو طلبہ کے تعلیمی ڈیٹا کا تجزیہ کر کے ان کے سیکھنے کی رفتار، دلچسپی، کمزوریوں اور صلاحیتوں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس تجزیے کی بنیاد پر ہر طالب علم کے لیے ایک مخصوص اور انفرادی تعلیمی منصوبہ تیار کیا جا سکتا ہے۔

ان مسائل میں سب سے نمایاں مسئلہ یہ ہے کہ روایتی تعلیمی نظام اکثر طلبہ کی انفرادی ضروریات، اکتساب کے انداز اور ذہنی صلاحیتوں کو پوری طرح مدنظر نہیں رکھ پاتا۔ روایتی کلاس روم میں تدریس عموماً ایک ہی رفتار اور ایک ہی طریقے سے کی جاتی ہے، جہاں تمام طلبہ سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں ایک ہی نصاب کو ایک ہی انداز سے سیکھیں۔ اس طرزِ تدریس سے وہ طلبہ منفی طور پر متاثر ہوتے ہیں جو یا تو سیکھنے میں سست رفتار ہوتے ہیں یا غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کم رفتار سے سیکھنے والے طلبہ پیچھے رہ جاتے ہیں، جبکہ زیادہ صلاحیت رکھنے والے طلبہ بوریت اور عدم دلچسپی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس یکسانیت Uniformity کے باعث نہ صرف تعلیمی معیار متاثر ہوتا ہے بلکہ طلبہ کا اعتماد، تجسس اور سیکھنے کا شوق بھی کمزور پڑ جاتا ہے۔ اساتذہ پر بڑھتا ہوا تعلیمی بوجھ بھی جدید تعلیمی نظام کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ اساتذہ سے نہ صرف تدریس کی توقع کی جاتی ہے بلکہ نصاب کی تکمیل، امتحانی جانچ، تعلیمی ریکارڈ کی تیاری، والدین سے رابطہ اور انتظامی فرائض بھی ان کے ذمے ہوتے ہیں۔ ان ذمہ داریوں کے باعث اساتذہ، طلبہ کی انفرادی رہنمائی پر مطلوبہ توجہ نہیں دے پاتے۔ اس کا براہِ راست اثر تدریسی معیار اور طلبہ کی مجموعی کارکردگی پر پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ تربیت یافتہ اساتذہ کی کمی اور تعلیمی وسائل کی قلت نے اس مسئلے کو مزید سنگین بنا دیا ہے۔ تعلیمی معیار میں تفاوت بھی عالمی تعلیمی منظر نامے کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ شہری اور دیہی علاقوں، ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک، اور نجی و سرکاری تعلیمی اداروں کے درمیان تعلیمی سہولیات اور معیار میں واضح فرق پایا جاتا ہے۔ وسائل کی کمی، جدید ٹیکنالوجی تک محدود رسائی اور تربیت یافتہ عملے کی عدم دستیابی ایسے عوامل ہیں جو مساوی اور معیاری تعلیم کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ ایسے حالات میں تعلیم کا بنیادی مقصد، یعنی ہر فرد کی ہمہ جہت ترقی، مکمل طور پر حاصل نہیں ہو پاتا۔

ان تمام مسائل کے تناظر میں مصنوعی ذہانت Artificial Intelligence ایک مؤثر، قابلِ عمل اور مستقبل دوست حل Future Friendly Solution کے طور پر سامنے آئی ہے۔ مصنوعی ذہانت ایسے جدید نظام فراہم کرتی ہے جو طلبہ کے تعلیمی ڈیٹا کا تجزیہ کر کے

ان کے سیکھنے کی رفتار، دلچسپی، کمزوریوں اور صلاحیتوں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس تجزیے کی بنیاد پر ہر طالب علم کے لیے ایک مخصوص اور انفرادی تعلیمی منصوبہ تیار کیا جاسکتا ہے۔

تعلیم میں مصنوعی ذہانت کا تعمیری کردار

تعلیم میں مصنوعی ذہانت کا کردار محض ایک نظری تصور نہیں بلکہ عملی، تجرباتی اور روزمرہ تعلیمی سرگرمیوں میں واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ مصنوعی ذہانت نے سیکھنے اور سکھانے کے عمل کو اس طرح تبدیل کیا ہے کہ اب تعلیم یکساں اور جامد نظام کے بجائے ایک لچک دار، طفل مرکوز اور شخصی تجربہ بن چکی ہے۔ اس تبدیلی کی سب سے نمایاں مثال شخصی تعلیم Personalised Learning ہے، جہاں AI پر مبنی تعلیمی پلیٹ فارمز طالب علم کی سابقہ کارکردگی، سیکھنے کی رفتار اور دلچسپیوں کا تجزیہ کر کے مناسب تعلیمی مواد فراہم کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر Khan Academy اور Coursera جیسے پلیٹ فارمز مصنوعی ذہانت کی مدد سے یہ شناخت کرتے ہیں کہ طالب علم کس موضوع میں کمزور ہے اور اسی کے مطابق اضافی مشقیں، ویڈیوز اور وضاحتی مواد پیش کرتے ہیں، جس سے سیکھنے کا عمل نہ صرف مؤثر بلکہ طالب علم کی نفسیاتی ضروریات سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ اس طرح مصنوعی ذہانت تعلیم میں مساوات اور انفرادی توجہ کے تصور کو عملی شکل دیتی ہے۔

اساتذہ کے کردار کے حوالے سے بھی مصنوعی ذہانت نے ایک مثبت اور تعمیری تبدیلی پیدا کی ہے۔ روایتی طور پر اساتذہ کو نہ صرف تدریسی بلکہ انتظامی اور احتسابی ذمے داریاں بھی ادا کرنی پڑتی تھیں، جس سے ان کے تدریسی معیار پر اثر پڑتا تھا۔ تاہم AI پر مبنی خودکار نظام، جیسے Google Classroom میں اسائنمنٹ کی جانچ اور گریڈنگ کے ٹولز، اساتذہ کا وقت بچاتے ہیں اور انھیں اس قابل بناتے ہیں کہ وہ طلبہ کی اخلاقی تربیت، رہنمائی اور انفرادی مسائل پر زیادہ توجہ دے سکیں۔ یوں استاد کا کردار ایک محض معلومات فراہم کرنے والے سے بڑھ کر رہنما، مربی اور شخصیت ساز کی صورت اختیار کر لیتا ہے، جو تعلیم کے اصل مقصد کے عین مطابق ہے۔

احتساب اور تعلیمی جائزے میں بھی مصنوعی ذہانت نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ AI پر مبنی سسٹمز نہ صرف نتائج کا فوری اور درست تجزیہ کرتے ہیں بلکہ طلبہ کو تعمیری فیڈ بیک بھی فراہم کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر Turnitin جیسے سافٹ ویئرز AI کی مدد سے طلبہ کی تحریروں میں علمی دیانت داری Plagiarism کو جانچتے ہیں اور انھیں بہتر تحریر کے لیے رہنمائی فراہم کرتے ہیں، جس سے طلبہ میں ایمانداری، خود احتسابی اور تحقیقی اخلاقیات کو فروغ ملتا ہے۔ اس طرح مصنوعی ذہانت علمی اقدار کے تحفظ میں بھی معاون ثابت ہوتی ہے۔

خصوصی تعلیم کے میدان میں مصنوعی ذہانت کی شمولیت تعلیم کو مزید جامع اور انسان دوست بناتی ہے۔ بصارت سے محروم طلبہ کے لیے Text-to-Speech ٹیکنالوجی، سماعت سے محروم طلبہ کے لیے Speech-to-Text نظام اور سیکھنے میں دشواری رکھنے والے بچوں کے لیے Adaptive Learning ایپس نہ صرف تعلیمی رکاوٹوں کو کم کرتی ہیں بلکہ خود اعتمادی اور خودمختاری کے جذبے کو بھی فروغ دیتی ہیں۔ یہ مثالیں واضح کرتی ہیں کہ مصنوعی ذہانت تعلیم میں مساوی مواقع فراہم کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ بن سکتی ہے۔

آن لائن اور فاصلاتی تعلیم میں بھی مصنوعی ذہانت نے اکتساب کے تجربے کو بامعنی بنا دیا ہے۔ AI پر مبنی چیٹ بوٹس یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں کی ویب سائٹس پر طلبہ کی رہنمائی کرتے ہیں، داخلہ، نصاب اور امتحانات سے متعلق فوری معلومات فراہم کرتے ہیں اور طلبہ کے احساسِ تنہائی کو کم کرتے ہیں۔ Covid-19 کے بعد آن لائن تعلیم کے فروغ میں یہ ٹیکنالوجی ایک ناگزیر سہولت بن کر سامنے آئی ہے۔

یہ تمام مثالیں اس امر کو واضح کرتی ہیں کہ مصنوعی ذہانت تعلیم میں ایک تعمیری، معاون اور ہمہ جہتی کردار ادا کر رہی ہے۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ اس ٹیکنالوجی کا استعمال انسانی نگرانی، تعلیمی اقدار اور اخلاقی اصولوں کے دائرے میں کیا جائے، تاکہ تعلیم کا انسانی اور اخلاقی پہلو متاثر نہ ہو۔ اگر مصنوعی ذہانت کو حکمت، ذمہ داری اور مقصدیت کے ساتھ اپنایا جائے تو یہ مستقبل کی ایسی تعلیم کی بنیاد رکھ سکتی ہے جو نہ صرف علمی لحاظ سے مضبوط ہو بلکہ اخلاقی، سماجی اور انسانی اقدار سے بھی آراستہ ہوگی۔

مستقبل کے امکانات:

تعلیم اور مصنوعی ذہانت Artificial Intelligence کے درمیان تعلق آنے والے برسوں میں مزید گہرا، وسیع اور ہمہ جہت ہوتا چلا جائے گا۔ جس رفتار سے ڈیجیٹل ٹیکنالوجیز ترقی کر رہی ہیں، اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مستقبل کا تعلیمی نظام روایتی کلاس روم کی حدود سے نکل کر ایک ایسے ذہین، لچک دار اور تعاملی نظام میں تبدیل ہو جائے گا جہاں سیکھنے کے طریقے، مواد اور ماحول سب طالب علم کی ضروریات کے مطابق ڈھلے ہوں گے۔ مصنوعی ذہانت اس تبدیلی کا مرکزی ستون بن کر سامنے آئے گی، جو تعلیم کو نہ صرف زیادہ مؤثر بلکہ زیادہ بامعنی اور ہمہ گیر بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

مستقبل کے تعلیمی منظرنامے میں اسمارٹ کلاس رومز Smart Classrooms کا تصور نمایاں ہوگا۔ یہ کلاس رومز AI، انٹرنیٹ آف تھنگز (IoT) اور ڈیجیٹل سینسرز کے امتزاج سے تشکیل پائیں گے، جہاں تدریسی عمل کو حقیقی وقت (Real-time) میں جانچا اور بہتر بنایا جا سکے گا۔ مصنوعی ذہانت طلبہ کی توجہ، شرکت اور فہم کا تجزیہ کر کے اساتذہ کو فوری فیڈ بیک فراہم کرے گی، جس سے تدریسی حکمتِ عملی کو بروقت بہتر بنانا ممکن ہوگا۔ اس طرح تعلیم ایک جامد عمل کے بجائے ایک متحرک، خوشگوار اور لچکدار تجربہ بن جائے گی۔

اسی طرح ورچوئل ریئلٹی Virtual Reality

VR اور اگمینٹڈ ریئلٹی AR Augmented Reality کا تعلیمی استعمال مستقبل میں غیر معمولی اہمیت اختیار کر لے گا۔ ان ٹیکنالوجیز کی مدد سے طلبہ محض کتابوں میں پڑھے گئے تصورات کو نہیں دیکھیں گے بلکہ انھیں عملی اور تجرباتی انداز میں محسوس بھی کر سکیں گے۔ مثال کے طور پر تاریخ کے طلبہ قدیم تہذیبوں کا ورچوئل سفر کر سکیں گے، سائنسی مضامین کے طلبہ انسانی جسم یا کہکشاؤں کا مشاہدہ براہِ راست تجربے کی صورت میں کر سکیں گے، جبکہ ٹیکنیکل اور پیشہ ورانہ تعلیم میں پیچیدہ مشینری اور عملی تربیت کو محفوظ انداز میں سیکھا جا سکے گا۔ اس سے سیکھنے کا عمل زیادہ پائیدار، دلچسپ اور موثر ہو جائے گا۔

مستقبل میں AI پر مبنی سیکھنے کے ماحول AI-driven Learning Environments تعلیم کو مزید شخصی بنا دیں گے۔ ہر طالب علم کے لیے انفرادی تعلیمی راستہ (Personalized Learning Path) تیار کیا جائے گا، جو اس کی سیکھنے کی رفتار، دلچسپیوں اور اہداف کے مطابق ہوگا۔ مصنوعی ذہانت نہ صرف طالب علم کی موجودہ کارکردگی کا تجزیہ کرے گی بلکہ اس کی آئندہ تعلیمی ضروریات کی پیش گوئی بھی کرے گی۔ اس کے نتیجے میں تعلیم ایک ردِعمل پر مبنی نظام کے بجائے پیشگی منصوبہ بندی پر مبنی عمل بن جائے گی، جس سے ناکامی کے امکانات کم اور کامیابی کے مواقع زیادہ ہو جائیں گے۔

اساتذہ کے کردار میں بھی مستقبل میں نمایاں تبدیلی متوقع ہے۔ مصنوعی ذہانت کے بڑھتے ہوئے استعمال کے باوجود اساتذہ کی اہمیت کم ہونے کے بجائے مزید بڑھ جائے گی، کیونکہ ٹیکنالوجی صرف معلومات فراہم کر سکتی ہے، مگر کردار سازی، اخلاقی تربیت اور انسانی اقدار کی منتقلی اب بھی انسان ہی کا کام ہے۔ مستقبل کا استاد محض معلومات دینے والا نہیں بلکہ رہنما، مربی اور سیکھنے کے عمل کا تسہیل کار ہوگا۔ مصنوعی ذہانت انتظامی اور تکنیکی کاموں کو سنبھال لے گی جبکہ اساتذہ طلبہ کی ذہنی، جذباتی اور سماجی نشوونما پر توجہ دے سکیں گے۔

تاہم مستقبل کی اس تکنیکی ترقی کے ساتھ کئی اخلاقی اور سماجی سوالات بھی جنم لیتے ہیں۔ ڈیٹا پر انحصار کرنے والے AI نظاموں میں رازداری (Privacy)، شفافیت اور انصاف (Fairness) جیسے مسائل پر سنجیدہ غور و فکر ضروری ہوگا۔ اگر تعلیمی نظام میں مصنوعی ذہانت کو بلا سوچے سمجھے اپنایا گیا تو یہ خدشہ پیدا ہو سکتا ہے کہ ٹیکنالوجی انسان پر حاوی ہو جائے گی، جس سے تعلیم کا انسانی پہلو متاثر ہو سکتا ہے۔ اس لیے مستقبل کے تعلیمی نظام میں یہ لازمی ہوگا کہ مصنوعی ذہانت کو انسانی اقدار، اخلاقیات اور سماجی ذمہ داری کے دائرے میں استعمال کیا جائے۔

> اگر تعلیمی پالیسی سازی، نصاب کی تشکیل اور تدریسی حکمت عملیوں میں انسانی اقدار، سماجی ذمہ داری اور تعلیمی انصاف کو مرکزی حیثیت دی جائے تو مصنوعی ذہانت نہ صرف تعلیمی معیار کو بلند کر سکتی ہے بلکہ ایک ایسے تعلیمی نظام کی بنیاد بھی رکھ سکتی ہے جو مساوی، جامع اور مستقبل دوست ہو۔

مزید برآں، یہ بھی ضروری ہے کہ ٹیکنالوجی کی ترقی کے فوائد معاشرے کے ہر طبقے تک پہنچیں۔ اگر AI تک رسائی صرف مخصوص اداروں یا ترقی یافتہ علاقوں تک محدود رہی تو تعلیمی عدم مساوات میں مزید اضافہ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا مستقبل کی تعلیمی پالیسیوں میں مساوی رسائی، شمولیت (Inclusion) اور سماجی انصاف کو مرکزی حیثیت دینا ناگزیر ہوگا۔ مصنوعی ذہانت کو ایسا آلہ بنانا ہوگا جو کمزور، پسماندہ اور مخصوص ضروریات کے حامل طلبہ کے لیے بھی تعلیمی مواقع میں اضافہ کرے۔

آخرکار، مستقبل کی تعلیم کا اصل مقصد محض تکنیکی مہارتوں کی تربیت نہیں بلکہ ایسی ہمہ جہت شخصیت کی تشکیل ہونا چاہیے جو علم، اخلاق، تخلیقی سوچ اور سماجی شعور کا حسین امتزاج ہو۔ انسانیت، اخلاقیات اور سماجی اقدار کے لیے تعلیم کو مرکز میں رکھ کر اگر مصنوعی ذہانت استعمال کیا جائے تو یہ نہ صرف سیکھنے کے تجربے کو بہتر بنا سکتی ہے بلکہ ایک ایسے معاشرے کی تشکیل میں بھی مددگار ثابت ہو سکتی ہے جو علم دوست، انصاف پسند اور انسانی اقدار سے مزین ہوں۔ یوں ٹیکنالوجی انسان پر حاوی ہونے کے بجائے انسان کی خدمت گزار بن سکتی ہے، جو مستقبل کی پائیدار اور بامقصد تعلیم کی بنیاد ثابت ہوگی۔

مصنوعی ذہانت بلا شبہ تعلیم کے شعبے میں ایک انقلابی قوت کے طور پر ابھر کر سامنے آئی ہے، جس نے تدریس، اکتساب اور احتساب کے روایتی طریقوں کو نئی جہتیں فراہم کی ہیں۔ جدید تعلیمی نظام میں AI پر مبنی ٹیکنالوجیز نے سیکھنے کے عمل کو زیادہ شخصی، لچک دار اور موثر بنا دیا ہے، جہاں ہر طالب علم کی انفرادی ضروریات، صلاحیتوں اور دلچسپیوں کو مدنظر رکھا جا سکتا ہے۔ اس کے ذریعے نہ صرف تعلیمی نتائج میں بہتری ممکن ہوئی ہے بلکہ اساتذہ کے تدریسی بوجھ میں کمی اور تعلیمی عمل کی مجموعی بہتری بھی سامنے آئی ہے۔ تاہم یہ حقیقت بھی نہایت اہم ہے کہ مصنوعی ذہانت اپنی ذات میں کسی مثبت یا منفی اثر کی حامل نہیں بلکہ اس کا انحصار اس کے استعمال کے طریقۂ کار پر ہے۔ اگر AI کو بغیر اخلاقی اصولوں اور انسانی نگرانی کے اپنایا جائے تو تعلیمی عدم مساوات، پرائیویسی کے مسائل اور انسان و مشین کے درمیان عدم توازن جیسے خدشات جنم لے سکتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ تعلیم میں مصنوعی ذہانت کے استعمال کو دانشمندی، ذمہ داری اور اخلاقی شعور کے ساتھ فروغ دیا جائے۔ اگر تعلیمی پالیسی سازی، نصاب کی تشکیل اور تدریسی حکمتِ عملیوں میں انسانی اقدار، سماجی ذمہ داری اور تعلیمی انصاف کو مرکزی حیثیت دی جائے تو مصنوعی ذہانت نہ صرف تعلیمی معیار کو بلند کر سکتی ہے بلکہ ایک ایسے تعلیمی نظام کی بنیاد بھی رکھ سکتی ہے جو مساوی، جامع اور مستقبل دوست ہو۔ یوں مصنوعی ذہانت محض ایک تکنیکی جدت نہیں بلکہ باوقار، بااصول اور انسانی اقدار پر مبنی تعلیم کے فروغ کا ایک مؤثر ذریعہ بن سکتی ہے، جو آنے والی نسلوں کی فکری، اخلاقی اور سماجی ترقی میں اہم کردار ادا کرے گی۔

■

Dr. Momin Sumaiya
Asst. Professor
Dept. of Education and Training
Maulana Azad National Urdu University
Hydrabad-500032
Mob:8125231214

تعلیم اور ٹیکنالوجی

محمد جمشید عالم

آج کے دور میں تعلیم اور ٹیکنالوجی ایک دوسرے کے ناگزیر ساتھی بن چکے ہیں۔ معلومات کی دنیا تیزی سے ڈیجیٹل ہو رہی ہے اور کلاس روم کی روایتی حدیں کم ہوتی جا رہی ہیں۔ ٹیکنالوجی نے تعلیم کے ہر پہلو کو متاثر کیا ہے، چاہے وہ نصاب کی تیاری ہو، تدریس کے طریقے ہوں، یا طلبہ کی سیکھنے کی صلاحیتیں۔ ایک طرف، جدید سافٹ ویئر، ای-لرننگ پلیٹ فارمز، اور تعلیمی ایپس نے سیکھنے کے عمل کو زیادہ متنوع اور دلچسپ بنایا ہے، تو دوسری طرف، آن لائن کلاسز، ویڈیو لیکچرز، اور فلپڈ کلاس روم نے روایتی تدریسی ڈھانچے کو بھی تبدیل کر دیا ہے (Kirkwood & Price, 2014). تعلیم اور ٹیکنالوجی کا ملاپ نہ صرف علمی معیار کو بہتر بناتا ہے بلکہ طلبہ کی تخلیقی صلاحیتوں، تنقیدی سوچ، اور خود انحصاری کو بھی فروغ دیتا ہے۔ جب طلبہ مختلف ڈیجیٹل وسائل کے ذریعے علم حاصل کرتے ہیں تو وہ محض معلومات کو یاد نہیں کرتے بلکہ اس کا تجزیہ، موازنہ اور عملی اطلاق بھی سیکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ، اساتذہ بھی جدید تدریسی حکمت عملیوں کے ذریعے کلاس روم کو زیادہ پراثر اور انٹریکٹو بنا سکتے ہیں، جس سے طلبہ کی دلچسپی اور سیکھنے کی رفتار میں اضافہ ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ ٹیکنالوجی کی مدد سے تعلیم کی رسائی میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ دیہی اور پسماندہ علاقوں کے طلبہ بھی اب آن لائن کلاسز، ویڈیو لیکچرز، اور ڈیجیٹل کورسز کے ذریعے عالمی معیار کی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں، جو پہلے صرف بڑے شہروں اور معیاری اداروں تک محدود تھی۔ یوں تعلیم اور ٹیکنالوجی کی نئی دنیا نے نہ صرف تعلیمی معیار بلکہ تعلیمی مساوات اور شمولیت کو بھی فروغ دیا ہے۔

ٹیکنالوجی کی تعلیم میں اہمیت

ٹیکنالوجی نے تعلیمی نظام میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے اور سیکھنے کے عمل کو زیادہ متنوع، دلچسپ اور موثر بنا دیا ہے۔ جدید تعلیمی ٹولز نے طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لیے تعلیم کے معیار اور رسائی کو بہتر کیا ہے۔

- **متنوع سیکھنے کے وسائل:** کمپیوٹر، اسمارٹ بورڈ، تعلیمی ایپس اور ڈیجیٹل لیبارٹریز نے طلبہ کو مختلف طریقوں سے علم حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ طلبہ اب محض کتابی علم تک محدود نہیں بلکہ ویژول، انٹریکٹو اور عملی تجربات کے ذریعے بھی سیکھ سکتے ہیں، جس سے سیکھنے کا عمل زیادہ مؤثر اور یادگار بنتا ہے۔
- **اساتذہ کی مدد اور تدریسی مواد:** ٹیکنالوجی اساتذہ کو تدریسی مواد تخلیق کرنے، سبق کی منصوبہ بندی کرنے اور کلاس روم کی سرگرمیوں کو انٹریکٹو بنانے میں مدد فراہم کرتی ہے۔ اس کے ذریعے استاد ہر طالب علم کی پیش رفت کا جائزہ لے سکتا ہے اور اس کے مطابق سیکھنے کی حکمت عملی اپنانے کے قابل ہوتا ہے۔
- **انفرادی سیکھنے کی حکمت عملی:** ہر طالب علم کی صلاحیت، رفتار اور ضرورت کے مطابق تعلیم فراہم کرنا ممکن ہوا ہے۔ یہ انفرادی توجہ طلبہ کی علمی ترقی اور تخلیقی صلاحیتوں کو فروغ دیتی ہے، اور انھیں خود مختار اور فعال سیکھنے والا بناتی ہے۔
- **عملی اور تجرباتی تعلیم:** ٹیکنالوجی کے ذریعے طلبہ عملی تجربات اور سمیلیشنز کے ذریعے پیچیدہ تصورات کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ یہ طریقہ سیکھنے کو زیادہ دلچسپ، یادگار اور موثر بناتا ہے۔
- **سیکھنے کی رسائی میں اضافہ:** آن لائن پلیٹ فارمز اور ای-لرننگ کے ذریعے طلبہ دنیا کے کسی بھی حصے سے معیاری تعلیمی مواد تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں، جس سے تعلیم کے مواقع میں اضافہ ہوتا ہے اور تعلیمی مساوات فروغ پاتی ہے۔

اس طرح ٹیکنالوجی نہ صرف تعلیمی معیار کو بہتر بناتی ہے بلکہ طلبہ کی تخلیقی، تنقیدی اور عملی صلاحیتوں کو بھی موثر انداز میں فروغ دیتی ہے۔ جب طلبہ جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے سیکھتے ہیں، تو وہ محض معلومات یاد کرنے تک محدود نہیں رہتے بلکہ سیکھے گئے علم کا تجزیہ، موازنہ اور عملی اطلاق بھی کرنا سیکھتے ہیں۔ اس عمل کے دوران ان کی مسئلہ حل کرنے کی صلاحیتیں بہتر ہوتی ہیں اور وہ نئے

اور پیچیدہ مسائل کے لیے خود اعتماد اور خود مختار فیصلے کرنے کے قابل بنتے ہیں۔ مزید یہ کہ ٹیکنالوجی طلبہ کو مختلف سیکھنے کے انداز اور متنوع وسائل کے ذریعے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے، جیسے کہ ویژول پروجیکٹس، انٹریکٹو سمیلیشنز، اور ڈیجیٹل ماڈلنگ۔ نتیجتاً، وہ نہ صرف تعلیمی میدان میں بلکہ عملی زندگی کے چیلنجز، جدید ٹیکنالوجیکل مسائل، اور پیشہ ورانہ ماحول میں بھی بہتر انداز میں مقابلہ کرنے کے قابل بنتے ہیں۔ یوں ٹیکنالوجی طلبہ کی ذہنی لچک، خود اعتمادی اور تخلیقی سوچ کو فروغ دے کر انھیں مستقبل کے پیچیدہ اور غیر متوقع چیلنجز کے لیے تیار کرتی ہے، اور ایک ایسے تعلیمی ماحول کی تخلیق کرتی ہے جہاں ہر طالب علم اپنی مکمل صلاحیت کے مطابق ترقی کر سکتا ہے۔

آن لائن لرننگ اور فلپڈ کلاس روم

آن لائن لرننگ اور فلپڈ کلاس روم نے روایتی تدریسی طریقوں کو مکمل طور پر بدل کر تعلیم کو زیادہ لچک دار اور قابل رسائی بنا دیا ہے۔ یہ جدید طریقے نہ صرف طلبہ کی تعلیمی دلچسپی کو بڑھاتے ہیں بلکہ کلاس روم میں سیکھنے کے عمل کو بھی زیادہ مؤثر اور انٹرایکٹو بناتے ہیں۔

- **خود مختار طریقے سے سیکھنے کا موقع:** آن لائن لرننگ کے ذریعے طلبہ اپنی رفتار کے مطابق لیکچرز دیکھ سکتے ہیں، مشقیں حل کر سکتے ہیں، اور مختلف موضوعات پر گہرائی سے مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اس سے طلبہ اپنی تعلیمی ضرورت کے مطابق سیکھنے کا اختیار حاصل کرتے ہیں اور خود انحصاری میں اضافہ ہوتا ہے۔
- **فلپڈ کلاس روم کا نیا کردار:** فلپڈ کلاس روم میں معلوماتی مواد جیسے لیکچرز اور پڑھائی کا مواد گھر پر حاصل کی جاتی ہے، جبکہ کلاس روم میں اساتذہ طلبہ کی عملی سرگرمیوں، سوال و جواب، اور گروپ ورک پر توجہ دیتے ہیں۔ اس طریقے سے کلاس روم زیادہ انٹریکٹو، عملی اور بحث و مباحثے پر مبنی بن جاتا ہے۔
- **تنقیدی سوچ اور مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت:** جب طلبہ پہلے سے مواد کا مطالعہ کر کے کلاس میں آتے ہیں، تو وہ زیادہ بہتر طور پر سوالات کر سکتے ہیں، تجزیہ کر سکتے ہیں اور اپنی سوچ کو عملی مسائل پر لاگو کر سکتے ہیں۔ یہ عمل ان کی تنقیدی سوچ اور مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت کو فروغ دیتا ہے۔
- **عالمی رسائی اور تعلیمی مساوات:** آن لائن پلیٹ فارمز کے ذریعے طلبہ دنیا کے کسی بھی حصے سے معیاری تعلیمی مواد تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس سے دیہی اور پسماندہ علاقوں کے طلبہ بھی جدید تعلیمی مواقع سے مستفید ہو سکتے ہیں، جس سے تعلیمی مساوات میں اضافہ ہوتا ہے۔
- **اساتذہ کی تربیت اور تدریسی جدت:** فلپڈ کلاس روم اور آن لائن لرننگ کے نفاذ کے ذریعے اساتذہ نئے تدریسی طریقے اپناتے ہیں، نصاب کو زیادہ دلچسپ اور متحرک بناتے ہیں، اور طلبہ کی دلچسپی کو بڑھانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

> ٹیکنالوجی طلبہ کی ذہنی لچک، خود اعتمادی اور تخلیقی سوچ کو فروغ دے کر انھیں مستقبل کے پیچیدہ اور غیر متوقع چیلنجز کے لیے تیار کرتی ہے، اور ایک ایسے تعلیمی ماحول کی تخلیق کرتی ہے جہاں ہر طالب علم اپنی مکمل صلاحیت کے مطابق ترقی کر سکتا ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ آن لائن لرننگ اور فلپڈ کلاس روم نے تعلیم کے عمل کو نہ صرف زیادہ مؤثر اور انٹریکٹو بنایا ہے بلکہ اسے شمولیاتی اور عملی نوعیت کا بھی بنا دیا ہے۔ اس جدید تدریسی ماڈل کے ذریعے طلبہ محض معلومات کو یاد کرنے تک محدود نہیں رہتے بلکہ وہ مواد کا تجزیہ، اس پر بحث، اور عملی طور پر اطلاق کرنا سیکھتے ہیں، جس سے ان کی تنقیدی سوچ، مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت اور تخلیقی صلاحیتیں فروغ پاتی ہیں۔ مزید یہ کہ یہ طریقہ تعلیمی مساوات کو بھی بڑھاتا ہے، کیونکہ دیہی اور پسماندہ علاقوں کے طلبہ بھی آن لائن لیکچرز اور ڈیجیٹل مواد کے ذریعے عالمی معیار کی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں، جو پہلے صرف بڑے شہروں اور معیاری اداروں تک محدود تھی۔ اس طرح، فلپڈ کلاس روم اور آن لائن لرننگ طلبہ کو علمی اور عملی دونوں جہتوں میں تیار کرتے ہیں، انھیں خود مختار اور خود انحصار سیکھنے والا بناتے ہیں، اور مستقبل کے پیچیدہ چیلنجز سے نمٹنے کے لیے مضبوط بنیاد فراہم کرتے ہیں (Bishop &Verleger, 2013)

تعلیمی ایپس اور ڈیجیٹل وسائل

تعلیم اور ٹیکنالوجی کی دنیا میں تعلیمی ایپس اور دیگر ڈیجیٹل وسائل نے سیکھنے کے عمل کو مزید دلچسپ، موثر اور متنوع بنایا ہے۔ یہ ٹولز نہ صرف طلبہ کی دلچسپی بڑھاتے ہیں بلکہ اساتذہ کو نصاب کو زیادہ انٹریکٹو اور عملی انداز میں پیش کرنے کی سہولت بھی فراہم کرتے ہیں۔

- **دلچسپی اور انگیجمنٹ میں اضافہ:** گیم بیسڈ لرننگ، انٹریکٹو سافٹ ویئر اور موبائل ایپس طلبہ کو سیکھنے کے عمل میں شامل کرتے ہیں۔ کھیل اور مقابلے کے عناصر طلبہ کی توجہ برقرار رکھتے ہیں اور سیکھنے کو تفریحی اور پراثر بناتے ہیں۔
- **مشکل مضامین کو آسان بنانا:** مختلف مضامین جیسے ریاضی، سائنس اور زبان کی تعلیم میں ایپس پیچیدہ تصورات کو آسان اور سمجھنے کے قابل بنا دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر، سمیلیشنز اور ماڈلنگ کے ذریعے طلبہ نظریاتی تصورات کو عملی تجربات کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں۔
- **اساتذہ کی تدریسی صلاحیتوں میں اضافہ:** ڈیجیٹل وسائل اساتذہ کو نصاب کو زیادہ بصری، متحرک اور انٹریکٹو انداز میں پیش کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ اساتذہ مختلف ٹولز کے ذریعے طلبہ کی پیش رفت کو مانیٹر کر سکتے ہیں اور ہر طالب علم کی ضروریات کے مطابق تدریسی حکمت عملی اپنا سکتے ہیں۔
- **مستقل اور خود مختار سیکھنے کی سہولت:** طلبہ کسی بھی وقت اور کسی بھی جگہ ان ایپس اور پلیٹ فارمز کے ذریعے سیکھ سکتے ہیں، جس سے سیکھنے کا عمل مستقل اور خود مختار بن جاتا ہے۔ یہ خصوصیت خاص طور پر دیہی اور پسماندہ علاقوں کے طلبہ کے لیے فائدہ مند ہے۔
- **جدید صلاحیتوں کی ترقی:** ڈیجیٹل وسائل طلبہ میں جدید مہارتیں جیسے تنقیدی سوچ، مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت، تخلیقی سوچ اور تکنیکی فہم کو فروغ دیتے ہیں، جو آج کے عالمی تعلیمی اور پیشہ ورانہ ماحول کے لیے

انتہائی ضروری ہیں۔

نتیجہ یہ ہے کہ تعلیمی ایپس اور ڈیجیٹل وسائل نے تعلیم کو زیادہ مؤثر، دلچسپ اور قابل رسائی بنایا ہے۔ یہ نہ صرف طلبہ کی علمی ترقی کو فروغ دیتے ہیں بلکہ انہیں عملی زندگی اور مستقبل کے چیلنجز کے لیے تیار کرتے ہیں۔

ٹیکنالوجی کے فوائد

ٹیکنالوجی نے تعلیم کے عمل کو نہایت مؤثر اور دلچسپ بنایا ہے اور طلبہ کی علمی، تخلیقی اور عملی صلاحیتوں کو فروغ دیا ہے۔ اس کے اہم فوائد درج ذیل ہیں:

- **معیاری تعلیم کی سہولت:** آن لائن کورسز، ویڈیو لیکچرز اور ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کی بدولت طلبہ دنیا کے کسی بھی حصے سے معیاری تعلیمی مواد حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ دیہی اور پسماندہ علاقوں کے طلبہ کے لیے بھی تعلیم کے نئے مواقع فراہم کرتا ہے۔
- **تعلیمی مساوات:** ٹیکنالوجی ہر طالب علم کو سیکھنے کا موقع فراہم کرتی ہے، جس سے تعلیمی مساوات اور شمولیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ طلبہ اپنی استعداد کے مطابق سیکھ سکتے ہیں اور پیچھے رہ جانے والے طلبہ بھی جدید وسائل کے ذریعے ترقی کر سکتے ہیں۔
- **مہارتوں کی ترقی:** ٹیکنالوجی طلبہ میں تنقیدی سوچ، تخلیقی صلاحیت، مسئلہ حل کرنے کی مہارت اور تکنیکی قابلیت کو فروغ دیتی ہے، جو آج کے تیز رفتار اور پیچیدہ دنیا میں ضروری ہیں۔
- **خودمختار طریقے سے سیکھنا:** آن لائن وسائل کے ذریعے طلبہ کسی بھی وقت اور کسی بھی جگہ سیکھ سکتے ہیں، جس سے سیکھنے کا عمل مستقل اور خودمختار بن جاتا ہے۔

ٹیکنالوجی کے چیلنجز

اگرچہ ٹیکنالوجی کے فوائد بے شمار ہیں، مگر اس کے استعمال میں کچھ اہم چیلنجز بھی موجود ہیں، جن پر توجہ دینا ضروری ہے:

- **ڈیجیٹل ڈیوائڈ (Digital Divide):** کچھ طلبہ انٹرنیٹ اور جدید ڈیوائسز کی کمی کی وجہ سے ٹیکنالوجی کے فوائد سے محروم رہ جاتے ہیں۔
- **اساتذہ کی تربیت کا فقدان:** جدید ٹیکنالوجی کے موثر استعمال کے لیے اساتذہ کی مناسب تربیت ضروری ہے۔ تربیت نہ ہونے کی صورت میں ٹیکنالوجی کا مؤثر نفاذ ممکن نہیں ہوتا۔
- **وسائل کی کمی:** اسکولوں میں جدید ٹیکنالوجی اور ڈیجیٹل وسائل کی کمی بھی تعلیم کے معیار پر منفی اثر ڈال سکتی ہے۔
- **تعلیمی توجہ میں کمی:** بعض اوقات زیادہ تکنیکی وسائل طلبہ کی توجہ کو منتشر کر سکتے ہیں، اگر انھیں موثر طریقے سے کلاس روم میں استعمال نہ کیا جائے۔
- **حل کے اقدامات:** ان چیلنجز سے نمٹنے کے لیے اسکولوں اور حکومتوں کو مضبوط پالیسی، وسائل کی فراہمی اور اساتذہ کی تربیت کو یقینی بنانا چاہیے، تاکہ ہر طالب علم ٹیکنالوجی کے فوائد سے بھرپور مستفید ہو سکے۔

تعلیم اور ٹیکنالوجی کی نئی دنیا نے موجودہ دور کے تعلیمی نظام کو بنیادی طور پر تبدیل کر دیا ہے۔ ٹیکنالوجی نے نہ صرف کلاس روم کے ماحول کو زیادہ انٹرایکٹو اور دلچسپ بنایا ہے بلکہ طلبہ کی علمی، تخلیقی اور عملی صلاحیتوں کو بھی فروغ دیا ہے۔ آن لائن لرننگ، فلپڈ کلاس روم، تعلیمی ایپس اور ڈیجیٹل وسائل نے تعلیم کے معیار، رسائی اور شمولیت میں اضافہ کیا ہے، اور ہر طالب علم کو اپنی رفتار اور ضرورت کے مطابق سیکھنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ مزید یہ کہ ٹیکنالوجی طلبہ کی تنقیدی سوچ، مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت، اور خود انحصاری کو بڑھا کر انھیں عملی زندگی اور پیشہ ورانہ ماحول کے لیے تیار کرتی ہے۔ اساتذہ کے لیے بھی یہ ایک طاقتور وسیلہ ہے جو نصاب کو زیادہ متنوع، بصری اور دلچسپ بنانے میں مدد دیتا ہے، اور کلاس روم کے اندر طلبہ کی شرکت اور انگیجمنٹ کو فروغ دیتا ہے۔ اگرچہ ٹیکنالوجی کے استعمال میں چیلنجز موجود ہیں جیسے ڈیجیٹل ڈیوائڈ، وسائل کی کمی اور اساتذہ کی تربیت کا فقدان۔ لیکن مضبوط پالیسی، مناسب وسائل اور تربیت کے ذریعے ان رکاوٹوں پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ اس طرح تعلیم اور ٹیکنالوجی کا ملاپ ایک متوازن اور شمولیاتی تعلیمی ماحول قائم کرتا ہے جو طلبہ کے ہر پہلو کی ترقی کو ممکن بناتا ہے (Hennessy, Ruthven, & Brindley, 2005)۔ آخرکار، تعلیم اور ٹیکنالوجی کی نئی دنیا نہ صرف موجودہ تعلیمی معیار کو بہتر بناتی ہے بلکہ طلبہ کو مستقبل کی پیچیدہ دنیا میں کامیابی عطا کرنے کے لیے تیار کرنے کا ایک مضبوط ذریعہ بھی فراہم کرتی ہے۔ یہ ہر طالب علم کے لیے مساوی مواقع، عملی مہارتیں اور تخلیقی صلاحیتیں پیدا کرنے کا ایک طاقتور ذریعہ ہے، جو انھیں روشن اور کامیاب مستقبل کی طرف لے جاتا ہے۔

ٹیکنالوجی ہر طالب علم کو سیکھنے کا موقع فراہم کرتی ہے، جس سے تعلیمی مساوات اور شمولیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ طلبہ اپنی استعداد کے مطابق سیکھ سکتے ہیں اور پیچھے رہ جانے والے طلبہ بھی جدید وسائل کے ذریعے ترقی کر سکتے ہیں۔

Md Jamshed Alam
Ph.D. scholar (Education),
MANUU College of Teacher Education
Darbhanga Pin-846001
Email: jamshedalam2487@gmail.com

گلاب سنگھ

ڈیجیٹل انقلاب اور اردو

اے آئی کے عہد میں زبان کا چیلنج

اردو اپنے ثروت مند ادبی سرمایہ کی بدولت ابتدا ہی سے ایک اہم اور منفرد زبان رہی ہے۔ اس کی مٹھاس، روانی، اور جذباتی گہرائی نے اسے لاکھوں دلوں کی دھڑکن بنایا ہے۔ لیکن جیسے جیسے دنیا تیزی سے ڈیجیٹل انقلاب کی طرف بڑھ رہی ہے، اردو زبان کو بھی نئے چیلنجز کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ڈیجیٹل انقلاب نے جہاں مواصلات، تعلیم، اور کاروبار کے نئے دروازے کھولے ہیں، وہیں اس نے زبانوں کے استعمال اور ان کی ترقی پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ خاص طور پر مصنوعی ذہانت (اے آئی) کے عہد میں، اردو زبان کو اپنی شناخت، اہمیت، اور ترقی کے لیے نئے مواقع کے ساتھ ساتھ کئی مشکلات کا بھی سامنا ہے۔ اردو زبان کی تاریخ بہت قدیم اور رنگا رنگ ہے۔ اس کی جڑیں ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب میں پیوست ہیں، جہاں فارسی، عربی، ترکی، اور مقامی ہندوستانی زبانوں کے امتزاج سے یہ زبان وجود میں آئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اردو نے شاعری، افسانے، ڈرامے، اور نثر کے ذریعے اپنی ایک منفرد شناخت بنائی۔ غالب، اقبال، فیض، کرشن چندر اور منٹو جیسے ادیبوں نے اسے ایسی بلندیوں پر پہنچایا کہ یہ نہ صرف ہندوستان کی ایک ادبی زبان قرار پائی بلکہ عالمی سطح پر بھی اس کی دھاک بیٹھی۔ لیکن آج جب ہم ڈیجیٹل دور میں داخل ہو چکے ہیں، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اردو اس تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں اپنی جگہ برقرار رکھ سکتی ہے؟

ڈیجیٹل انقلاب نے مواصلات کے طریقوں کو یکسر بدل دیا ہے۔ پہلے جہاں خطوط، کتابیں، اور اخبارات مواصلات کے اہم ذرائع تھے، وہاں اب سماجی رابطوں کی ویب سائٹس، موبائل ایپلیکیشنز، اور آن لائن پلیٹ فارمز نے ان کی جگہ لے لی ہے۔ لوگ اب واٹس ایپ، فیس بک، اور ٹویٹر جیسے پلیٹ فارمز پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے، ان پلیٹ فارمز پر اردو کا استعمال بہت کم ہے۔ زیادہ تر مواد انگریزی یا دیگر عالمی زبانوں میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کی ترقی میں مغربی ممالک کا کردار اہم رہا ہے، اور انھوں نے اپنی زبانوں کو ترجیح دی۔ نتیجتاً، اردو جیسی زبانوں کے لیے ڈیجیٹل ٹولز، مثلاً کی بورڈ، فونٹس، یا سافٹ ویئر، کی کمی رہی ہے۔ اگرچہ اب اردو کی بورڈز اور فونٹس ہیں، لیکن ان کا استعمال اب بھی محدود ہے۔

مصنوعی ذہانت نے اس صورتحال کو مزید پیچیدہ کر دیا ہے۔ اے آئی سے چلنے والے سافٹ ویئرز، مثلاً گوگل ٹرانسلیٹ، چیٹ بوٹس، اور وائس اسسٹنٹس، اب روزمرہ زندگی کا حصہ بن چکے ہیں۔ لیکن ان ٹولز میں اردو کی سہولت یا تو نہ ہونے کے برابر ہے یا بہت ناقص ہے۔ مثال کے طور پر، اگر آپ گوگل ٹرانسلیٹ سے اردو میں ترجمہ کروانے کی کوشش کریں تو اکثر جملے غلط یا بے معنی ترجمہ ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اے آئی سسٹمز کو تربیت دینے کے لیے بڑی مقدار میں ڈیٹا درکار ہوتا ہے، اور اردو زبان کا ڈیجیٹل ڈیٹا ٹیکسٹ کی صورت میں بہت کم ہے۔ انگریزی، چینی، یا ہسپانوی جیسی زبانوں کے مقابلے میں اردو کے آن لائن مواد، کتابوں، یا ویب سائٹس کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ ریختہ کے پاس گرچہ قریب سوا لاکھ کتابیں موجود ہیں۔ لیکن اے آئی سسٹمز ٹیکسٹ ڈیٹا سے جوابات فراہم کرتے ہیں وہاں پی ڈی ایف فارم میں ہونے کی وجہ سے یہ سسٹمز استفادہ نہیں کر پاتے ہیں۔ اس کمی کی وجہ سے اے آئی سسٹمز اردو کو سمجھنے یا اس کا درست استعمال کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ اردو کے سامنے ایک بڑا چیلنج اس کی نئی نسل کے ساتھ رابطہ کمزور ہونا ہے۔ آج کی نسل زیادہ تر انگریزی یا مقامی بولیوں کو ترجیح دیتی ہے کیونکہ ڈیجیٹل دنیا میں انگریزی کا رجحان غالب ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں بھی انگریزی کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے، جس کی وجہ سے بچے اردو سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ نتیجتاً، وہ نہ تو اردو پڑھ سکتے ہیں اور نہ ہی لکھ سکتے ہیں۔ یہ ایک غیر صحت مند رجحان ہے کیونکہ اگر نئی نسل اپنی زبان سے کٹ جائے گی تو اردو کی ادبی اور ثقافتی وراثت خطرے میں پڑ جائے گی۔

ڈیجیٹل انقلاب نے جہاں چیلنجز پیدا کیے ہیں، وہیں اس نے اردو کے لیے نئے مواقع بھی فراہم کیے ہیں۔ آن لائن پلیٹ فارمز کے ذریعے اردو شاعری، افسانے، اور دیگر ادبی مواد کو عالمی سطح پر پھیلانے کا موقع ملا ہے۔ مثال کے طور پر، یوٹیوب پر اردو کے مشاعرے، ویب سائٹس پر اردو کہانیاں، اور سماجی رابطوں کی سائٹس پر اردو پوسٹس نے اس زبان کو نئی زندگی دی ہے۔ لیکن یہ مواد اب بھی محدود ہے، اور اسے منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر اردو کے ادیب، شاعر، اور مواد تخلیق کرنے والے افراد ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کا بھرپور استعمال کریں تو اردو کی رسائی کو بڑھایا جا سکتا ہے۔ ایک اور اہم پہلو ڈیجیٹل تعلیم ہے۔ آج کل آن لائن کورسز، ای بکس، اور تعلیمی ویب سائٹس بہت مقبول ہیں۔ لیکن اردو میں ایسی ویب سائٹس یا کورسز بہت کم ہیں۔ اگر اردو میں تعلیمی مواد تیار کیا جائے تو نہ صرف بچوں کی تعلیم آسان ہوگی بلکہ وہ اپنی زبان سے بھی جڑے رہیں گے۔ مثال کے طور پر، سائنس،

ریاضی، یا تاریخ جیسے مضامین کو اردو میں سادہ زبان میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس سے نہ صرف اردو کا استعمال بڑھے گا بلکہ وہ لوگ جو انگریزی میں کمزور ہیں، وہ بھی جدید علوم سے استفادہ کر سکیں گے۔

مصنوعی ذہانت کے عہد میں اردو کے لیے سب سے بڑا چیلنج اس کا ڈیجیٹل ڈیٹا بیس بنانا ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اے آئی ٹولز اردو کو سمجھیں اور اس کا درست استعمال کریں تو ہمیں بڑی مقدار میں اردو مواد آن لائن لانا ہوگا۔ اس کے لیے اردو کتابوں کو ڈیجیٹل شکل میں تبدیل کرنا، ویب سائٹس بنانا، اور آن لائن ڈکشنریوں کو بہتر بنانا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر، اردو کی مشہور کتابوں، جیسے کہ دیوان غالب یا منٹو کے افسانوں، کو ای بکس کی شکل میں مفت یا کم قیمت پر دستیاب کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح، اردو کے لیے ایک مضبوط آن لائن ڈکشنری بنائی جا سکتی ہے جو نہ صرف الفاظ کے معنی بتائے بلکہ ان کے درست تلفظ اور استعمال کو بھی سمجھائے۔ اس کمی کو اگرچہ کچھ حد تک ریختہ ڈکشنری پوری کرتی نظر آ رہی ہے، تاہم اس کی اور زیادہ ضرورت ہے۔ اردو کے فروغ کے لیے سماجی رابطوں کی سائٹس کا کردار بھی بہت اہم ہے۔ آج کل نوجوان اپنا زیادہ تر وقت فیس بک، ٹویٹر، یا انسٹاگرام پر گزارتے ہیں۔ اگر ان پلیٹ فارمز پر اردو میں دلچسپ مواد، جیسے کہ شاعری، چھوٹی کہانیاں، یا مضحکہ خیز پوسٹس، شیئر کی جائیں تو نئی نسل کی دلچسپی بڑھ سکتی ہے۔ لیکن اس کے لیے مواد کو جدید اور پرکشش بنانا ہوگا۔ مثال کے طور پر، اردو شاعری کو خوبصورت گرافکس یا ویڈیوز کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس سے نہ صرف اردو کا استعمال بڑھے گا بلکہ یہ نوجوانوں کے لیے بھی دلچسپ بن جائے گی۔

ڈیجیٹل انقلاب نے اردو کے لیے ایک اور اہم موقع فراہم کیا ہے، اور وہ ہے آن لائن مشاعروں اور ادبی تقریبات کا انعقاد۔ کورونا وبا کے دوران جب لوگ گھروں میں بند تھے، بہت سے مشاعرے اور ادبی نار آن لائن ہوئے۔ ان تقریبات نے نہ صرف اردو شاعری کو زندہ رکھا بلکہ اسے عالمی سطح پر وسعت دینے میں بھی مدد دی۔ لیکن یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ ادبی تنظیموں اور ادیبوں کو چاہیے کہ وہ باقاعدگی سے آن لائن مشاعرے، کتابوں پر تبصرے، اور ادبی مباحثے منعقد کریں۔ اس سے اردو ادب کے شائقین کی تعداد بڑھے گی، اور نئے ادیبوں کو بھی اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ملے گا۔

اردو کے سامنے ایک اور بڑا چیلنج اس کا معیاری مواد ہے۔ ڈیجیٹل دنیا میں مواد کی مقدار کے ساتھ ساتھ اس کا معیار بھی بہت اہم ہے۔ بدقسمتی سے، اردو میں آن لائن مواد اکثر غیر معیاری ہوتا ہے۔ غلط املا، غیر ضروری انگریزی الفاظ کا استعمال، اور ناقص ترجمہ اردو کی ساکھ کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اردو کے ادیب، صحافی، اور مواد تخلیق کرنے والے افراد معیاری مواد تیار کریں۔ مثال کے طور پر، اگر کوئی ویب سائٹ یا بلاگ اردو میں بنایا جائے تو اس کی زبان درست، سادہ، اور پرکشش ہونی چاہیے۔ اسی طرح، اردو کے لیے ایک معیاری ایڈیٹنگ سافٹ ویئر بنایا جا سکتا ہے جو غلط املا یا گرامر کی اصلاح کر سکے۔

> **مصنوعی ذہانت کے عہد میں اردو کے لیے سب سے بڑا چیلنج اس کا ڈیجیٹل ڈیٹا بیس بنانا ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اے آئی ٹولز اردو کو سمجھیں اور اس کا درست استعمال کریں تو ہمیں بڑی مقدار میں اردو مواد آن لائن لانا ہوگا۔**

اردو کی ترقی کے لیے تعلیمی اداروں کا کردار بھی بہت اہم ہے۔ بدقسمتی سے اسکولوں میں اردو کو وہ اہمیت نہیں دی جاتی جو اسے ملنی چاہیے۔ زیادہ تر توجہ انگریزی پر ہوتی ہے کیونکہ یہ عالمی رابطہ کی زبان سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اگر ہم اپنی ثقافتی اور ادبی وراثت کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو اردو کو لازمی مضمون کے طور پر پڑھانا ہوگا۔ اس کے علاوہ، اساتذہ کو جدید ٹیکنالوجی کا استعمال کرتے ہوئے اردو پڑھانے کی تربیت دینی چاہیے۔ مثال کے طور پر، انٹرایکٹو ایپس یا گیمز کے ذریعے بچوں کو اردو سکھائی جا سکتی ہے۔ اس سے نہ صرف بچوں کی دلچسپی بڑھے گی بلکہ وہ اردو سے محبت بھی کریں گے۔

اردو کے فروغ کے لیے حکومتی سطح پر بھی اقدامات کی ضرورت ہے۔ حکومتیں اردو کے لیے ڈیجیٹل وسائل کی ترقی پر توجہ دیں تو اس زبان کی ترقی ممکن ہے۔ مثلاً قومی سطح پر ایک ڈیجیٹل لائبریری بنائی جا سکتی ہے جس میں اردو کی تمام مشہور کتابیں، رسائل، اور اخبارات آن لائن ہوں۔ اس کے علاوہ، اردو کے لیے ایک قومی ایپ بنایا جا سکتا ہے جو اردو سیکھنے، پڑھنے، اور لکھنے میں مدد دے۔ اس طرح کے اقدامات سے اردو کو نہ صرف مقامی سطح پر بلکہ عالمی سطح پر بھی فروغ حاصل ہوگا۔

ایک اور اہم پہلو اردو کے ادیبوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی ہے۔ ڈیجیٹل انقلاب نے ادیبوں کے لیے نئے مواقع پیدا کیے ہیں، لیکن بدقسمتی سے بہت سے ادیب اس سے فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں۔ اگر ادیب اپنا مواد آن لائن شیئر کریں، مثلاً بلاگز، ای بکس، یا ویڈیوز، تو وہ نئے قارئین تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس کے لیے ادبی تنظیموں کو چاہیے کہ وہ ادیبوں کو ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کی تربیت دیں۔ مثال کے طور پر، وہ انھیں سکھائیں کہ کس طرح ایک بلاگ شروع کیا جائے یا سوشل میڈیا پر مواد شیئر کیا جائے۔ اس سے نہ صرف ادیبوں کی آمدنی بڑھے گی بلکہ اردو ادب کی رسائی بھی بڑھے گی۔

ڈیجیٹل انقلاب نے اردو کے لیے ایک اور بڑا چیلنج پیدا کیا ہے، اور وہ ہے زبان کی مخلوط شکل۔ آج کل بہت سے لوگ اردو کو انگریزی کے ساتھ ملا کر لکھتے ہیں یا اردو کی تحریر کو رومن اسکرپٹ یا دیوناگری اسکرپٹ میں لکھتے ہیں۔ اگرچہ یہ ایک فطری عمل ہے، لیکن اس سے اردو کی اصل شناخت خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کو خالص اردو لکھنے کی ترغیب دی جائے۔ اس کے علاوہ، اردو کے نئے الفاظ اور اصطلاحات وضع کرنے کی ضرورت ہے جو جدید ٹیکنالوجی پر مبنی تصورات و مضمرات کو زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کر سکیں۔ مثال کے طور پر، انگریزی لفظ ''انٹرنیٹ'' کے لیے اردو میں ایک نیا لفظ بنایا جا سکتا ہے۔ اس سے نہ صرف اردو کا دائرہ وسیع تر ہوگا بلکہ یہ جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ بھی ہوگی۔

اردو کی ترقی کے لیے کمیونٹی سطح پر بھی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اردو بولنے والے افراد کو چاہیے کہ وہ اپنی زبان کو اپنے گھروں، اسکولوں، اور سماجی تقریبات

میں استعمال کریں۔ اگر والدین اپنے بچوں سے اردو میں بات کریں اور انھیں اردو کی کہانیاں سنائیں تو بچے اس زبان سے جڑے رہیں گے۔ اس کے علاوہ، مقامی سطح پر اردو کے ادبی کلب بنائے جا سکتے ہیں جو کتابوں پر تبصرے، شاعری کی محفلیں، اور مصنفین کے ساتھ ملاقاتیں کریں۔ اس سے نہ صرف اردو کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا بلکہ لوگوں کا اس سے جذباتی لگاؤ بھی بڑھے گا۔

ڈیجیٹل انقلاب نے اردو کے لیے اہم موقع فراہم کیا ہے، اور وہ ہے عالمی سطح پر اس کی ترویج۔ آج کل انٹرنیٹ کی بدولت کوئی بھی مواد دنیا کے کسی بھی کونے تک پہنچ سکتا ہے۔ اگر اردو کے ادیب اور شاعر اپنا مواد انگریزی یا دیگر زبانوں میں ترجمہ کر کے شیئر کریں تو اردو ادب کو عالمی شناخت مل سکتی ہے۔ مثال کے طور پر، اقبال کی شاعری یا منٹو کے افسانوں کو انگریزی میں ترجمہ کر کے عالمی قارئین تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے ترجمہ کے معیاری سافٹ ویئرز بنانے کی ضرورت ہے جو اردو کے لہجے اور جذباتی گہرائی کو برقرار رکھ سکیں۔

اردو کے سامنے ایک اور چیلنج اس کا رسم الخط ہے۔ اردو کا نستعلیق رسم الخط اپنی خوبصورتی کے لیے مشہور ہے، لیکن ڈیجیٹل دنیا میں اسے استعمال کرنا مشکل ہے۔ زیادہ تر سافٹ ویئرز نستعلیق کے بجائے عربی رسم الخط کو ترجیح دیتے ہیں، جو اردو کے لیے موزوں نہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ نستعلیق فونٹس کو ڈیجیٹل پلیٹ فارمز پر زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جائے۔ اس کے علاوہ، اردو کی بورڈز کو مزید آسان اور صارف دوست بنانے کی ضرورت ہے تاکہ لوگ آسانی سے اردو لکھ سکیں۔

مصنوعی ذہانت کے عہد میں اردو کے لیے ایک اور اہم چیلنج اس کی آواز کی شناخت ہے۔ آج کل لوگ ٹیکسٹ کی بجائے آواز کے ذریعے مواصلات کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن اردو کے لیے وائس ریکگنیشن سسٹمز ابھی تک ترقی یافتہ نہیں ہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اردو اس ڈیجیٹل دور میں زندہ رہے تو ہمیں وائس ریکگنیشن سافٹ ویئر بنانے کی ضرورت ہے جو اردو کے مختلف لہجوں اور بولیوں کو سمجھ سکے۔ اس کے لیے بڑی مقدار میں اردو آواز کا ڈیٹا جمع کرنا ہوگا، جو ایک مشکل لیکن ضروری کام ہے۔

اردو کے فروغ کے لیے میڈیا کا کردار بھی بہت اہم ہے۔ آج کل ٹیلی ویژن، ریڈیو، اور آن لائن میڈیا

ڈیجیٹل انقلاب نے اردو کے لیے ایک اہم موقع یہ بھی فراہم کیا ہے اور وہ ہے آن لائن تعلیمی پلیٹ فارمز۔ آج کل ان اکیڈمی، بائی جوز جیسے پلیٹ فارمز بہت مقبول ہیں۔ اگر ان پلیٹ فارمز پر اردو میں کورسز بنائے جائیں تو نہ صرف اردو کی تعلیم کو فروغ ملے گا بلکہ وہ لوگ جو انگریزی میں کمزور ہیں، وہ بھی جدید علوم سے استفادہ کر سکیں گے۔

لوگوں تک معلومات پہنچانے کا اہم ذریعہ ہیں۔ اگر اردو میں معیاری خبریں، ڈرامے، اور پروگرام پیش کیے جائیں تو لوگوں کی دلچسپی بڑھ سکتی ہے۔ مثال کے طور پر، اردو میں سائنسی پروگرام یا بچوں کے لیے کارٹون بنائے جا سکتے ہیں۔ اس سے نہ صرف اردو کا استعمال بڑھے گا بلکہ یہ جدید علوم کے ساتھ بھی جڑ جائے گی۔

اردو کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ہم اسے صرف ادبی زبان تک محدود نہ رکھیں۔ اردو کو سائنس، ٹیکنالوجی، اور کاروبار کی زبان بنانے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے نئے الفاظ و اصطلاحات وضع کرنی ہوں گی جو جدید تصورات و مسائل کی وضاحت کر سکیں۔ مثال کے طور پر، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، یا مصنوعی ذہانت جیسے الفاظ کے متبادل اردو میں بنائے جا سکتے ہیں۔ اس سے اردو نہ صرف جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوگی بلکہ اس کا دائرہ بھی وسیع ہوگا۔

ڈیجیٹل انقلاب نے اردو کے لیے ایک اہم موقع یہ بھی فراہم کیا ہے اور وہ ہے آن لائن تعلیمی پلیٹ فارمز۔ آج کل ان اکیڈمی، بائی جوز جیسے پلیٹ فارمز بہت مقبول ہیں۔ اگر ان پلیٹ فارمز پر اردو میں کورسز بنائے جائیں تو نہ صرف اردو کی تعلیم کو فروغ ملے گا بلکہ وہ لوگ جو انگریزی میں کمزور ہیں، وہ بھی جدید علوم سے استفادہ کر سکیں گے۔ اس کے لیے اردو کے اساتذہ اور ماہرین کو چاہیے کہ وہ اپنا مواد آن لائن شیئر کریں۔ اردو کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ ہم اسے برصغیر تک محدود نہ رکھیں۔ دنیا بھر میں اردو بولنے والے افراد موجود ہیں، خاص طور پر مشرق وسطیٰ، یورپ، اور شمالی امریکہ میں۔ اگر ہم ان کمیونٹیز کو اردو کے ادبی اور ثقافتی پروگراموں سے جوڑیں تو اردو کو عالمی سطح پر فروغ حاصل ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر، عالمی سطح پر اردو مشاعروں یا کتاب میلے منعقد کیے جا سکتے ہیں۔ اس سے نہ صرف اردو کی مقبولیت بڑھے گی بلکہ اس کی ثقافتی اہمیت بھی اجاگر ہوگی۔ ڈیجیٹل انقلاب نے اردو کے لیے ایک اور اہم چیلنج پیدا کیا ہے، اور وہ ہے اس کی مسابقت۔ آج کی دنیا میں زبانوں کے درمیان ایک مسابقت ہے۔ انگریزی، چینی، اور ہسپانوی جیسی زبانیں اپنی ڈیجیٹل موجودگی کی وجہ سے غالب ہیں۔ اگر اردو کو اس مسابقت میں شامل ہونا ہے تو ہمیں اس کی ڈیجیٹل موجودگی کو مضبوط کرنا ہوگا۔ اس کے لیے نہ صرف مواد کی مقدار بڑھانی ہوگی بلکہ اس کے معیار پر بھی توجہ دینی ہوگی۔ اردو کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ ہم اسے ایک زندہ زبان کے طور پر دیکھیں۔ زبان وہی زندہ رہتی ہے جو وقت کے ساتھ بدلتی اور ترقی کرتی ہے۔ اگر ہم اردو کو صرف ماضی کی روایات تک محدود رکھیں گے تو وہ ایک عجائب گھر کی چیز بن جائے گی۔ اس کے لیے ہمیں نئے ادیبوں، شاعروں، اور مواد تخلیق کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنی ہوگی۔ اس کے علاوہ، اردو کو جدید علوم اور ٹیکنالوجی کے ساتھ جوڑنا ہوگا۔ اگر ہم یہ سب کر سکیں تو اردو نہ صرف اس ڈیجیٹل انقلاب میں زندہ رہے گی بلکہ ایک عالمی زبان کے طور پر بھی ابھر سکتی ہے۔

آخر میں، یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ڈیجیٹل انقلاب اور مصنوعی ذہانت کا عہد اردو کے لیے ایک سنہری موقع ہے۔ اگر ہم اس موقع سے فائدہ اٹھائیں تو اردو نہ صرف اپنی شناخت برقرار رکھ سکتی ہے بلکہ نئی بلندیوں کو بھی چھو سکتی ہے۔ اس کے لیے ہمیں مل کر کام کرنا ہوگا۔ ادیبوں، اساتذہ، طلبہ، اور عام لوگوں کو اپنی زبان کے لیے آگے آنا ہوگا۔ اگر ہم اپنی زبان سے محبت کریں اور اسے جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کریں تو اردو کا مستقبل روشن ہے۔ یہ زبان ہماری ثقافت، تاریخ، اور شناخت کا حصہ ہے، اور اسے زندہ رکھنا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔

■

Dr. Gulab Singh
R/O Beoli Doda
PinCode-182202
Mobile No : 7006847561

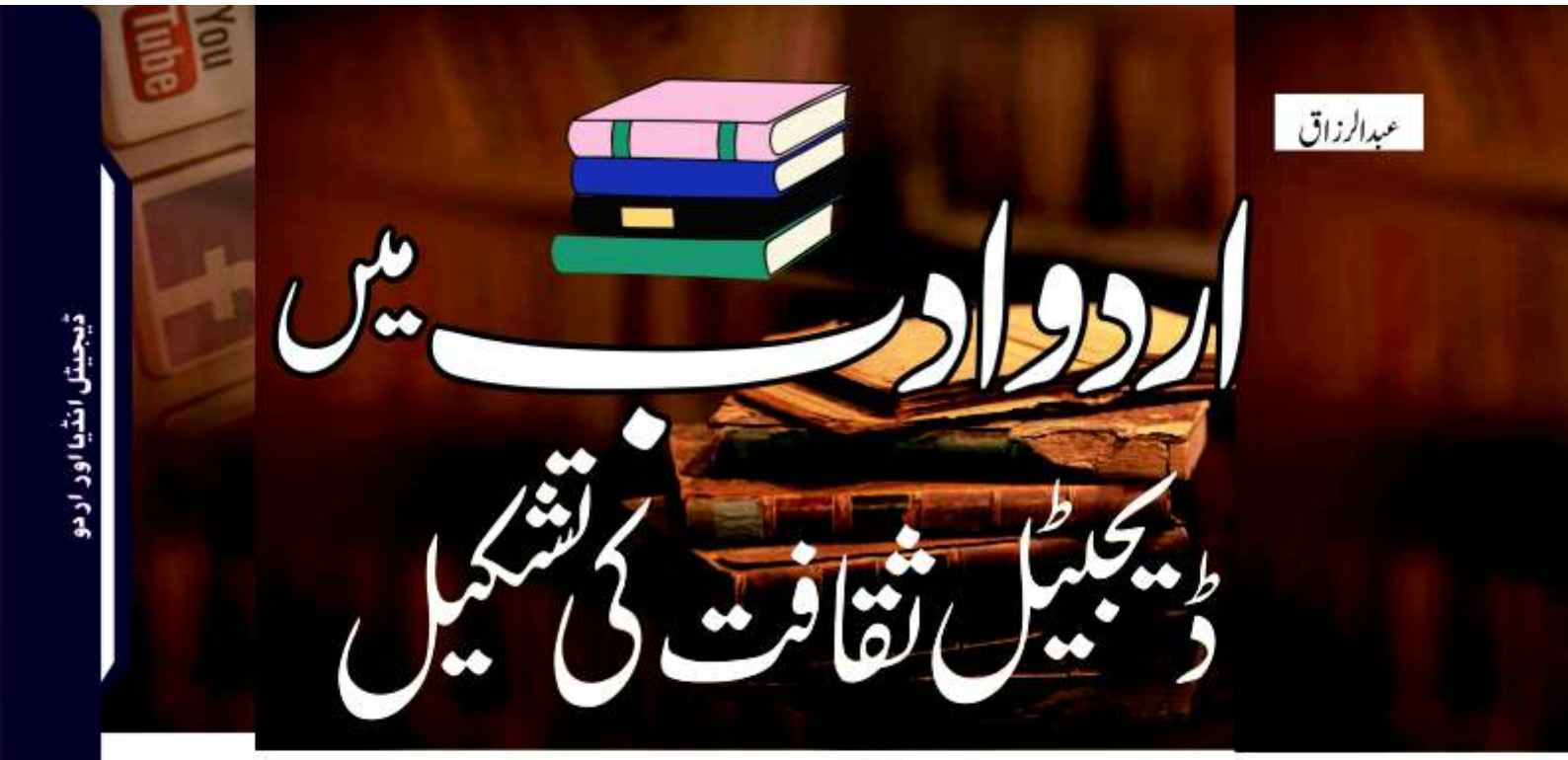

اردو ادب میں ڈیجیٹل ثقافت کی تشکیل

عبدالرزاق

اردو ادب کی تاریخ میں ہر دور کسی نہ کسی فکری، سماجی یا فنی انقلاب کا آئینہ دار رہا ہے۔ کلاسیکی عہد میں داستان وقصیدہ، سرسید کے زمانے میں اصلاح و بیداری، ترقی پسند تحریک میں سماجی شعور اور جدیدیت میں انفرادی کرب نمایاں نظر آتا ہے۔ موجودہ دور، ایک ایسے ہمہ گیر انقلاب کا عہد ہے جہاں قلم کی جگہ، کی۔ بورڈ اور کاغذ کی جگہ اسکرین نے لے لی ہے۔ اردو ادب کی تاریخ مسلسل تغیر وارتقا کی تاریخ رہی ہے۔ ہر عہد میں بدلتے ہوئے سماجی، تہذیبی اور فکری حالات نے ادبی اظہار کے اسالیب، موضوعات اور ذرائع پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ یہ تبدیلی محض تکنیکی نوعیت کی نہیں بلکہ اس کے اثرات اردو ادب کی ہیئت، مزاج، ترسیل اور فکری ساخت تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ڈیجیٹل عہد کے آغاز کے ساتھ ہی اردو ادب ایک نئے ابلاغی نظام سے وابستہ ہو گیا ہے۔ جہاں ماضی میں ادبی تخلیقات رسائل، اخبارات اور کتابوں کے توسط سے قاری تک پہنچتی تھیں، وہیں آج سوشل میڈیا پلیٹ فارمز، آن لائن جرائد، بلاگز اور ویب سائٹس ادب کی اشاعت کا بنیادی ذریعہ بنتے جا رہے ہیں۔ اس تبدیلی نے ادبی ترسیل کے وقت، رفتار اور دائرۂ اثر کو یکسر بدل دیا ہے۔ اردو ادب اب ایک مخصوص جغرافیے یا ادبی حلقے تک محدود نہیں رہا بلکہ عالمی سطح پر قارئین سے مکالمہ کر رہا ہے۔

اردو ادب نے اپنی روایت کے اعتبار سے ہمیشہ اپنے عہد کی سماجی، تہذیبی اور فکری کیفیات کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ تاہم بیسویں صدی کے آخری برسوں اور اکیسویں صدی کے ابتدائی دور میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں، انہوں نے ادب کے محض اظہار کے ذرائع ہی نہیں بدلے بلکہ اس کی ساخت، ترسیل اور معنوی جہات کو بھی ازسرِنو مرتب کر دیا۔ یہ تغیر محض تکنیکی پیش رفت تک محدود نہیں رہا بلکہ فکری اور ثقافتی سطح پر ایک ہمہ گیر تبدیلی کی صورت اختیار کر گیا۔ ڈیجیٹل ٹیکنالوجی اور سوشل میڈیا کے فروغ نے ادبی تخلیق کے مفہوم، قاری کی حیثیت اور ادب کے سماجی کردار پر نئے سوالات قائم کیے ہیں۔ ابلاغ کے یہ نئے ذرائع نہ صرف اظہار کو تیز رفتار اور بین المتنی بنا رہے ہیں بلکہ انہوں نے ادب کو روایتی اشاعتی اداروں کی مرکزیت سے نکال کر ایک ایسے غیر مرکزیت یافتہ اور فوری نظام میں داخل کر دیا ہے، جہاں قاری اور تخلیق کار کے درمیان سرحدیں بتدریج معدوم ہو رہی ہیں۔ اس نئے تناظر میں ہر فرد بیک وقت تخلیق اور تنقید کے عمل میں شریک نظر آتا ہے، جو اردو ادب کے لیے ایک نئے فکری مرحلے کی نشاندہی کرتا ہے۔

ڈیجیٹل ٹیکنالوجی نے علم و ادب کے اظہار اور ترسیل کے طریقوں میں ایک بنیادی تبدیلی پیدا کی ہے، جس کے نتیجے میں روایتی ادبی اور علمی ڈھانچوں کو نہ صرف چیلنج کا سامنا ہوا ہے بلکہ ان کی وسعت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ برقی اشاعت نے طباعت سے وابستہ اخراجات، وقت اور مقام کی پابندیوں کو بڑی حد تک کم کر دیا ہے، جس سے اردو زبان و ادب کے قارئین کو عالمی سطح پر علمی اور تخلیقی مواد تک بہتر رسائی حاصل ہوئی ہے۔ ڈیجیٹل ذرائع کے تحت آن لائن جرائد، ادبی ویب سائٹس، ای بکس، تحقیقی مقالہ جات اور تراجم اب صرف جامعات یا کتب خانوں تک محدود نہیں رہے بلکہ موبائل فون اور لیپ ٹاپ جیسے ڈیجیٹل آلات کے ذریعے ہر وقت دستیاب ہیں۔ یہ وسعت محض سہولت نہیں بلکہ اس تبدیلی کی علامت ہے جس نے علم و ادب کو جغرافیائی سرحدوں، طبقاتی تفریق اور ادارہ جاتی کنٹرول سے بڑی حد تک آزاد کر دیا ہے۔ مزید یہ کہ ڈیجیٹل دنیا میں پیدا ہونے والی یہ آزادی صرف قاری تک محدود نہیں بلکہ مصنف، ناقد اور محقق کے لیے بھی نئے مواقع اور امکانات فراہم کرتی ہے۔ ماضی میں اشاعت کے عمل میں مالی وسائل، محدود رسائی اور ادارتی فیصلے اکثر تخلیقی عمل کو سست یا محدود کر دیتے تھے، تاہم موجودہ دور میں خود اشاعت، اوپن ایکسس اور آزاد ادبی پلیٹ فارمز نے اُن آوازوں کو سامنے آنے کا موقع دیا ہے جو پہلے حاشیے پر چلی جاتی تھیں۔ اسی ادبی تناظر میں نوجوان لکھنے والے اب روایتی اشاعتی اداروں کی منظوری کے بغیر اپنی تحریروں کو وسیع اور بین الاقوامی حلقۂ قارئین تک مؤثر انداز میں پہنچانے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔

اسی طرح سوشل میڈیا کی آمد کے بعد اظہار کا وہ خلا جو پہلے کسی حد تک موجود تھا، اب بڑی حد تک پُر ہو چکا ہے۔ فیس بک، ٹوئٹر، انسٹاگرام اور یوٹیوب جیسے پلیٹ فارمز نے تخلیقی اظہار کو نہ صرف فوری اور مختصر بنا

دیا ہے بلکہ اس میں ایک متحرک بصری اور بین المتنی جہت بھی شامل کر دی ہے۔ فیس بک پر تحریری اظہارات کے ساتھ تبصروں، ردِعمل اور ترسیل کے عمل نے متن کو یک رخی رکھنے کے بجائے مکالماتی صورت دے دی ہے، جس سے قاری محض سامع نہیں رہتا بلکہ اظہار کے عمل میں براہِ راست شریک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ٹوئٹر پر مختصر بیانات، انسٹاگرام پر تصویری اور علامتی اظہار، اور یوٹیوب پر ویڈیو مواد نے ادب اور اظہار کے دائرے کو وسعت دی ہے اور اسے نئی معنوی صورتوں سے ہم کنار کیا ہے۔ سوشل میڈیا کے یہ ذرائع ادبی اظہار کو روایتی حدود سے نکال کر ایک ایسے عوامی اور اشتراکی ماحول میں لے آئے ہیں جہاں تخلیق، تنقید اور ردِعمل بیک وقت وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ اس تناظر میں سوشل میڈیا نہ صرف اظہار کا متبادل ذریعہ بن کر سامنے آیا ہے بلکہ اس نے ادبی ترسیل اور قاری کے طرزِ فکر و عمل کو بھی متاثر کیا ہے۔

سوشل میڈیائی اظہار کی ایک نمایاں جہت وہ نیا تعلق ہے جو مصنف اور قاری کے درمیان قائم ہوا ہے۔ روایتی ادبی نظام میں مصنف کی تحریر قاری تک عموماً تاخیر سے پہنچتی تھی اور اس پر قاری کا ردِعمل محدود یا رسمی نوعیت کا ہوتا تھا، تاہم ڈیجیٹل اور سوشل میڈیائی فضا میں ایک ایسا تخلیقی اور تنقیدی مکالمہ وجود میں آ چکا ہے جس میں قاری کی رائے، تنقید، سوال اور اشتراک فوری طور پر ممکن ہو گئے ہیں۔ اس باہمی تعامل نے جہاں مصنف کی فکری اور جمالیاتی حساسیت کو مزید بیدار کیا ہے، وہیں قاری کو بھی ایک باخبر اور فعال شریک کی حیثیت عطا کی ہے۔ یہ نئی اظہاری صورتیں، خواہ وہ ڈیجیٹل ہوں یا سوشل میڈیا سے وابستہ، محض تکنیکی سہولتوں کا اظہار نہیں بلکہ ان نئے فکری رجحانات کی غماز ہیں جو ادب کی زبان، موضوعات، ہیئت اور قاری کے تصور کو ازسرِ نو تشکیل دے رہے ہیں۔ ان رجحانات کا بامعنی اور تنقیدی مطالعہ اسی صورت ممکن ہے جب ان کے پس منظر میں کارفرما سماجی، ثقافتی اور نظریاتی عوامل کو سنجیدگی اور گہرائی کے ساتھ پرکھا جائے۔ اس تناظر میں مجنوں گورکھپوری کا یہ تصورِ ادب نہایت بصیرت افروز ہے، جو عصری ادب کے لیے ایک فکری رہنما اصول فراہم کرتا ہے:

"کامیاب ترین ادب وہ ہے جو حال کا آئینہ اور مستقبل کا اشاریہ ہو۔ جس میں واقعیت اور تحلیلیت، افادیت اور جمالیت ہم آہنگ ہو کر ظاہر ہوں، جس میں اجتماعیت اور انفرادیت دونوں مل کر ایک مزاج بن جائیں، جو ہمارے ذوقِ حسن اور ذوقِ عمل دونوں کو ایک ساتھ آسودہ کر سکے۔ اب تک ادب جو کچھ بھی رہا ہو، لیکن اب اس کو یہی ہونا ہے۔"

(مجنوں گورکھپوری، ادب اور زندگی، ص 68)

ہر وہ ادبی رجحان جو روایت کی حدود سے نکل کر نئی سمت اختیار کرتا ہے، اپنے ساتھ محض امکانات ہی نہیں لاتا بلکہ متعدد تنقیدی سوالات کو بھی جنم دیتا ہے۔ ڈیجیٹل اور سوشل میڈیائی اردو ادب کو بھی اسی تناظر میں پرکھنے کی ضرورت ہے۔ ایک طرف یہ ادب نئی تخلیقی جہتوں، اظہار کی متنوع صورتوں اور فکری شرکت کے نسبتاً جمہوری امکانات کو فروغ دیتا ہے، تو دوسری طرف اس کی نوعیت، پائیداری، فکری گہرائی اور ادبی معیار کے حوالے سے سنجیدہ سوالات بھی سامنے آتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں سوشل اور ڈیجیٹل ادب کو محض تحسین یا محض تنقید کے ایک ہی زاویے سے دیکھنا اس کے فطری ارتقا کو محدود کرنے کے مترادف ہوگا۔ تنقیدی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو پہلا بنیادی سوال یہی ابھرتا ہے کہ کیا یہ ادب اپنی ساخت اور مواد میں مستقبل کا اشاریہ ہو۔ جس میں واقعیت اور تحلیلیت، افادیت اور جمالیت ہم آہنگ ہو کر ظاہر ہوں، جس میں اجتماعیت اور انفرادیت دونوں مل کر ایک مزاج بن جائیں، جو ہمارے ذوقِ حسن اور ذوقِ عمل دونوں کو ایک ساتھ آسودہ کر سکے۔ اب تک ادب جو کچھ بھی رہا ہو، لیکن اب اس کو یہی ہونا ہے۔"

(مجنوں گورکھپوری، ادب اور زندگی، ص 68)

ہر وہ ادبی رجحان جو روایت کی حدود سے نکل کر نئی سمت اختیار کرتا ہے، اپنے ساتھ محض امکانات ہی نہیں لاتا بلکہ متعدد تنقیدی سوالات کو بھی جنم دیتا ہے۔ ڈیجیٹل اور سوشل میڈیائی اردو ادب کو بھی اسی تناظر

کامیاب ترین ادب وہ ہے جو حال کا آئینہ اور مستقبل کا اشاریہ ہو۔ جس میں واقعیت اور تحلیلیت، افادیت اور جمالیت ہم آہنگ ہو کر ظاہر ہوں، جس میں اجتماعیت اور انفرادیت دونوں مل کر ایک مزاج بن جائیں، جو ہمارے ذوقِ حسن اور ذوقِ عمل دونوں کو ایک ساتھ آسودہ کر سکے۔ اب تک ادب جو کچھ بھی رہا ہو، لیکن اب اس کو یہی ہونا ہے۔

میں پرکھنے کی ضرورت ہے۔ ایک طرف یہ ادب نئی تخلیقی جہتوں، اظہار کی متنوع صورتوں اور فکری شرکت کے نسبتاً جمہوری امکانات کو فروغ دیتا ہے، تو دوسری طرف اس کی نوعیت، پائیداری، فکری گہرائی اور ادبی معیار کے حوالے سے سنجیدہ سوالات بھی سامنے آتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں سوشل اور ڈیجیٹل ادب کو محض تحسین یا محض تنقید کے ایک ہی زاویے سے دیکھنا اس کے فطری ارتقا کو محدود کرنے کے مترادف ہوگا۔ تنقیدی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو پہلا بنیادی سوال یہی ابھرتا ہے کہ کیا یہ ادب اپنی ساخت اور مواد میں وہ فکری گہرائی اور جمالیاتی پختگی رکھتا ہے جو کسی ادبی متن کو "ادبِ عالیہ" کے درجے تک لے جا سکتی ہے؟ یا یہ محض وقتی ردِعمل، ذاتی تجربے یا تاثراتی بیانیے کی شکل ہے جس کی عمر محدود اور دائرہ اثر غیر مستحکم ہے؟ ان سوالات کا جواب تلاش کرنے کے لیے ہمیں اس نئے ادب کی بین السطور معنویت، اسلوب کی جدت، فکری تسلسل اور تنقیدی امکانات کا تفصیل سے جائزہ لینا ہوگا۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ ڈیجیٹل ادب نے ادب اور زندگی کے فاصلے کو کم کیا ہے۔ ادب براہِ راست زندگی کے تجربات سے مکالمہ کرتا ہے؛ اس میں نہ تو روایتی لسانی آرائش کی کثرت ملتی ہے اور نہ ہی پیچیدہ علامتی نظام کی تشکیل، تاہم اس کے باوجود یہ فوری تاثر، انسانی تجربے کی شدت اور ایک طرح کی اخلاقی صداقت اپنے اندر سموئے ہوتا ہے۔ اسی بنا پر بعض ناقدین اسے ادب کے ایک "جمہوری مرحلے" سے تعبیر کرتے ہیں، جہاں ادیب، قاری اور ناقد کے درمیان روایتی حد بندیاں کمزور پڑ جاتی ہیں اور تینوں ایک مشترک مکالماتی دائرے میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ مکالمہ بعض اوقات فکری ابہام، سطحیت یا جذباتی شدت کا شکار بھی ہو جاتا ہے، لیکن اس میں شامل زندگی کی حرارت اور عصری شعور اکثر ان کمزوریوں پر غالب آ جاتا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اس نقطۂ نظر کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"جہاں بعض لوگ بعض رجحانات یا نظریات کا بت بنا لیتے ہیں یا ان سے اس حد تک وابستہ ہو جاتے ہیں کہ ان خیالات کو دنیا کی آخری سچائی سمجھ لیتے ہیں، وہاں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو عمروں کے فرق کے باوجود اپنی کشادہ نظری کی بدولت سچ کی جستجو میں نہ صرف نئے کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں بلکہ خود بھی بدلتے ہیں اور نئے کی افہام و تفہیم میں بھی حصہ لیتے ہیں۔ گویا زمانی بعد فقط زمانی ہی نہیں ہوتا یہ ذہنی بھی ہوتا ہے۔"

(گوپی چند نارنگ، ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، ص 41)

یہ عمل محض تبادلہ خیال تک محدود نہیں۔ نوجوان نسل خاص طور پر وہ جو رسمی تعلیم کے دائرے میں محصور ہے، ان تحریروں اور مباحث سے غیر محسوس انداز میں علمی و فکری تربیت حاصل کر رہی ہے۔ وہ ادب کے صرف نصابی تصورات تک محدود نہیں رہتی بلکہ اردو ادب کے معاصر رجحانات، عالمی فکری مباحث اور

تنقیدی رویوں سے آگاہ ہوتی ہے۔ اس طرح سوشل میڈیا ادبی شعور کو ایک جمہوری اور غیر رسمی میدان میں وسعت دے رہا ہے، جہاں سیکھنے کا عمل مسلسل، باہمی اور زندہ ہے۔ یہ تمام مثالیں اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ اردو ادب محض طباعت اور اشاعت کے ذریعے نہ سیکھا جا رہا ہے، نہ پڑھا جا رہا ہے بلکہ ایک نیا ادبی کلچر تشکیل پا رہا ہے جو تحریر، قاری، ردعمل اور مکالمے کے باہمی تعامل پر استوار ہے۔ اور یہی وہ عنصر ہے جو اس ادبی رجحان کو صرف وقتی مظہر نہیں بلکہ مستقل تبدیلی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اس تحقیقی مطالعے سے یہ حقیقت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے کہ اردو ادب، جو ایک طویل عرصے تک مکتوب روایت، اشاعتی ذرائع اور ادارہ جاتی دائرۂ کار تک محدود رہا، اب ڈیجیٹل اور سوشل میڈیائی فضا میں ایک نئی فکری، فنی اور اظہاری وسعت کے ساتھ متحرک ہو چکا ہے۔ اس تبدیلی کے اثرات محض تکنیکی سطح یا اظہار کی ہیئت تک محدود نہیں بلکہ ادب کے فکری خدوخال، اس کی سماجی معنویت، قاری کی فعال شمولیت اور تنقیدی رویّوں تک پھیل چکے ہیں۔ ڈیجیٹل ادب جس میں آن لائن رسائل، برقی کتب، تحقیقی مقالہ جات اور علمی تصانیف شامل ہیں اردو ادب کو عالمی سطح پر زیادہ قابلِ رسائی اور بین المتنی بنا دیا ہے۔ اس عمل کے ذریعے نہ صرف علم کی روایتی مرکزیت کو چیلنج کیا گیا ہے بلکہ نو آموز محققین، مصنفین اور قارئین کے لیے سیکھنے، اظہار اور شرکت کے نئے امکانات بھی پیدا ہوئے ہیں۔ اسی طرح سوشل میڈیائی اظہار، بالخصوص فیس بک، انسٹاگرام، یوٹیوب اور دیگر ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کے ذریعے، ادبی اظہارات کو نئی زبان، نئی ساخت اور وسیع تر دائرۂ اثر کے ساتھ متعارف کرا رہا ہے۔ ان اظہاری صورتوں میں جہاں فرد کے احساسات، تجربات اور فکری میلانات کی ترجمانی ہوتی ہے، وہیں یہ اجتماعی شعور، ماحولیاتی آگہی اور سماجی ناہمواریوں کے خلاف فکری مزاحمت کی صورت بھی اختیار کرتی جا رہی ہیں۔

اس ڈیجیٹل کینوس نے نہ صرف اردو زبان اور ادب کی ترویج کو نئی مہمیز عطا کی ہے بلکہ مصنوعی ذہانت (Artificial Intelligence) جیسی جدید ٹیکنالوجیوں نے تخلیقی عمل کے فکری امکانات کو بھی ازسرِ نو متعین کیا ہے۔ ڈیجیٹل پلیٹ فارمز پر اردو متون کی تیاری، تدوین اور اشاعت میں جو سہولت اور سرعت پیدا ہوئی ہے، اس نے زبان کی رسائی کو عالمی سطح پر ممکن بنایا ہے۔ مزید برآں، مصنوعی ذہانت پر مبنی ٹولز نے متن کی درجہ بندی، لسانی تجزیے، اسلوبیاتی مطالعے اور حتیٰ کہ ابتدائی تخلیقی معاونت کے مراحل میں نئی جہات متعارف کرائی ہیں۔ اگرچہ مصنوعی ذہانت انسانی تخلیقی وجدان کا متبادل نہیں بن سکتی، تاہم یہ تخلیقی عمل کے ایک معاون وسیلے کے طور پر اردو ادب کے مطالعے اور فروغ میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ اس تناظر میں یہ کہنا بجا ہوگا کہ ڈیجیٹل عہد میں اردو ادب محض ایک روایتی ادبی سرگرمی نہیں رہا بلکہ ایک کثیر الجہتی فکری مظہر بن چکا ہے، جہاں انسان اور مشین کے باہمی تعامل سے نئے ادبی تجربات اور تنقیدی امکانات جنم لے رہے ہیں۔ یہی صورتِ حال اردو ادب کے مستقبل کے فکری خدوخال کی تشکیل میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مصنوعی ذہانت انسانی تخلیقی وجدان، تجربے اور جمالیاتی شعور کا متبادل نہیں بن سکتی۔ ادبی تخلیق کا اصل سرچشمہ انسانی احساس، شعوری عمل اور سماجی تجربہ ہی ہے۔ اس کے باوجود مصنوعی ذہانت کو تخلیقی عمل کے ایک معاون وسیلے کے طور پر دیکھا جانا چاہیے، جو اردو ادب کے مطالعے، تحقیق اور فروغ میں مثبت کردار ادا کر رہی ہے۔

اس تناظر میں یہ کہنا بجا ہوگا کہ ڈیجیٹل عہد میں اردو ادب محض ایک روایتی ادبی سرگرمی نہیں رہا بلکہ ایک کثیر الجہتی فکری مظہر کی صورت اختیار کر چکا ہے، جہاں انسان اور مشین کے باہمی تعامل سے نئے ادبی تجربات، تخلیقی امکانات اور تنقیدی مباحث جنم لے رہے ہیں۔ یہی تبدیلی اردو ادب کے مستقبل کے فکری خدوخال کی تشکیل میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے اور آئندہ ادبی مطالعات کے لیے ایک نئے نظریاتی فریم کی ضرورت کو بھی واضح کرتی ہے۔ آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈیجیٹل اور سوشل میڈیا نے اردو ادب کے فکری، تخلیقی اور تنقیدی منظرنامے کو یکسر تبدیل کر دیا ہے۔ ڈیجیٹل پلیٹ فارمز نے جہاں اردو متون کی تیاری، تدوین، اشاعت اور عالمی ترسیل کو سہل اور تیز بنایا ہے، وہیں سوشل میڈیا نے ادبی اظہار کو براہِ راست، مکالماتی اور سماجی طور پر زیادہ فعال صورت عطا کی ہے۔ ان دونوں ذرائع کے امتزاج نے اردو ادب کو محض روایتی ادارتی اور اشاعتی حدود سے نکال کر ایک ایسے متحرک اور جمہوری میدان میں لا کھڑا کیا ہے جہاں قاری، مصنف اور ناقد کے درمیان فاصلے کم ہو گئے ہیں اور ادبی عمل باہمی تعامل کی بنیاد پر آگے بڑھ رہا ہے۔

مزید برآں، ڈیجیٹل ٹیکنالوجی اور مصنوعی ذہانت جیسے جدید ذرائع نے ادبی تخلیق اور تحقیق کے فکری امکانات کو وسعت دی ہے، جبکہ سوشل میڈیا نے ادب کو زندگی کے فوری تجربات، سماجی مسائل اور اجتماعی شعور سے جوڑ دیا ہے۔ اس طرح اردو ادب نہ صرف اظہار کی نئی صورتوں سے ہم کنار ہو رہا ہے بلکہ فکری سطح پر بھی ایک ایسی تبدیلی سے گزر رہا ہے جو وقتی مظہر نہیں بلکہ ایک دیرپا اور ہمہ گیر ارتقا کی نشاندہی کرتی ہے۔ یہی ارتقائی عمل اردو ادب کے مستقبل کی سمتوں کے تعین میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور آئندہ تحقیقی و تنقیدی مطالعات کے لیے نئے سوالات اور امکانات کو جنم دیتا ہے۔

■

Abdur Razzaue
Research Scholar
Dept. of Urdu,
Delhi University, Delhi-110007

ادب اطفال میں سوشل میڈیا کے اثرات

کلدیپ راج آنند

انسانی تاریخ میں ابلاغ ہمیشہ سے تمدن کی بنیاد رہا ہے۔ابتدا میں انسان نے غاروں کی دیواروں پر تصویری نشان بنائے، پھر خط و کتابت، اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے معلومات کا تبادلہ ہونے لگا،البتہ جب انٹرنیٹ وجود میں آیا تو ابلاغ کے ذرائع میں انقلاب آ گیا،اسی انقلاب کی ایک بڑی پیداوار سوشل میڈیا ہے۔ادب اطفال ہمیشہ سے ہی بچوں کی کردار سازی،اخلاقی تربیت،تخیل کی پرورش اور لسانی ترقی کا ذریعہ رہا ہے۔لیکن اکیسویں صدی میں ڈیجیٹل دور اور خصوصاً سوشل میڈیا کے ظہور نے بچوں کے مطالعے،سوچ اور تخلیقی ذوق پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ادب اطفال نے ٹیکنالوجی کے ساتھ نئے امکانات پیدا کیے ہیں سوشل میڈیا نے ادب کو ہر بچہ کے ہاتھ تک پہنچا دیا ہے البتہ اس کے ساتھ اخلاقی اور تعلیمی ذمہ داری بھی بڑھ گئی ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ سوشل میڈیا نے بچوں کے ادب کو عالمی سطح پر روشناس کرانے میں اہم رول ادا کیا ہے اب کوئی بھی بچہ چاہے وہ کسی دور دراز علاقے میں ہو،انٹرنیٹ کے ذریعے کہانیاں،نظمیں اور تعلیمی مواد بآسانی سن یا پڑھ سکتا ہے۔جیسا کہ ڈاکٹر رؤف پاریکھ لکھتے ہیں:

''سوشل میڈیا نے ادب اطفال کو پرنٹ سے نکال کر ڈیجیٹل دنیا میں زندہ کر دیا ہے،اب کہانی ہر بچے کے ہاتھ میں موبائل کی صورت میں ہے۔سوشل میڈیا نے بچوں کو پڑھنے کے بجائے صرف دیکھنے اور سننے کا عادی بنا دیا ہے۔یہ تخلیقی سوچ کے لیے نقصان دہ رجحان ہے۔''

(ڈاکٹر رؤف پاریکھ،مضمون''اردو ادب اطفال کی تشکیل وارتقا'')

ادب اطفال اردو ادب کی وہ شاخ ہے جو بچوں کی ذہنی سطح،دلچسپی اور فطری پن کو مرکز میں رکھتی ہے۔ اس کا مقصد صرف تفریح طبع نہیں بلکہ اخلاقی تربیت، تخلیقی صلاحیت کی پرورش اور سماجی شعور کی بیداری ہے۔

اردو میں ادب اطفال با قاعدہ ایک صنف کے طور پر انیسویں صدی میں سامنے آیا لیکن بچوں کے لیے اخلاقی و نصیحت آموز حکایات کا رواج دینی و اخلاقی ادب میں پہلے سے موجود تھا۔ ابتدائی دور میں بچوں کے لیے الگ سے ادب تخلیق نہیں کیا جاتا تھا تاہم کہانیاں،لوک حکایات اور مذہبی قصے بچوں کو سنانے کی روایت عام تھی۔ مثلاً فارسی و عربی کی کتابیں،گلستاں، بوستاں کلیلہ و دمنہ اور طوطا کہانی اردو میں ادب اطفال کی بنیادیں قرار دی جا سکتی ہیں۔

ادب اطفال کو کسی بھی معاشرے کے فکری اور تہذیبی شعور کا پیمانہ کہا جا سکتا ہے، کیونکہ بچے ہی وہ بنیاد ہیں جن پر قوم کا مستقبل قائم ہوتا ہے۔وہ تمام تحریری یا تخلیقی مواد، جو بچوں کے ذہنی،اخلاقی اور جذباتی معیار کے مطابق ہوں اس میں کہانیاں، نظمیں، ڈرامے،کارٹون کہانیاں،مزاحیہ ادب اور معلوماتی تحریریں شامل ہیں۔

اردو میں ادب اطفال با قاعدہ ایک صنف کے طور پر انیسویں صدی میں سامنے آیا لیکن بچوں کے لیے اخلاقی و نصیحت آموز حکایات کا رواج دینی و اخلاقی ادب میں پہلے سے موجود تھا۔ ابتدائی دور میں بچوں کے لیے الگ سے ادب تخلیق نہیں کیا جاتا تھا تاہم کہانیاں،لوک حکایات اور مذہبی قصے بچوں کو سنانے کی روایت عام تھی۔ مثلاً فارسی و عربی کی کتابیں،گلستاں، بوستاں کلیلہ و دمنہ اور طوطا کہانی اردو میں ادب اطفال کی بنیادیں قرار دی جا سکتی ہیں۔ ان کہانیوں میں اخلاقی سبق، نیکی کی جیت، بدی کی سزا اور جادوئی عناصر عام تھے جو بچوں کی تخیل آفرینی میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد،محمد ہادی رسوا نے بچوں کے لیے تحریریں لکھیں، ڈپٹی نذیر احمد کے ''مرآۃ العروس'' اور''توبۃ النصوح'' نے بچوں اور نوجوانوں میں اخلاقی شعور پیدا کیا، پیام تعلیم 1912، ماہنامہ تعلیم و تربیت اور خاتون جیسے رسائل نے بچوں کے لیے تحریری ادب کو مقبول بنایا۔بچوں کے ادب کے حوالے سے اسماعیل میرٹھی، حالی، حفیظ جالندھری،

شوکت صدیقی، فہمیدہ ریاض، ممتاز مفتی اور اشرف صبوحی جیسے مصنفین نے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ سرسید احمد خان کی تعلیمی تحریک اور محمد حسین آزاد کی تحریریں اس سلسلے کی پہلی شعوری کوشش تسلیم کی جاسکتی ہیں۔

اکیسویں صدی کا بچہ اب روایتی کتاب یا کہانی کے بجائے موبائل، ٹیبلیٹ یو ٹیوب یا ٹک ٹاک سے جڑا ہوا ہے۔ سوشل میڈیا نے جہاں معلومات تک رسائی کو آسان تر بنادیا ہے، وہیں اس نے بچوں کے مطالعے، زبان، تخیل اور سماجی رویوں پر کئی منفی اور نفسیاتی اثرات بھی مرتب کیے ہیں۔ دنیا اس وقت تیزی سے ڈیجیٹل دور میں داخل ہوچکی ہے۔ انسان کی روزمرہ کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں بچا جو سوشل میڈیا کے اثر سے آزاد ہو۔ ایسے میں جب ہر عمر کے افراد سوشل میڈیا سے متاثر ہورہے ہیں تو بچے بھی اس سے کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں؟

ادب اطفال جو بچوں کی ذہنی، اخلاقی اور جمالیاتی تربیت کا وسیلہ ہے، اب نئے دور میں ہم دیکھیں گے کہ سوشل میڈیا نے ادب اطفال کی پر کیا اثرات ڈالے ہیں اس کے مثبت و منفی پہلو کیا ہیں اور آئندہ کے لیے کیا امکانات موجود ہیں۔ سوشل میڈیا ڈیجیٹل دنیا کا ایک ایسا پلٹ فارم ہے جو لوگوں کو نہ صرف معلومات فراہم کرتا ہے بلکہ اظہار خیال، تخلیق اور رابطے کا موقع بھی دیتا ہے۔ فیس بک، یوٹیوب، انسٹاگرام وغیرہ آج ذرائع ابلاغ کا نیا چہرہ بن چکے ہیں۔ بچے کتابوں میں تحریری کہانیوں سے لطف اندوز ہوتے تھے لیکن اب وہ کہانی دیکھنا پسند کرتے ہیں پڑھنا نہیں۔ ویڈیوز، تصویری کہانیاں اور اینیمیٹڈ نظموں نے ان کی توجہ کے انداز کو محدود کردیا ہے۔ مطالعہ کا رجحان کم ہوا ہے لیکن بصری تخیل میں اضافہ ہوا۔ یوں کہا جاسکتا ہے سوشل میڈیا نے بچوں کے سیکھنے کے طریقے کو بدل دیا ہے۔ صورتحال اب یہ ہے کہ ادب صرف قلم سے نہیں بلکہ ڈیجیٹل آلات سے بھی تخلیق کیا جارہا ہے۔ بچوں کے لیے کہانیاں ویڈیوز، پوڈکاسٹ بکس، کھیل اور موبائل ایپس کی صورت میں تیار ہورہی ہیں۔ مثلاً urdu studio یا urdu toon kids جیسے چیلنجز ادب اطفال کو دلچسپ انداز میں پیش کررہے ہیں غرض کہ سوشل میڈیا نے ادب اطفال کو بین الاقوامی سطح تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

منفی اثرات: میرے تجزیے کے مطابق سوشل میڈیا نے ادب اطفال میں جہاں خوشگوار اثرات چھوڑے ہیں وہی اس کے منفی اثرات بھی موجود ہیں، ظاہر ہے اس رائے سے ہر کوئی متفق نہ ہوگا۔ البتہ اس نے مطالعے، زبان و بیان، اخلاق، نفسیاتی و سماجی غرض ان سبھی سطحوں پر اثر تو ڈالا ہی ہے۔ بچوں کو تصویری مواد اور ویڈیوز پر مبنی مواد کا عادی بنادیا ہے۔ کتاب پڑھنے کا ذوق جو ادب اطفال کا اہم حصہ ہے کم ہوتا جارہا ہے۔ نتیجہ یہ کہ ان کی کتب بینی کی عادت، تخیل کی صلاحیت اور زبان سے رشتہ جیسے عناصر معدوم ہوتے جارہے

> سوشل میڈیا نے ادب اطفال کے مواد کی رسائی کو عوامی ضرور بنا دیا ہے البتہ اس کے ساتھ ادبی معیار، مطالعے کی سنجیدگی، تنقید کی گہرائی اور اخلاقی ذمہ داری کمزور ہوئی ہے، لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ سوشل میڈیا کو ادب کے فروغ کے مثبت پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کیا جائے گویا تحقیقی، معیاری اور ذمہ دارانہ طرز تحریر کو فروغ دے کر اس کے منفی اثرات کو کم کیا جاسکتا ہے۔

ہیں۔ سوشل میڈیا پر ہر شخص کو اپنی تحریر شائع کرنے کی آزادی حاصل ہے، اس آزادی نے اگرچہ اظہار خیال کو بڑھایا، تاہم اس نے معیار کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ غیر تربیت یافتہ اور کم علم افراد کی تحریریں بھی ادب اطفال کے طور پر پیش کی جاتی ہیں، جس سے ادبی ذوق اور تنقیدی معیار متاثر ہوتا ہے۔ ادب اطفال کی اصل روح یعنی زبان کی شائستگی اور سلیقہ متاثر ہورہا ہے جس میں غیر معیاری اور غیر اخلاقی مواد کی کثرت ہے۔ ظاہر ہے سوشل میڈیا پر موجود ہر مواد صرف غیر معیاری ہی نہیں ہوتا اس میں کچھ یقینی و اخلاقی بھی ہوسکتا ہے لیکن بچوں کو اس کی تمیز کیسے ہو کہ ہمارے لیے کیا مثبت ہے یا منفی۔ بچے سنجیدہ و مقصدی ادب کی شناخت نہیں کر پاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان میں تربیت، اخلاق یا کردار سازی کا پہلو نسبتاً کمزور ہے۔ اس سے گہرے مطالعے اور تجزیاتی سوچ کی صلاحیت کم ہوگئی ہے ادب اطفال کا وہ مقصد جو تخیل اور اخلاقی تربیت سے منسلک ہے، متاثر ہورہا ہے۔

سوشل میڈیا نے زبان کو غیر سنجیدہ اور غیر معیاری اس معنی میں بنا دیا ہے کہ چیٹ لنگویج، غلط املا، اور غیر ادبی اظہار عام ہوا ہے۔ بچے الفاظ کے صحیح تلفظ اور معنوں سے ناواقف ہوتے جارہے ہیں۔ اردو کی معیاری کتابوں اور رسائل کا مطالعہ کم ہورہا ہے۔ سوشل میڈیا کے اثرات میں سے ایک اہم سماجی و نفسیاتی اثر ہے۔ جس میں بچہ ذہنی دباؤ کا شکار ہوتا جارہا ہے مثلاً ''میرے کتنے فالوور ہیں؟''، ''کتنے لائکس آئے؟'' جیسے سوالات بچوں میں عدم اطمینان پیدا کرتے ہیں، ماہرین نفسیات کے مطابق، یہ رجحان جذباتی و نفسیاتی اضطراب، ڈپریشن اور ذہنی دباؤ کا سبب بنے ہوئے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ والدین کی عدم موجودگی یا بے توجہی ادب اطفال کی تربیتی اہمیت کو مزید کم کردیتی ہے ظاہر ہے بچے کی پیدائش سے لے کر سن بلوغ تک پرورش کی ذمہ داری والدین کی ہوتی ہے بچے کے لیے اس کی پہلی درس گاہ والدین ہی ہوتے ہیں۔ یہ ضروری ہے والدین انھیں صحیح رویے اور اخلاق و آداب سکھائے۔

سوشل میڈیا نے ادب اطفال کے مواد کی رسائی کو عوامی ضرور بنادیا ہے البتہ اس کے ساتھ ادبی معیار، مطالعے کی سنجیدگی، تنقید کی گہرائی اور اخلاقی ذمہ داری کمزور ہوئی ہے، لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ سوشل میڈیا کو ادب کے فروغ کے مثبت پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کیا جائے گویا تحقیقی، معیاری اور ذمہ دارانہ طرز تحریر کو فروغ دے کر اس کے منفی اثرات کو کم کیا جاسکتا ہے۔ سوشل میڈیا پر ادبی مواد کی فراوانی کے باوجود معیار میں گراوٹ آئی ہے۔ کوئی ادارتی نگرانی نہ ہونے کے سبب بچوں کے ذہن میں غیر معیاری ادب کی جگہ بن رہی ہے۔ روایتی فن پاروں میں

جمالیاتی حسن اور فکری ربط ہوتا تھا، جب کہ سوشل میڈیا کے اثر سے ادب اطفال میں یہ توازن بگڑ گیا۔

سوشل میڈیا نے جہاں ادب اطفال کے لیے نئے مواقع فراہم کیے وہیں اس نے کئی منفی رجحانات پیدا کیے۔ ایسے میں ان منفی رجحانات کو پوری طرح سے تو ختم نہیں کیا جا سکتا تاہم کم ضرور کیا جا سکتا ہے جس میں والدین اور اساتذہ کے لیے بچوں کی آن لائن سرگرمیوں پر نگرانی ضروری ہے مصنفین سوشل میڈیا پر معیاری و تعلیمی مواد فراہم کریں۔ ضروری ہے کہ بچوں کے لیے ڈیجیٹل ادب کو معیاری بنایا جائے حکومت و تعلیمی ادارے مل کر ادب اطفال کا ڈیجیٹل کتب خانہ قائم کریں، بچوں کو کتاب اور سوشل میڈیا دونوں کے توازن کے ساتھ استعمال کی تربیت دی جائے تبھی سوشل میڈیا کے منفی اثرات کم کیے جا سکتے ہیں اور ادب اطفال کا اصل مقصد ۔یعنی بچوں کی ذہنی و اخلاقی تربیت بحال کی جا سکتی ہے۔

مثبت اثرات: بچوں میں کتاب بینی کا رجحان تیزی سے کم ہوا ہے۔ غیر معیاری و غیر اخلاقی مواد کی آسان دستیابی اور حقیقی مطالعے کے بجائے تفریح پر مبنی دلچسپی کا فروغ ایسے عناصر ہیں جس نے منفی اثرات قائم کیے۔ باوجود ان خامیوں کے کچھ مثبت قدریں ہیں جن کا ذکر ضروری ہے، اب بچے دنیا کے کسی بھی کونے سے کہانیاں یا دوسرے مواد کو سن اور دیکھ سکتے ہیں آن لائن پلیٹ فارم کے ذریعے ادب اطفال کے مقابلے اور سرگرمیاں زیادہ عام ہوئیں۔ غرض ادب اطفال ہی نہیں اردو کے فروغ میں سوشل میڈیا نے ایک نئی روح پھونکی۔ سوشل میڈیا کے اس دور میں والدین و اساتذہ کی ذمہ داریاں دوہری ہوگئی ہیں بچوں کو معیاری اور آن لائن ادب فراہم کرنا، مطالعے کی عادت برقرار رکھنا، وقت کی حد مقرر کرنا وغیرہ۔

سوشل میڈیا نے ادیب شاعر اور قارئین کے مابین رکاوٹیں ختم کر دی ہیں، شائع ہونے کے لیے اخبارات یا مادی سرمائے کی ضرورت کم ہوئی ہے۔ بہت سی نایاب کتابیں/ نسخے ڈیجیٹل طور پر دستیاب ہوگئے ہیں۔ آن لائن میگزین اور بلاگز نے نئے لکھنے والوں کو پلیٹ فارم مہیا کیا ہے۔ سوشل میڈیا اور ڈیجیٹل پلیٹ فارمز نے ادبی مواد کی رسائی کو غیر معمولی طور پر بڑھایا، نایاب

اردو کہانیاں، نظموں اور بچوں کی کتب کو پی ڈی ایف ، ویڈیو یا سوشل میڈیا کے ذریعے گھر بیٹھے دستیاب کیا جا رہا ہے اس سے دور دراز کے علاقوں کے بچے بھی جدید مواد تک پہنچ رہے ہیں۔ سوشل میڈیا نے ابلاغ کا ایک نیا دور شروع کیا۔ 2010 کے بعد موبائل فون اور انٹرنیٹ کی فراہمی نے دنیا کے ہر طبقے کو ڈیجیٹل دنیا میں لا کھڑا کیا۔ اس تبدیلی نے ادب اطفال کو بھی متاثر کیا ہے۔ بچوں کے لیے ریختہ بک کارنر، taleemghar، اور urdu kids stories جیسے چیلنجز نے ادب اطفال کو ڈیجیٹل سطح پر متبول کیا ہے۔

عصر حاضر (یعنی اکیسویں صدی) میں ادب اطفال کے دائرے میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں بچوں کے لیے ادب صرف کتابوں تک محدود نہیں رہا، بلکہ مختلف ڈیجیٹل میڈیا فارمز، یوٹیوب چینل، اینی میشن اور سوشل میڈیا پلیٹ فارم پر بھی دستیاب ہے۔ ان تبدیلیوں نے جہاں ادب اطفال کے اثرات کو وسیع کیا ہے، وہیں کئی فکری و اخلاقی چیلنجز بھی پیدا کیے ہیں۔ جدید ادب اطفال میں ماحولیات، سائنسی ترقی، خواتین کا کردار اور عالمی امن جیسے موضوعات شامل کیے جا رہے ہیں۔

حاصل کلام: بچوں کا ادب اب سادہ، براہ راست اور دلچسپ انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ تاکہ بچے آسانی سے سمجھ سکیں جدید مصنفین جیسے منظر ایوبی، ناہید قریشی، اور شوکت صدیقی نے اس رجحان کو مستحکم کیا ہے۔ آج کا بچہ عالمی معلومات، مصنوعی ذہانت اور ڈیجیٹل

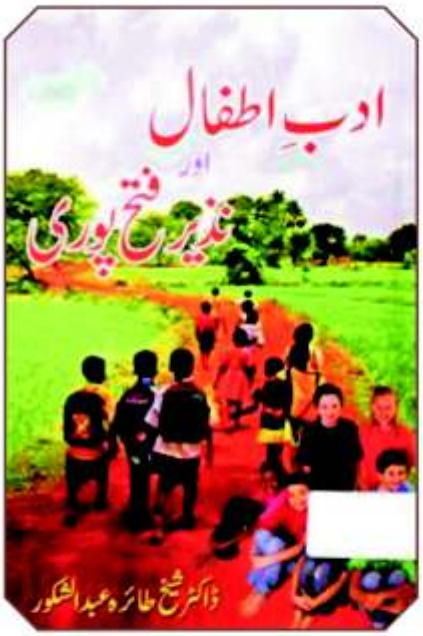

ماحول میں پروان چڑھ رہا ہے ایسے میں ادب اطفال کو صرف کہانیوں کا مجموعہ نہیں بلکہ کردار سازی، تنقیدی شعور اور اخلاقی رہنمائی کا ذریعہ بننا ہوگا۔ یہ ادب نئی نسل کو نہ صرف اردو زبان سے منسلک کرتا ہے بلکہ ثقافتی ورثے اور قومی تشخص کو بھی محفوظ رکھتا ہے۔ سوشل میڈیا نے ادب اطفال کی فکری گہرائی اور فنی پختگی دونوں کو متاثر کیا ہے۔ ظاہر ہے اب والدین، اساتذہ اور ادیب مل کر ایسا ماحول تیار کریں جہاں سوشل میڈیا کو بچوں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کے لیے تعمیری طور پر استعمال کیا جا سکے تاکہ ادب اطفال کی فکری جہتیں اور فنی خوبیاں برقرار رہ سکیں۔ ادب اطفال سے وابستہ ایسے ادیب و مفکرین جو اس ادبی ورثے کو جدید زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش میں منہمک ہیں ان میں سے بعض نے سوشل میڈیا، آن لائن پلیٹ فارمز یا ڈیجیٹل خواندگی کے تناظر میں بھی کام کیا ہے۔ اس ذیل میں ڈاکٹر خوشحال زیدی، حافظ کرناٹکی، مشرف علی فاروقی، صادقہ نواب سحر، خالد محمود، اور سراج عظیم کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہاں ادیب نہ صرف کتابی صورت میں بلکہ سوشل میڈیا، رسائل اور آن لائن پلیٹ فارمز کے ذریعے بھی بچوں کے ادب کو فروغ دے رہے ہیں۔

■

Kuldeep Raj Anand
Room No.147, Brahmputra Hostel
JNU, New Delhi
Mob.:8210715459
E-mail:akuldeep888@gmail.com

معاصر اردو غزل کی شعریات

ڈاکٹر لیاقت علی

انسان جب اپنے خارجی اور داخلی تجربات کو الفاظ کی گرفت میں لانے کی کوشش کرتا ہے، تو ایک نیا تخلیقی عمل جنم لیتا ہے جسے ہم ''شاعری'' یا پھر ''نثر'' کے نام سے جانتے ہیں۔ لیکن ہم یہاں چونکہ شاعری کے حوالے سے بات کریں گے تو ہمارے سامنے پہلا سوال یہ ابھر کر آتا ہے کہ شاعری دراصل ہے کیا؟ کیا یہ ایک شعوری فن ہے یا محض غیر شعوری جذبوں کا بے ساختہ اظہار ہے؟ اس کے جواب میں مختلف تنقیدی دبستانوں نے اپنی اپنی ترجیحات کو شامل کیا ہے، کسی نے اسے محض وجدان قرار دیا، تو کسی نے جمالیاتی حسن کی نمود۔ آسان زبان میں کہا جائے تو شاعری محض الفاظ کی بازیگری یا جذبات کا کھیل نہیں ہے بلکہ یہ انسانی وجود کے اُس لطیف پہلو کی ترجمان ہے جو محسوسات، مشاہدات اور تخیلات کے حسین امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔

پروفیسر کلیم الدین احمد کے مطابق:

''شاعری انسانی کامرانی کی معراج اور انسانی تہذیب وتمدن کے سر کا تاج ہے''

(اردو شاعری پر ایک نظر، از کلیم الدین احمد، مشمولہ، مغربی و مشرقی شعریات، از وہاب اشرفی، ص2010395)

امریکہ کے مشہور ماہر نفسیات پروفیسر جیمس نے ڈارون کے ایک بیان سے متاثر ہو کر کہا تھا کہ ''ہر شخص کو کم سے کم دس منٹ روز شعر و شاعری کے لیے وقف کر دینا چاہیے تاکہ جذبات مردہ نہ ہو پائیں''۔ فطرتاً انسان شاعری سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن بعض لوگ اس کو غیر سنجیدگی سے لیتے ہیں۔ مسعود حسن رضوی لکھتے ہیں:

''شاعری بے حس قوتوں کو چونکاتی ہے، سوتے احساس کو جگاتی ہے، مردہ جذبات کو جلاتی ہے، دلوں کو گرماتی ہے، حوصلوں کو بڑھاتی ہے، مصیبت میں تسکین دیتی ہے، مشکل میں استقلال دکھاتی ہے، بگڑے ہوئے اخلاق کو سنوارتی ہے اور گری ہوئی قوتوں کو اُبھارتی ہے۔''

(ہماری شاعری، از سید مسعود حسن رضوی ادیب، محمد جواد نظامی پریس وکنور یہ اسٹریٹ لکھنو، ص6-5)

دراصل انسانی جبلت میں تخلیق کی خواہش اور اظہار کی شدت ازل سے موجود ہے۔ یہی میلانات جب صورتِ کلام اختیار کرتے ہیں تو نثر بنتے ہیں، اور جب جذبہ، تخیل، تجربہ، مشاہدہ اور موسیقیت باہم مربوط ہو جائیں تو وہ شاعری میں ڈھلتے ہیں۔ تخیل وہ طاقت ہے جو معمولی کو غیر معمولی بنا دیتی ہے، اور مشاہدہ وہ آنکھ ہے جو کائنات کی جزئیات سے معنویت کشید کرتی ہے۔ تجربہ ان دونوں کے سنگم سے جنم لیتا ہے، اور یہی شاعری کی اصل متاع ہے۔ ادبیات میں فن پاروں کی درجہ بندی خواہ وہ نثر ہو یا نظم، ہیئت و موضوع، ساخت و تکنیک اور اظہار و اسلوب کی بنیاد پر کی جاتی ہے، جسے ادبی اصطلاح میں ''اصنافِ ادب'' کہا جاتا ہے۔ اس تناظر میں نثر کی متعدد صورتیں مثلاً داستان، ناول، افسانہ، انشائیہ، سفرنامہ، خاکہ، رپورتاژ وغیرہ اپنے ہیئتی و موضوعاتی امتیازات کے ساتھ الگ الگ اصناف میں شمار کی جاتی ہیں، جبکہ شاعری میں بھی اظہار کی مختلف صورتوں کو اصنافِ سخن کی حیثیت حاصل ہے۔ کلاسیکی اردو شاعری عمومی طور پر دو بڑے دائروں میں منقسم ہے: ایک ''نظم'' اور دوسری ''غزل''۔ اگرچہ ظاہراً یہ تفریق سادہ معلوم ہوتی ہے، لیکن جب ہم ان اصناف کی جزئیات اور ان کے لسانی، فکری اور ہیئتی تنوع میں داخل ہوتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ نظم اپنی موضوعاتی وسعت کے باعث بیشتر اصنافِ شعر کا احاطہ کرتی ہے، جبکہ غزل، اپنی مخصوص ہیئت کو تین صدیوں سے زیادہ عرصے سے قائم رکھے ہوئے ہے اور ''نیم وحشی صنفِ سخن'' کہلانے سے لے کر ''اردو شاعری کی آبرو'' تسلیم کیے جانے تک کا سفر طے کر چکی ہے۔ غزل کلاسیکی دور میں عشق مجازی و تصوف کے رمزیہ اسلوب میں نکھری، جدید دور میں فرد کے داخلی کرب اور سماجی ناہمواریوں کی آواز بنی اور معاصر دور میں سیاسی، معاشرتی اور وجودیاتی سوالات کے اظہار کا وسیلہ بن کر نئی لسانی و فکری جہتوں سے ہمکنار ہوئی ہے۔ غزل نے فکری سطح پر اگرچہ متعدد کروٹیں لی ہیں، تاہم ہیئتی اعتبار سے اس نے اپنی مخصوص ساخت کو برقرار رکھا ہے؛ اگرچہ وقتاً فوقتاً اس کی ساخت میں کچھ تجربے بھی کیے گئے، لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے اور جیسا کہ مظہر امام نے بجا طور پر کہا ہے: ''غزل ایک جامد صنفِ سخن ہے، اس کی ایک مخصوص اور متعین ہیئت ہے اور اس میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں۔'' اسی ہیئتی استحکام کے ساتھ غزل معاصر دور میں داخل ہوتی ہے جس کی افہام و تفہیم کے لیے شعریات کے نئے پیرائے وضع ہوتے نظر آتے ہیں۔ شعریات دراصل کسی بھی صنفِ سخن کی فنی، فکری، لسانی اور جمالیاتی ساخت کو سمجھنے کا نام ہے۔ یہ صرف اسلوب یا تکنیک کا مطالعہ نہیں کرتی بلکہ یہ تخلیق

کے محرکات، اسلوب کے رموز، زبان کی تشکیل، اور مفاہیم کی ترسیل و ابلاغ کو ایک کلی نظام میں دیکھنے کی کوشش ہے۔ ناقدین نے شعریات کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں اسے اخلاقی، اصلاحی، فکری اور تہذیبی بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کی۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی کتاب ''تنقیدی افکار'' میں 196 ایسے نکات درج کیے ہیں جن سے شعریات کے خدوخال واضح ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی کتاب ''شعر، غیر شعر اور نثر'' میں بھی شعریات کے کچھ مسائل وضاحت کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ شعریات محض فنی بحث نہیں بلکہ ایک ایسا نظام ہے جو ہمیں متن کے بطن میں داخل ہونے، اس کی تہوں کو سمجھنے، اور اس کے جمالیاتی و فکری نظام کو دریافت کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ غزل کی شعریات میں ربط، بندش، اسلوبِ بیان، تجانس، مناسبت اور نحوی صحت جیسے فنی عناصر اہم ہیں جو اس کے جمالیاتی نظام کی بنیاد ہیں۔ ہیئت، قافیہ و ردیف، بحور و اوزان، اور ایجاز و تمثیل جیسے عناصر اسی جمالیاتی نظام کے اجزا ہیں، جن کے بغیر کلاسیکی غزل کی روح مکمل نہیں ہو سکتی۔ معاصر اردو غزل کی شعریات بھی اسی تناظر میں ہمیں ایک ایسے نظام سے روشناس کراتی ہے جہاں روایت اور تجدید، ذاتی تجربہ اور اجتماعی شعور، زبان اور معنی، سب ایک ساتھ متحرک نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا محقق اور نقاد اس بات پر زور دیتا ہے کہ غزل کی شعریات محض بیانیہ اصولوں یا تکنیکی سانچوں کی فہرست نہیں بلکہ ایک مکمل فکری و تہذیبی نظام ہے، جس کے بغیر کسی بھی شعر کی قرأت ایک بے معنی عمل بن کر رہ جائے گی۔ شعریات کی تفہیم کے ضمن میں شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''شعریات صرف ان اصولوں کا نام نہیں جن کی روشنی میں ہم کسی تحریر کو فن پارہ قرار دیتے ہیں، اس کی صنف متعین کرتے اور اس کی اچھائی برائی کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ شعریات ان اصولوں کا بھی نام ہے جن کی روشنی میں کوئی تحریر بامعنی ہوتی ہے۔''

اگر ہم مختلف ادوار کی نمائندہ غزلوں کا مطالعہ نیز بین المتونی رشتوں کا تجزیہ کریں تو یہ حاصل ہوتا ہے کہ ہر دور میں غزل کی اندرونی ساخت و ہیئت کے اندر ایک نئی ساخت و ہیئت جنم لیتی رہی ہے۔ اس عمل کو ہم ساخت شکن، ساخت ساز یا پس ساختی تناظرات میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ولی دکنی، سراج اورنگ آبادی، میر، سودا، درد، غالب، ذوق، آتش اور مصحفی جیسے شعرا نے غزل کو کلاسیکی اسلوب، خیال آفرینی اور موضوعاتی گہرائی عطا کی۔ جدید غزل میں یگانہ، اقبال، جوش، شاد عظیم آبادی، جگر، اصغر گونڈوی، حسرت موہانی، جمیل مظہری، فیض، مجاز، جذبی، مجروح، اور مظہر امام جیسے شعرا نے نئے فکری و جمالیاتی زاویے متعارف کرائے۔ جبکہ معاصر غزل میں ناصر کاظمی، حسن نعیم،

معاصر غزل کی معنوی کروٹ کا ایک اور اہم موڑ مخدوم محی الدین اور جاں نثار اختر کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ یہ دونوں شعرا غزل کے ذریعے محض جذبات کا اظہار نہیں کرتے، بلکہ اسے اس مقام پر لے آتے ہیں جہاں غزل روایت سے بغاوت کرتے ہوئے بھی اس سے ایک رشتہ رکھتی ہے۔

منیر نیازی، شجاع خاور، ظفر اقبال، احمد مشتاق، سلطان اختر، خورشید اکبر، خلیل الرحمٰن اعظمی، شکیب جلالی، شہر یار، عرفان صدیقی، اسعد بدایونی، شہپر رسول، عالم خورشید، عبدالاحد ساز، فرحت احساس، رفیق راز، شفق سوپوری، مہتاب حیدر نقوی اور راشد انور راشد وغیرہ کے یہاں غزل کی ساخت میں نہ صرف زبان، اسلوب اور رویے کا تنوع ملتا ہے، بلکہ مضمون و معنی کے تخلیقی امکانات میں بھی وسعت نظر آتی ہے۔ معاصر اردو غزل کے شعریاتی تناظر میں نہ صرف اظہار کے نئے زاویے دریافت ہوئے ہیں بلکہ غزل نے اپنے قالب میں زندگی کے گوناگوں احساسات، تہذیبی کرب، سماجی و معاشرتی اضطراب اور باطنی کشمکش کو بھی جذب کیا ہے۔ ظفر اقبال کی غزل اس تبدیلی کی علامت ہے، جہاں زبان کے سانچے توڑے گئے، لفظیات کو نئے معنی پہنائے گئے اور خیال کو ایسی ندرت عطا کی گئی جو مروجہ جمالیات کو چیلنج کرتی نظر آتی ہے۔ ان کی غزل میں معنی کی کئی پرتیں ایک ساتھ کھلتی ہیں، اور قاری کو نہ صرف لغوی سطح پر بلکہ کیفیاتی سطح پر بھی ایک گہری خلش کا سامنا ہوتا ہے۔ شان الحق حقی کی شاعری اپنی تہذیبی سادگی کے باوجود ایک گہرے شعور کی نمائندہ ہے۔ ان کے ہاں فنی چابکدستی، اظہار کی پاکیزگی اور روایت کی بازیافت ایک ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہی وہ امتزاج ہے جو ان کے کلام کو نہایت پرکار مگر سہل ممتنع بناتا ہے۔ احمد شناس کی غزل ایک داخلی سفر کی روداد معلوم ہوتی ہے جہاں پنہائی، بیخودی اور سرشاری مل کر ایک نئی جمالیات کی تشکیل کرتی ہیں۔ ان کے اشعار قاری کو شعور و لاشعور کی سرحدوں پر لے جا کر سوالات کی دنیا میں داخل کرتے ہیں۔ سلیم کوثر اور محسن بھوپالی کی غزلوں میں جو حسیت ہے، وہ زمانے کے سفر کی غماز ہے۔ ان کے ہاں خارجی کائنات کے رنگ، ہجرت کے کرب، اور خوابوں کے شکستہ شیشے ایک ایسی کیفیت کو جنم دیتے ہیں جو فرد اور سماج کے بیچ ایک شفاف آئینہ رکھ دیتی ہے۔ ان کی غزل سفر کی روداد نہیں، بلکہ خود سفر بن جاتی ہے۔

معاصر غزل کی معنوی کروٹ کا ایک اور اہم موڑ مخدوم محی الدین اور جاں نثار اختر کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ یہ دونوں شعرا غزل کے ذریعے محض جذبات کا اظہار نہیں کرتے، بلکہ اسے اس مقام پر لے آتے ہیں جہاں غزل روایت سے بغاوت کرتے ہوئے بھی اس سے ایک رشتہ رکھتی ہے۔ ان کے لہجے میں جو تبدیلی ہے، وہ محض اسلوبیاتی نہیں بلکہ داخلی اور خارجی کشمکش کا اظہار ہے۔

ہم نے انسان کے دکھ درد کا حل ڈھونڈھ لیا
کیا برا ہے جو یہ افواہ اڑا دی جائے
(جاں نثار اختر)

زندگی موتیوں کی ڈھلکتی لڑی، زندگی رنگ گل کا بیان دوستو
گاہ روتی ہوئی، گاہ ہنستی ہوئی، میری آنکھیں ہیں فسانہ خواں دوستو
(مخدوم محی الدین)

یہ اشعار غزل کے بیانیے اور اس کے داخلی آہنگ کو ایک نئی سمت عطا کرتے ہیں۔ یہاں غزل صرف جذبے کا تخلیقی اظہار نہیں بلکہ ایک تاریخی مکالمہ معلوم ہوتی ہے۔

معاصر غزل میں جدید معاشرے کی نفسیات، یہی

اثرات زبان کی مقامیت اور نئی تہذیبی آمیزش کا بھی اظہار ملتا ہے۔ شہری معاشرہ جو کبھی جدیدیت، ترقی اور شہری اخلاقیات کے تناظر میں اپنی الگ شناخت رکھتی تھی، اب دیہی تجربات سے متاثر ہو کر ایک نئی لسانی و تہذیبی ہئیت اختیار کر رہی ہے۔ ہر نوکری پیشہ یا ترقی یافتہ دیہی فرد جب شہر کا رخ کرتا ہے، تو وہ اپنے ساتھ اپنے علاقے کی تہذیب، زبان، اور رویے بھی ساتھ لے جاتا ہے۔ جو بتدریج شہری ثقافت کا حصہ بن جاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ معاصر غزل میں مقامیت، دیہی زبان، محاوروں، لہجوں اور صوتیاتی اثرات کا بڑھتا ہوا رجحان دکھائی دیتا ہے۔ غزل کی زبان جو کبھی تہذیبی شائستگی، فکری بالیدگی اور جمالیاتی نرمی کی مظہر تھی، اب اس میں روزمرہ کی تلخی، تندی، بے باکی اور خودی کا اظہار نظر آتا ہے۔ نئی غزل نے محض لسانی تجربے کو نہیں اپنایا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ تہذیبی مظاہر، طبقاتی کشمکش اور تیز رفتار شہری زندگی کی ناہمواریوں کو بھی اپنے اظہار کا جزو بنا لیا ہے۔ بشیر بدر کا یہ شعر:

رات کا انتظار کون کرے
آج کل دن میں کیا نہیں ہوتا

(بشیر بدر)

شاعرانہ اعتبار سے سادہ، یہاں تک کہ عام فہم اور روایتی فصاحت سے عاری نظر آتا ہے، لیکن اس کے پس منظر میں ایک مکمل نئی تہذیبی نفسیات کارفرما ہے، جہاں دن رات کے مابین تفریق مٹ چکی ہے، اقدار کی تمیز ختم ہو چکی ہے، اور ایک ایسی زندگی معرض وجود میں آ چکی ہے جو لحہ بہ لحہ اپنی شدت کے ساتھ انسان کو گرفت میں لے رہی ہے۔ نشتر خانقاہی کے شعر:

دن نکلتا تھا کہ سارے شہر میں بھاگڑ پڑی
ان گنت خوابوں کے چہرے بھیڑ میں گم ہو گئے

(نشتر خانقاہی)

میں خواب اور بھیڑ جیسے دو متضاد استعارے ایک نئی شہری زندگی کا خاکہ پیش کرتے ہیں۔ جہاں خواب، جو کبھی فرد کی داخلی دنیا کی علامت تھے، اب بھیڑ میں گم ہو چکے ہیں۔ یہ شعر آج کے انسان کی بے سمتی اور خوابوں کے انحلال کی ایک پر اثر علامت ہے۔

معاصر اردو غزل میں ایک اور قابلِ غور پہلو تجربۂ ہجرت کا دل گرفتہ اظہار ہے۔ ہجرت، ترکِ وطن اور گھر کے اجڑ جانے کا المیہ اردو شاعری کی روایت میں کوئی نیا موضوع نہیں ہے۔ کلاسیکی شاعری میں یہ احساس کبھی جلاوطنی، کبھی محبوب سے فراق اور کبھی تہذیبی زوال کی صورت میں سامنے آتا رہا ہے، تاہم معاصر عہد میں اس موضوع نے ایسی نئی جہات اختیار کر لی ہیں جو اسے محض شخصی تجربے کے دائرے سے نکال کر ایک اجتماعی اور تہذیبی بیانیے میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ آج کی غزل میں ہجرت صرف جغرافیائی نقل مکانی کا نام نہیں رہی بلکہ یہ شناخت، تہذیب یادداشت اور داخلی بے چینی کے گہرے تجربے کی علامت بن چکی ہے۔ عصری زندگی میں بہتر مستقبل، معاشی استحکام اور معیارِ زندگی کو بہتر بنانے کی خواہش نے انسان کو مسلسل نقل مکانی پر مجبور کر دیا ہے۔ خصوصاً نوجوان نسل کے لیے بیرونِ وطن کے ترقی یافتہ معاشروں میں معاشی استحکام اور سماجی ارتقا کے امکانات ایک خواب ناک کشش کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ جو لوگ وہاں پہنچ جاتے ہیں وہ سماجی طور پر کامیاب سمجھے جاتے ہیں اور ان کی زندگی رشک کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے، لیکن معاصر غزل اس ظاہری کامیابی کے پسِ پردہ موجود داخلی کرب کو بے نقاب کرتی ہے۔ یہ وہ خلا ہے جو اپنی مٹی، اپنے موسموں، اپنی زبان، اپنی تہذیب اور رشتوں سے کٹ جانے کے بعد پیدا ہوتی ہے اور جسے محض معاشی آسودگی کبھی پُر نہیں کر سکتی۔ معاصر غزل کی شعریات میں اس تجربے کی پیش کش محض بیانیہ انداز میں نہیں بلکہ علامت، استعارے اور تہہ دار معنویت کے ساتھ ہوتی ہے۔ شاعر بے گھری کو براہِ راست موضوع بنانے کے بجائے روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی علامتوں کے ذریعے قاری کے دل میں اتارتا ہے۔ مثلاً آنگن، گلی، ہوا، اندھیرا، سورج، خیمہ اور سفر جیسے الفاظ محض اشیا نہیں رہتے بلکہ پورے تہذیبی تجربے کی نمائندگی کرنے لگتے ہیں۔ اشتیاق حسین کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

مرے بچوں کو بے آنگن گھروں میں چین ملتا ہے
کھلے دلان کی خواہش ہماری نسل ہی تک ہے

اس شعر کی شعریات پر غور کیا جائے تو یہاں آنگن ایک جگہ نہیں بلکہ مشرقی تہذیب، مشترکہ خاندانی نظام اور کھلے دلوں والی زندگی کی علامت ہے۔ شاعر ایک گہری تہذیبی شکست کا نوحہ لکھتا ہے کہ نئی نسل بے آنگن گھروں میں تو چین پا رہی ہے، مگر وہ اجتماعی خوشی، کھلے دلوں کی روایت اور تہذیبی وسعت اب صرف ایک نسل تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ شعر معاصر غزل میں تہذیبی انقطاع (Cultural Displacement) کی نہایت بلیغ مثال ہے۔ اسی طرح اشتیاق حسین کا دوسرا شعر دیکھیں:

بستیاں کرنے چلے ہیں نئی آباد مگر
سونی گلیوں کی ہوا خاک بسر آئے گی

غور سے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو نئی بستیاں ترقی اور جدیدیت کی علامت ہیں، جب کہ سونی گلیوں کی ہوا ماضی، یادداشت اور اجڑی ہوئی تہذیب کا استعارہ ہے۔ شاعر اس خوش فہمی کو رد کرتا ہے کہ نئی آبادیاں مکمل مسرت فراہم کر سکتی ہیں۔ تخلیقی اعتبار سے یہ شعر ماضی اور حال کے تصادم کو ایک گہری علامتی سطح پر پیش کرتا ہے۔

معاصر اردو غزل کو ایک دوسرے زاویے سے بھی دیکھا جا سکتا ہے اور وہ ہے صارفیت، معیشت اور فن کا تجارتی استعمال۔ یہ نئی دنیا، جس میں فکری و فنی قدریں غیر مرئی سرمایہ داری کی لپیٹ میں ہیں، وہاں شاعری کا منصب محض جمالیاتی یا داخلی کیفیات کا اظہار نہیں رہا بلکہ اب شاعر پر بھی وہی ''برانڈ'' بنانے کا دباؤ ہے جو کسی مارکیٹنگ ایجنسی کے پیشہ ورانہ تخلیق کار پر ہوتا

ہے۔موجودہ صادقی کلچر کی رو سے آج کے شاعر میں صرف تخیل، رمزیت یا تہذیبی شعور کا ہونا کافی نہیں، بلکہ اب اسے کاروباری شعور، سود و زیاں کا علم اور سامعین کو خوش رکھنے کے ہنر سے بھی لیس ہونا پڑ رہا ہے۔یعنی شاعری اب ''پروڈکٹ'' بنتی جارہی ہے جس کا مقصد ''کنزیومر'' یعنی قاری یا سامع کو متاثر کرنا ہے، انھیں محض مسرور کرنا نہیں بلکہ اپنے صارفی مقاصد کے تابع کرنا بھی ہے۔مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیے:

سب ملاقاتوں کا مقصد کاروبارِ زرگری
سب کی فطرت ایک جیسی، سب کی گھاتیں ایک سی

(منیر نیازی)

یہ شعر بڑی آساں مگر دلکش زبان میں انسانی رشتوں اور اخلاقی قدروں کے زوال، خود غرضی اور گہرے جزباتی ونفسیاتی بحران کی عکاسی کرتا ہے۔

معاصر اردو غزل میں انفرادی تجربے کو اجتماعی شعور میں ڈھال کر برتا گیا ہے جس میں ذاتی کرب کو تاریخ، تہذیب اور مزاحمت کے استعاروں سے جوڑ کر ایک وسیع تر معنوی دائرہ بنایا گیا ہے۔شعرا نے اپنے عہد کی المناکیوں کو کلاسیکی شعری روایت کے مستحکم استعاروں کے ذریعے معنی خیز بنایا ہے۔عرفان صدیقی کی شاعری میں ایسی بے شمار مثالیں مل جاتی ہیں جن میں آزادیِ ارادہ اور اخلاقی خود کفالت کا تصور نمایاں ہے۔''شمعِ خیمہ'' اور ''زنجیر'' جیسے الفاظ کا استعمال کر کے خانہ بدوشی اور جبر کے باہمی تصادم کو ظاہر کیا گیا ہے، جبکہ ''درد کی دولت'' کلاسیکی صوفیانہ تصورِ فقر و استغنا کی یاد دلاتی ہے۔عرفان خارجی نصرت کے بجائے داخلی کرب کو اصل سرمایہ قرار دیتے ہیں، جو میر اور غالب کی روایت سے گہری مطابقت رکھتا ہے، جہاں دکھ محض اذیت نہیں بلکہ شعور کی بالیدگی کا وسیلہ بنتا ہے۔افتخار عارف کی شاعری میں کلاسیکی اسلامی و تاریخی علامات دمشق، کوفہ، دشت، پیاس اور مشکیزہ نہایت بامعنی انداز میں برتی گئی ہیں۔یہ علامات کربلا کے اس بیانیے سے جڑی ہیں جو اردو شاعری میں ظلم و مزاحمت، حق و باطل اور قربانی کی ایک مستقل علامت رہا ہے۔مثلاً:

شمعِ خیمہ کوئی زنجیر نہیں ہم سفراں
جس کو جانا ہے چلا جائے اجازت کیسی

پست تہی میں دولتِ نصرت کہاں سے لائے
عرفان تم یہ درد کی دولت کہاں سے لائے

(عرفان صدیقی)

معاصر شعری رویے کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ان علامات کو ماضی کے ایک مقدس واقعے تک محدود نہیں رکھتا بلکہ انھیں حال کے سماجی، سیاسی اور وجودی تناظر میں منتقل کر دیتا ہے۔یہ شاعری مرثیے کی اس بنیادی شعریات سے ہم آہنگ دکھائی دیتی ہے جہاں دکھ محض جذباتی اظہار نہیں بلکہ اخلاقی موقف اور فکری استقامت کی علامت ہوتا ہے۔دشت اور تشنگی یہاں صرف جسمانی اذیت کی نشان دہی نہیں کرتیں بلکہ ایسے حالات کا استعارہ بن جاتی ہیں جن میں سچائی، انصاف اور انسانی وقار مستقل طور پر آزمائش میں رہتے ہیں۔اسی طرح پیادہ سفر خانہ بدوشی یا عارضی نقل مکانی کا محض منظر نامہ نہیں بلکہ ایک ایسے تاریخی تسلسل کی علامت ہے جس میں ظلم کے خلاف کھڑا ہونا ہمیشہ سہولت سے محرومی کے ساتھ جڑا رہا ہے۔کلاسیکی مرثیوں میں واقعہ کربلاکلیدی اورمرکزی حیثیت رکھتا ہے۔جبکہ معاصر شاعری میں یہ مرکزیت منتشر ہو جاتی ہے اور واقعہ کربلا ایک واحد مقام کے بجائے ایک مسلسل کیفیت میں ڈھل جاتا ہے۔یوں سانحہ کربلا ایک تمثیل بن کر ہر اُس سماج میں منتقل ہو جاتا ہے جہاں جبر، خاموشی اور مصلحت انسانی ضمیر کو محصور کر لیتی ہے۔یہ تبدیلی محض موضوعاتی نہیں بلکہ فنی سطح پر بھی معنی خیز ہے۔معاصر شاعر مرثیے کے جذباتی آہنگ کے بجائے ایک محتاط، کم گو اور علامتی لہجہ اختیار کرتا ہے جو قاری کو جذباتی ابال کے بجائے فکری شرکت کی دعوت دیتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس شاعری میں کرب اور مزاحمت کا اظہار نعرہ بننے کے بجائے سوال میں ڈھل جاتا ہے اور یہی سوال اسے محض مذہبی یا تاریخی شاعری کے خانے سے نکال کر جدید فکری تنقید کے دائرے میں داخل کر دیتا ہے۔مثلاً یہ شعر دیکھیں:

کہیں نہ آب نہ برگ و گیاہ دور تلک
یہ پا پیادہ سرِ دشتِ تشنگی کا سفر

(محسن زیدی)

اس علامتی اور اخلاقی شعری روایت کے تناظر میں اگر دیکھا جائے تو ایک طرف بعض شعرا نے کلاسیکی روایت، بالخصوص مرثیے کی شعریات کو عصری شعور کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے تو دوسری طرف نئی غزل کا ایک بڑا حصہ ایسی فضا میں بھی سانس لیتا نظر آتا ہے جو درباری اقدار اور تخلیقی سنجیدگی سے تو نکل آیا ہے، مگر مشاعراتی ماحول کے ایک نئے جبر میں گرفتار ہو گیا ہے۔اس ماحول میں داد طلبی، لفاظی اور فوری تاثر کی خواہش نے غزل کو گہرے فکری اور اخلاقی سوالات سے بڑی حد تک دور کر دیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ تصوف، جو کبھی اردو غزل کا بنیادی منبع اور اس کی فکری روح سمجھا جاتا تھا، رفتہ رفتہ عصری شعور سے کٹ کر خانقاہی تحفظات اور رسمی روحانیت تک محدود ہو گیا۔وہ عرفانی لہجہ جو کبھی انسان، کائنات اور وجود کے باطنی ربط کو شعری زبان میں ڈھالتا تھا، معاصر غزل میں یا تو معدوم ہوتا دکھائی دیتا ہے یا محض چند روایتی استعاروں اور علامتی پیکروں تک سمٹ کر رہ گیا ہے۔اس تناظر میں معاصر غزل کی ایک بڑی کمزوری یہی ہے کہ اس نے روحانی تجربے کو فکری سطح پر برتنے کے بجائے اسے جمالیاتی سجاوٹ میں بدل دیا ہے۔معاصر اردو غزل میں ایسے شعرا بھی موجود ہیں جنھوں نے روایت کی تقلید محض کے بجائے اس کے ساتھ تخلیقی مکالمہ قائم کیا ہے اور نئی شعریات کو فکری شناخت عطا کی ہے۔ان شعرا کے یہاں غزل نہ تو ماضی کی یادگار بن کر رہ جاتی ہے اور نہ ہی محض روایتی مشاعروں کا حصہ، بلکہ ایک ایسے ارتقائی نظام کی صورت اختیار کرتی ہے جہاں قدامت اور جدت ایک دوسرے سے ٹکراتے بھی ہیں اور ایک دوسرے کو معنی بھی عطا کرتے ہیں۔اسی لیے معاصر اردو غزل کے حوالے سے نہ کلی انحراف کی ضرورت ہے اور نہ اسے روایتی خوب صورتی کے گنبد میں قید کرنے کی۔یہ صنف اپنی فطرت میں زندہ اور تغیر و تبدیلی کے فطری نظام کی تاب ہے۔اس کی نبض میں نہ صرف اپنے عہد کی دھڑکن محفوظ ہے بلکہ اس میں آنے والے زمانے کے فکری امکانات کو محسوس کرنے اور ان کی پیش گوئی کرنے کی صلاحیت بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔یہی وصف معاصر اردو غزل کو محض ادبی اظہار کے بجائے ایک زندہ فکری بیانیہ عطا کرتا ہے۔

■

Dr. Liaqat Ali
Asst.Professor, Urdu
School of Humanities,
IGNOU, Maidan Garhi,
New Delhi-110068
Email: liaqatali@ignou.ac.in
M.No: +91-7051446156

افضل مصباحی

مثنویاتِ میر میں مشترکہ ہندوستانی تہذیب

مشترکہ ہندوستانی تہذیب سے مراد وہ تہذیب ہے جو مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان مشترک ہو۔ اسلامی تہذیب اور ہندو تہذیب کے اختلاط اور تاثیر و تاثر سے جو تہذیب معرض وجود میں آئی، وہ ہندوستانی مشترکہ تہذیب ہے۔ سب سے پہلی اور اہم چیز جس نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں ہم آہنگی کی فضا ہموار کی، وہ بھکتی اور تصوف کی تحریک تھی۔ مسلمان صوفیوں اور ہندو بھکتوں نے رواداری اور محبت کی جو روح پھونکی، اس سے جمالیاتی شعور میں تاثیر و تاثر کا ایک سلسلہ شروع ہوا، جسے اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کی شعوری کوششوں نے اور تیز کر دیا۔ چنانچہ مغل دربار کے مرکز سے ایک مشترکہ تہذیب کا دائرہ پھیلنا شروع ہو گیا، جس نے ہندوستان کے بہت بڑے حصے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اعلیٰ طبقوں کی زندگی اور ان کی رسوم و روایات پر اپنے غیر معمولی اثرات ڈالنے شروع کیے۔

یہاں یہ بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ مشترک تہذیب کی جڑیں ایک مشترک زبان میں پیوست ہوتی ہیں۔ پہلے فارسی مشترک ہندوستانی تہذیب کی زبان تھی، جس کی جگہ بعد میں اردو نے لی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کی تمام شعری و نثری اصناف میں مشترکہ ہندوستانی تہذیب کی بھرپور موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ مذہبی رواداری، عوامی رسوم و رواج، عشق اور انسان دوستی کی آفاقیت، میلوں ٹھیلوں کا کلچر، ہولی، دیوالی، بسنت، عید، محرم، دیر و حرم، درگاہوں، خانقاہوں، مقامی جانوروں، پرندوں، ندیوں، پہاڑوں، شہروں اور رسوم و روایات کے تذکرے، اردو کی شعری و نثری اصناف میں بھرپور انداز میں ہونے لگے۔ شادی بیاہ کی رسومات، مرد و خواتین کے ملبوسات، زیب و زینت کے ساز و سامان، آپسی بولی ٹھولی اور رقص و سرود کی محفلوں کو اردو شاعروں اور ادیبوں نے اپنی تخلیقات میں جگہ دی۔ میر تقی میر کی شاعری میں بھی مشترکہ تہذیب کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ میر کا جہان شاعری ایک سمندر کے مانند ہے، جس میں جس قدر غوطہ لگائیں، لعل و گہر کی حصولیابیوں کا امکان اسی قدر بڑھ جاتا ہے۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، نظم، مرثیہ، رباعی، شہر آشوب، واسوخت، ہجو، تضمین اور شکار نامہ وغیرہ اصناف میں میر نے طبع آزمائی کی ہے اور مجموعی طور پر 30 ہزار سے زائد اشعار تخلیق کیے ہیں۔ شاعرانہ عظمت کے پیش نظر ہی میر کو خدائے سخن کا لقب بھی ملا ہے۔ زیر نظر مقالے میں میر کی چند مثنویوں کو موضوع سخن بنایا گیا ہے اور ان میں ہندوستانی مشترکہ تہذیب کے عناصر کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مثنوی اردو کی ایک اہم صنف ہے، جس میں عشقیہ داستان، اخلاقی سبق اور معاشرتی عکاسی یکجا ہوتی ہے۔ مثنوی کے بارے میں حالی کا یہ قول انتہائی اہم ہے:

''مثنوی اصناف سخن میں سب سے زیادہ مفید اور بہ کار آمد صنف ہے، کیونکہ غزل اور قصیدہ میں اس وجہ سے کہ اول سے آخر تک ایک قافیہ کی پابندی ہوتی ہے۔ ہر قسم کے مضامین کی گنجائش نہیں ہو سکتی''.....

''الغرض جتنی صنفیں فارسی اور اردو شاعری میں متداول ہیں، ان میں سے کوئی صنف مسلسل مضامین بیان کرنے کے قابل مثنوی سے بہتر نہیں ہے۔ یہی وہ صنف ہے جس کی وجہ سے فارسی شاعری کو عرب کی شاعری پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ عرب کی شاعری میں مثنوی کا رواج نہ ہونے یا نہ ہو سکنے کے سبب تاریخ یا قصہ یا انحراف یا تصوف میں ظاہراً ایک کتاب بھی ایسی نہیں لکھی جا سکی جیسی فارسی میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں لکھی گئی ہیں۔ اسی لیے عرب 'شاہ نامہ' کو قرآن العجم کہتے ہیں اور اسی لیے مثنوی کی نسبت 'ہست قرآن در زبان پہلوی' کہا گیا ہے۔''1

اردو مثنوی کی روایت امیر خسرو سے لے کر ملا وجہی اور دیگر شعرا تک پھیلی ہوئی ہے، لیکن میر تقی میر نے اس صنف کو نہ صرف فنی بلندی عطا کی ہے بلکہ اسے برصغیر کی تہذیبی عکاسی کا وسیلہ بھی بنایا ہے۔ ان کی مثنویاں معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اس انداز میں پیش کرتی ہیں کہ ہندوستانی مشترکہ روایت کا بھرپور عکس ان میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ خود میر کا مزاج بھی ایک حساس فنکار کا تھا اور وہ مذہب کی بنیاد پر انسانوں میں تفریق کے قائل نہیں تھے۔ میر کی سرپرستی ہر مذہب کے امیروں اور راجاؤں نے کی ہے، اسی لیے اگر ایک نظم میر نے آصف الدولہ کی شادی پر کہی تو دوسری نظم بشن سنگھ کے بیاہ پر بھی لکھی ہے، جو راجہ ناگر مل کا بیٹا تھا۔ ڈاکٹر گیان چند کے مطابق میر کی مثنویوں کی مجموعی تعداد 37 ہے۔2

البتہ ریختہ ڈاٹ کام پر 35 مثنویاں دستیاب ہیں۔

اوروہ یہ ہیں:

1 خواب وخیال، 2 معاملات عشق، 3 شعلہ عشق، 4 دریائے عشق، 5 جوش عشق، 6 اعجاز عشق، 7 دربیان ہولی، 8 درجشن ہولی وکد خدائی، 9 دربیان کد خدائی نواب آصف الدولہ بہادر، 10 درتہنیت کد خدائی بشن سنگھ، 11 دربیان کذب، 12 دربیان دنیا، 13 اژدرنامہ، 14 شکارنامہ دوم، 15 ساقی نامہ، 16 مورنامہ، 17 نسنگ نامہ، 18 درہجوے عاقل نام ناکے کہ بہ سگاں انے تمام داشت، 19 مونثی بلی، 20 درہجو نا اہل مسمہ بہ زبان زد عالم، 21 درحال مسافر جواں، 22 درحال عشق، 23 درتعریف سگ وگربہ، 24 درہجو شخصے ہیچ مداں دعدائے ہمادانی داشت، 25 در مذمت برشگال کہ باران دراں سال بسیار شدہ بود، 26 جنگ نامہ، 27 تنبیہ الجہال، 28 کپی کا بچہ، 29 درحال افغان پسر، 30 در مذمت آئینہ دار، 31 درہجوے اکول (پیٹو)، 32 دربیان بز، 33 دربیان مرغ بازاں، 34 مرثیہ خروس کے در خانہ فقیر بود، 35 درتعریف آغا رشید کہ خطاط بود و بہ فرمائش میاں۔ 3

مذکورہ بیشتر مثنویوں کے موضوعات سے ہی مشترکہ تہذیب کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ میر تقی میر اردو ادب کے ایسے شاعر ہیں جنھوں نے نہ صرف جذباتِ انسانی کی عمیق تصویر کشی کی ہے بلکہ ہندوستانی مشترکہ تہذیب کے رنگ بھی اپنی شاعری میں بکھیرے ہیں۔ مثنویوں میں بالخصوص مثنوی دربیان ہولی، مثنوی درجشن ہولی وکد خدائی، مثنوی معاملات عشق، مثنوی شعلۂ عشق، مثنوی دریائے عشق، مثنوی جوش عشق، مثنوی اعجاز عشق، مثنوی دربیان کد خدائی نواب آصف الدولہ بہادر اور مثنوی درتہنیت کد خدائی بشن سنگھ وغیرہ میں مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ میر کی مذکورہ مثنویاں محض عشقیہ داستانیں نہیں ہیں بلکہ گنگا جمنی تہذیب (Composite Culture) کی نمائندہ ادبی دستاویزات ہیں۔ ان میں عشق کی آفاقیت، عوامی رسوم ورواج، لسانی امتزاج، مذہبی رواداری اور انسان دوستی جیسے عناصر نمایاں ہیں۔ میر نے اپنی تخلیقات میں برصغیر کی مشترکہ تہذیب کو شعری پیکر عطا کیا ہے۔

ہولی کے موضوع پر میر کی دو مثنویاں ہیں، جن میں وہ ہولی کے میلوں، رنگ وگلال، محبت وشوخی اور تہذیبی میل جول کو بیان کرتے ہیں۔ ان مثنویوں میں ہولی کے موقع پر رنگوں کا چھڑکاؤ، خوشی ومسرت اور عاشق و معشوق کے درمیان دل لگی کا بیان کیا ہی خوب ہے۔ ان مثنویوں میں ہولی تہوار کی فضا، گانے بجانے اور سماجی ہم آہنگی کا منظر بہت ہی کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ ان مثنویوں میں دہلی و اودھ کی مشترکہ تہذیب کا عکس بھی نمایاں ہے۔ یہ دونوں میر کی معروف مثنویاں ہیں جن میں ہولی کی رنگینیوں، گلی کوچوں کی چہل پہل اور تہذیبی میل جول کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ یہاں ہولی کو عاشق ومعشوق کے درمیان ایک رومانوی کھیل کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ خواب وخیال کی کیفیت میں رنگ وگلال کے چھینٹے محبوب کے وصل وفراق کا استعارہ بنتے ہیں۔ ان مثنویوں میں ہولی کی سماجی اور تہذیبی فضا آشکار ہو جاتی ہے۔ جس میں عام لوگ، جوان، بچے اور عورتیں سب جشن میں شریک ہیں۔ راگ رنگ، ہنسی مذاق اور میل جول کو بڑی باریکی سے پیش کیا گیا ہے۔ ہولی کے کھیل میں لوگوں کی شرارتیں، جھگڑے اور ہنسی مذاق دلچسپ پیرائے میں بیان ہوئے ہیں۔ 'مثنوی دربیان ہولی' کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر
رنگ صحبت سے عجب ہیں خرد و پیر
جشن نوروزی اہل ہند سب
عطر مالی سے سبھوں میں گل کی باس
قمقمے جو مارتے بھر کر گلال
جس کے لگتا آن کر پھر منھ ہے لال
روشن الدولہ نے کی تھی روشنی

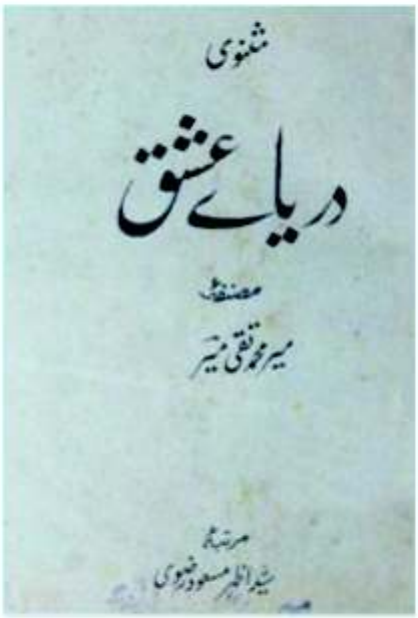

کب ہوئی تھی لیکن ایسی روشنی
وہ چراغاں گرچہ تھے درگاہ تک
تھے تماشائی گدا و شاہ تک
راہ میں تر پولیے مینار تھے
روشنی کے کوچہ و بازار تھے
تھا جہاں تک آب دریا کا بہاؤ
واں تلک تھا اس چراغاں کا دکھاؤ
کوچہ و بازار بام و در بنے
روشنی کے دونوں رستے گھر بنے
کشتیوں میں جو دیے بھر کر چلے
پانی میں شعلوں کے ریلے ہی چلے
نذر کو نواب کی اہل فرنگ
لے کے آتش بازی آئے رنگ رنگ
عرصہ گل ریزی سے گلشن ہوگیا
چرخ ان تاروں سے روشن ہوگیا

میر کی اس مثنوی میں غزل کا لطف بھی دوآتشہ ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ:

لالہ کنار دریا نکلا ہے کیا زمیں سے
اٹھتی نہیں ہیں آنکھیں دیکھو ادھر کہیں سے
بالیدگی سے پہنچے گل آدمی کے سر تک
ہو واں تو رنگ ٹپکے جیب اور آستیں سے
منھ پر عبیر عاشق اصرار سے ملے ہیں
کب ہاتھ کھینچتے ہیں معشوق کی نہیں سے
صندل بھری جبیں سے کیا صبح چہرہ ہووے
اس قطعۂ چمن کے محبوب خوش نشیں سے
یک سو گلال منھ پر خوباں کے مل رہے ہیں
الجھے ہیں ہاتھ یک سو گیسوے نازنیں سے
جب میر جان دینا بوسے کے بدلے ٹھہرا
تب خوف کیجیے کیا پیشانیوں کی چیں سے

چنانچہ ہولی میں عام لوگوں کی شرکت، جشن نوروزی منانا، زعفرانی رنگ سے لباس کو رنگین کرنا، عطر سے خوشبو پھیلانا، گلال سے منہ کو لال کرنا، ندی کے کنارے چراغاں کرنا، کوچہ و بازار اور بام و در کا روشن ہونا، اہل فرنگ کا نواب کے لیے آتش بازی لانا، جیب اور آستیں سے رنگ کا ٹپکنا، عاشق کے منہ پر عبیر ملنا، صندل سے پیشانی کا صبح کی طرح روشن ہونا اور کسی کے چہرے پر شکن تک نہ آنا، مشترکہ تہذیب کے وہ عناصر ہیں جو میر کی مثنویوں کی معنویت کو دوبالا کر دیتے ہیں۔

مثنوی 'درجشن ہولی وکد خدائی' کے چند اشعار پر ایک نظر ڈالیں تو مشترکہ تہذیب کی بے شمار جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

آؤ ساقی شراب نوش کریں
شور سا ہے جہاں میں گوش کریں
آؤ ساقی بہار پھر آئی
ہولی میں کتنی شادیاں لائی
اور بازاری رنگ لائے ہیں
سارے رنگیں ستوں لگائے ہیں
گل کاغذ سے شہر ہے گلزار
توکہے آئی ہے بہار اے یار
زن رقاص پر نگاہ کریں
کسو سادے سے چل کے راہ کریں
کسو دلبر کے کھینچ لیویں ہاتھ
کسو محبوب کو اٹھالیں ساتھ
کسو خوش رو کے منھ پہ منھ رکھ لیں
کنج لب کا کہیں مزہ چکھ لیں
خوش تنوں سے کریں ہم آغوشی
کسو نازک بدن سے ہم دوشی
کہیں دو جام مے سے ہوں سرمست
جائیں گے تھوڑی دور دست بہ دست
جشن نوروز ہند ہولی ہے
راگ رنگ اور بولی ٹھولی ہے

ساقی کا شراب نوش کرنا، دنیا کے شور شرابے کو سننا، ہولی میں خوشیوں کی بہاریں آنا، بازاری رنگ لگانا، تمام ستونوں کو رنگین کرنا، ہر طرف معرکے کا منظر، شہر میں تماشے، عورتوں کا رقص، کسی دلبر کا ہاتھ کھینچ لینا، کسی محبوب کو اٹھا لینا، کسی خوبرو کے منہ پر منہ رکھنا، ہونٹوں کا بوسہ لینا، نازک بدن سے ہمہ تن گوش ہونا، جام پی کر مست ہونا، دھینگا مشتی کرنا، ہر طرف چراغاں کرنا، نوبت بجانا اور راگ رنگ کے مناظر مسرت کی فضا ہموار کر رہے ہیں۔ اسی مثنوی میں ساقی، شراب، شاہ، گدا، وزیر، ہاتھی، ڈوم، حاجی، جوگی، دھوبی، فقیر، پیر، شاعر، بنیا اور سپاہی وغیرہ کا تذکرہ بہت ہی دلچسپ انداز میں کیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

ہاتھی رنگے گئے پڑی ہے دھوم
جیسے ابر سیاہ آئے جھوم
کوئی جوگی کوئی فقیر بنا
کوئی ڈاڑھی لگا کے پیر بنا
کوئی بنیا بنا کوئی اوباش
نقل کرنی تھی ان سبھوں کی معاش
کوئی شاعر بنا نہ جس کی نظیر
جیسے مستغرق خیال تھا میر
کچھ سپاہی بنے تھے کچھ تجار
کوئی زاہد ہوا کوئی خمار
عمدہ سب ساتھ ہیں وزیر سمیت
شاعراں مدح خواں ہیں میر سمیت
ہیں جو مہمان پادشاہ و گدا
حرص دونوں کی سیر ہے یکجا
آؤ ساقی غزل سرا بھی ہو
لذت شعر سے مزہ بھی ہو

میر کی مثنویوں کے بارے میں حالی تحریر کرتے ہیں:

''اب تک اردو میں جتنی عشقیہ مثنویاں ہماری نظر سے گزری ہیں؛ ان میں سے صرف تین شخصوں کی مثنوی ایسی ہے جس میں شاعری کے فرائض کم وبیش ادا ہوئے ہیں۔ اول 'میر تقی' جنھوں نے غالباً سب سے اول چند عشقیہ قصے اردو مثنوی میں بیان کیے ہیں۔ جس زمانہ میں میر نے یہ مثنویاں لکھیں ہیں، اس وقت اردو زبان پر فارسیت بہت غالب تھی اور مثنوی کا کوئی نمونہ اردو زبان میں غالباً موجود نہ تھا اور ایک آدھ نمونہ موجود بھی ہو تو اس سے چنداں مدد نہیں مل سکتی۔ اس کے سوا اگرچہ غزل کی زبان منجھ گئی تھی مگر مثنوی کا رستہ صاف ہونے تک ابھی بہت زمانہ درکار تھا۔ اسی لیے میر کی مثنویوں میں فارسی ترکیبیں، فارسی محاوروں کے ترجمے اور ایسے فارسی الفاظ جن کی اب اردو زبان متحمل نہیں ہوسکتی، اس انداز سے جو آج کل فصیح اردو کا معیار ہے بلاشبہ کسی قدر زیادہ پائے جاتے ہیں۔ نیز اردو زبان کے بہت سے الفاظ ومحاورات جو اب متروک ہو گئے ہیں میر کی مثنوی میں موجود ہیں۔ اگرچہ یہ تمام باتیں 'میر' کی غزل میں بھی کم وبیش پائی جاتی ہیں مگر غزل میں ان کی کھپت ہوسکتی ہے۔ کیوں کہ غزل میں ایک شعر بھی صاف اور عمدہ نکل آئے تو ساری غزل کو شان لگ جاتی ہے۔ وہ عمدہ شعر لوگوں کی زبان پر چڑھ جاتا ہے اور باقی پر کن اشعار سے کچھ سروکار نہیں رہتا۔ لیکن مثنوی میں جستہ جستہ اشعار کے صاف اور عمدہ ہونے سے کام نہیں چلتا۔ زنجیر کی ایک کڑی بھی ناہموار اور بے میل ہوتی ہے تو ساری زنجیر آنکھوں میں کھٹکتی ہے۔ پس ان اسباب سے شاید میر کی مثنوی آج کل کے لوگوں کی نگاہ میں نہ جچے۔ مگر اس سے میر کی شاعری میں کچھ فرق نہیں آتا۔ جس وقت میر نے یہ مثنویاں لکھی ہیں؛ اس وقت اس سے بہتر زبان میں مثنوی لکھنی امکان سے خارج تھی۔ با ایں ہمہ میر کی مثنوی اکثر اعتبارات سے امتیاز رکھتی ہے؛ باوجود یہ کہ میر صاحب کی عمر غزل گوئی میں گزری ہے۔ مثنوی میں بھی بیان کے انتظام اور تسلسل کو انھوں نے کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے اور مطالب کو بہت خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے۔ جیسا کہ ایک مشاق و ماہر استاد کر سکتا ہے۔ اس کے سوا صاف اور عمدہ شعر بھی میر کی مثنوی میں بمقابلہ ان اشعار کے جن میں پرانے محاورے یا فارسیت غالب ہے کچھ کم نہیں ہیں۔ صدہا اشعار میر کی مثنویوں کے آج تک لوگوں کے زبان زد چلے جاتے ہیں۔''4

حالی کے اس اقتباس سے میر کی مثنویوں کی عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

میر کی عشقیہ مثنویوں کی اگر بات کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ میر نے ان مثنویوں میں عشق کا آفاقی اور صوفیانہ تصور پیش کیا ہے۔ مثنوی معاملات عشق، شعلہ شوق، دریائے عشق، جوش عشق اور اعجاز عشق وغیرہ میں عشق کو تزکیۂ نفس اور روحانی ارتقا کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ مثنویاں صوفیانہ اور بھکتی روایت کے امتزاج کی نمائندگی کرتی ہیں۔ نثار احمد فاروقی تحریر کرتے ہیں:

''کلیات میر میں 232 اشعار کی ایک مثنوی 'شعلہ شوق' شامل ہے۔ اس کا ہیرو ایک 'جوان رعنا' پرس رام ہے اور ہیروئن اس کی بیوی ہے۔ یہ مثنوی عشق کی تعریف سے شروع ہوتی ہے:

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور
محبت مسبب محبت سبب
محبت سے آتے ہیں کار عجب

تمہید میں میر نے 32 اشعار محبت کی تعریف میں لکھے ہیں۔''5

شادی کے بعد پرس رام کو اپنی بیوی سے ایسی محبت ہوئی کہ اس نے ساتھ ساتھ جینے مرنے کا عہد کر

لیا۔ ہندو دھرم میں شادی کا بندھن اٹوٹ مانا جاتا ہے۔شادی کا مطلب آخری سانس تک ساتھ نبھانا ہے۔ چنانچہ اس نظریے سے میر کی اس مثنوی کا مطالعہ کریں تو اس کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ میر لکھتے ہیں:

کہ تا گہ وہ دلبر ہوا کد خدا
رہا اپنے عاشق سے چندے جدا
زن و شو سے اخلاص باہم ہوا
اس آشفتہ سے رابطہ کم ہوا
ہوا ربط چسپاں بہم اس قدر
کہ دشوار اٹھے ہم دیگر سے نظر
رہیں دونوں دست و بغل روز و شب
کبھو منہ پہ منہ ہو، کبھی لب پہ لب
وفا نے جو تکلیف کی ایک روز
گیا اپنے عاشق کے وہ دل فروز
کئی دن میں جا کر جو اس سے ملا
کیا اس نے حد سے زیادہ گلا
کہ اے نازنین آہ کن نے کہا
کہ تو حال سے میرے غافل رہا
کہا ان نے تھی کد خدائی میری
نہ تھی بے سبب یہ جدائی میری

پرس رام اپنے عاشق سے پوری بات بتا دیتا ہے کہ میری شادی ہو چکی ہے اور میں اپنی بیوی کا اسیر ہو چکا ہوں۔اب میں اپنی بیوی سے الگ نہیں ہو سکتا۔ بیوی کو بھی مجھ سے ایک دم کی جدائی برداشت نہیں ہے۔اگر میں ذرا دیر کے لیے بھی گھر سے باہر نکلتا ہوں تو واپس جا کر اسے نیم جان پاتا ہوں۔اس منظر کو میر کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

نہ دیکھے جو مجھ کو تو مر جاوے وہ
وہیں جی سے اپنے گزر جاوے وہ

اس کے بعد پرس رام کی بیوی کا امتحان لیا جاتا ہے اور جھوٹی کہانی گڑھ کر اسے خبر پہنچائی جاتی ہے کہ پرس رام دریا میں ڈوب کر مر چکا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی اس کی بیوی بھی فوت ہو جاتی ہے۔ ہندو خواتین کا اپنے شوہروں کی موت کے بعد زندہ نہ رہنے کا عزم قدیم زمانے سے چلا آ رہا تھا۔مثنوی میں بیوی کا فوت ہو جانا ستی کی رسم کا دوسرا روپ نظر آتا ہے۔ میر نے اس مثنوی میں سچی محبت کی داستان بیان کی ہے جو آفاقی ہے اور ہر ایک کے درمیان مشترک ہے۔ میر کی اس

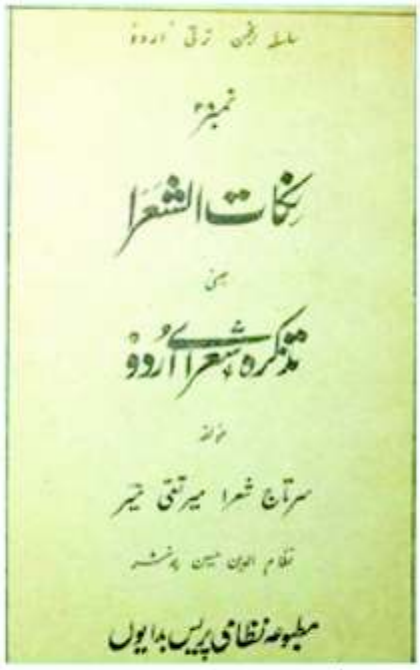

مثنوی میں کسی میلے یا تہوار یا اشنان کا ذکر تو نہیں ہے لیکن پرس رام کا عاشق جب یہ جھوٹی خبر بھجواتا ہے کہ پرس رام مر گیا تو خبر سنانے والا یہی کہتا ہے کہ وہ غرق ہو گیا۔اسی لیے بعد میں اس کی بیوی کی روح ایک شعلہ بن کر دریا کے کنارے پکارتی پھرتی ہے۔

مثنوی دریائے عشق کی ابتدا عشق کی تعریف سے ہوتی ہے۔ میر کا تصور عشق عالمگیر ہے اور کارخانہ عالم اسی سے چل رہا ہے:

عشق ہی عشق ہے جدھر دیکھو
سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

میر کے نزدیک زندگی کا بہترین مصرف عشق میں اپنی زندگی کو ختم کر دینا ہے اور انسان کی معراج یہی ہے کہ عشق کے راستے میں وہ اپنے آپ کو فنا کر دے۔ ذکر میر میں میر نے اپنے والد کی طرف عشق کے بارے میں یہ کلمات منسوب کیے ہیں:

''بیٹا عشق کرو۔ عشق ہی اس کارخانہ ہستی کا چلانے والا ہے۔ اگر عشق نہ ہوتا تو نظام عالم قائم ہی نہ ہو پاتا۔ بغیر عشق کے زندگی وبال ہے۔ عشق میں جی جان کی بازی لگا دینا ہی کمال ہے۔ عشق ہی بناتا ہے، عشق ہی جلا کر کندن کر دیتا ہے۔ جو کچھ ہے وہ عشق ہے، وہ عشق کا ظہور ہے، آگ میں سوزش اور پانی میں روانی عشق سے ہے، خاک میں عشق کا قرار ہے اور ہوا میں اس کا اضطرار ہے، موت عشق کی مستی اور زندگی اس کی ہوشیاری ہے۔ دن عشق کی بیداری اور رات اس کی نیند ہے۔ مسلمان عشق کا جمال اور کافر اس کا جلال ہے۔ نیکی عشق کا قرب اور گناہ اس سے دوری ہے۔ جنت اس کا شوق اور دوزخ اس کا ذوق ہے۔ عشق کا مقام و مرتبہ بندگی سے، زہد و عرفان سے، سچائی اور خلوص سے، اشتیاق اور وجدان سے بھی بلند و بالاتر ہے۔ کچھ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ آسمانوں کی یہ گردش بھی عشق کے ہی باعث ہے۔ یعنی وہ اپنے محبوب تک پہنچنے کی دھن میں برابر سرگرداں ہیں۔''6

چنانچہ میر کی مثنویوں میں جو عشق کا تصور ابھر کر سامنے آتا ہے، وہ انہی خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ 'مثنوی دریائے عشق' کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

عشق ہے تازہ کار و تازہ خیال
ہر جگہ اس کی ایک نئی ہے چال
کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہا
کہیں سر میں جنون ہو کے رہا
دل میں جا کر کہیں یہ درد ہوا
کہیں سینے میں آہ سرد ہوا
کہیں رونا ہوا ندامت کا
کہیں ہنسنا ہوا جراحت کا
کسو چہرے کا رنگ زرد ہوا
کسو محمل کے آگے گرد ہوا
ایک عالم میں درد مندی کی
ایک محفل میں جا پسندی کی
کون محروم وصل یاں سے گیا
کہ نہ یار اس کا پھر جہاں سے گیا

مذکورہ مثنوی میں عشق کی جلوہ گری کسی قوم، سماج، مذہب، نسل، علاقہ اور فرقہ تک محدود نہیں ہے، بلکہ ہر ایک کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق میر کی شاعری کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

''میر صاحب کے کلام میں ایسے حیرت انگیز جلوے نظر آتے ہیں جس طرح بعض اوقات سمندر کی سطح دیکھنے میں معمولی اور بے شور و شر نظر آتی ہے لیکن اس کے نیچے ہزاروں لہریں موجزن ہوتی اور ایک ٹھلبلی مچائے رکھتی ہیں۔ اسی طرح اگرچہ میر صاحب کے اشعار کے الفاظ ملائم، دھیمے، سلیس اور سادہ ہوتے ہیں لیکن ان کی تہ میں غضب کا جوش یا درد چھپا ہوتا ہے۔ الفاظ کی سلاست اور ترکیب کی سادگی لوگوں کو اکثر دھوکہ دیتی ہے۔ وہ ان پر سے بے خبر گزر جاتے ہیں اور

یہ نہیں دیکھتے کہ شاعر نے ان سلیس الفاظ اور معمولی ترکیب میں کیا کیا کمال بھر رکھے ہیں۔''7

میر کی مثنویوں کے بارے میں مولوی عبدالحق کی درج ذیل رائے بھی بہت اہم ہے:

''بعض ان میں سے (یعنی بعض مثنویاں) ایسی ہیں کہ اب بھی ان کا پڑھنا لطف سے خالی نہیں۔ مثلاً دو مثنویاں جو اپنے گھر کی خرابی اور برسات کی شکایت میں لکھی ہیں خوب ہیں۔ برسات میں اس مصیبت کا حال بہت ہی دردناک ہے، صحیح اور سچی واردات جو ایسی حالت میں واقع ہوتی ہے اس طرح لکھی ہے کہ آنکھوں کے سامنے بے سروسامانی کا نقشہ کھنچ جاتا ہے اور غربا پر جو اس موسم میں گزرتی ہے اس کی حقیقی تصویر اس سے بہتر کہیں نہیں ملتی۔ اس سے میر صاحب کی قوت مشاہدہ اور بیان واقعہ کی قدرت ظاہر ہوتی ہے۔ عشقیہ مثنویوں میں قصے اور بیان کے لحاظ سے سب سے بہتر شعلۂ عشق ہے۔ یہ ایک سادہ اور مختصر سا قصہ ہے لیکن جس طرح انھوں نے اسے اٹھایا ہے اور آخر تک نبھایا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ انجام اس کا نہایت پر درد ہے۔ آخر میں جا کر قصے کی صورت مافوق العادت ہوگئی ہے مگر وہ اس قدر صاف ہے کہ بہت آسانی سے اس کی توجیہ ہوسکتی ہے۔''8

مثنوی 'شکارنامہ' کی اگر بات کریں تو گرچہ اس میں انھوں نے نواب آصف الدولہ کے شکار کا حال بیان کیا ہے، لیکن جو منظر کشی کی ہے؛ وہ مشترکہ تہذیب کے اردگرد گھومتی ہے۔ میر نے اس میں جا بجا غزلیں بھی کہی ہیں۔ ان غزلوں کا معیار بہت ہی بلند ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

چلا آصف الدولہ بہر شکار
نہاد بیاباں سے اٹھا غبار
روانہ ہوئی فوج دریا کے لگ
لگا کانپنے ڈر سے شیر و پلنگ
طیور آشیانوں سے جانے لگے
وحوش اپنی جانیں چھپانے لگے
سن آواز شیران نر ڈر گئے
پلنگ و نمر خوف سے مر گئے

اسی لے میں پوری مثنوی میر نے تخلیق کی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے ایک مقالے 'میر کی مثنویاں' میں تحریر کرتے ہیں:

''میر کی مثنوی جوش عشق اور خواب و خیال میں ایک اپیل ہے مگر یہ دونوں مثنویاں مجذوب غزل گو شاعر کی آپ بیتی ہیں جس کے لیے غزل کے بجائے مثنوی کی وسعت تلاش کی گئی ہے اور وہی خیالات ہیں جو غزل میں اجمال سے بیان ہوئے ہیں۔ یہاں بیانیہ کی صورت میں تفصیلاً پیش کر دیے گئے ہیں۔ میر کی مثنویوں کا دوسرا بڑا موضوع اپنے ماحول اور خارجی کائنات کی ترجمانی ہے۔''9

خدائے سخن میر تقی میر کی مثنوی 'موہنی بلی' بھی بہت ہی پر لطف ہے۔ اس مثنوی میں سماج اور ماحول کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

ایک بلی 'موہنی' تھا اس کا نام
ان نے میرے گھر کیا آکر قیام
ربط پھر پیدا کیا میرے بھی ساتھ
دیکھتی رہنے لگی میرا ہی ہاتھ
چھیچھڑا ٹکڑا جو کچھ پایا کرے
فقر میرا دیکھ کر کھایا کرے
برسوں یاد آوے گی یہ پاکیزہ خو
آگے آئی ہی نہیں چلتے کبھو
چوہا چڑیاں ان نے کچھ کھایا نہیں
حج کو جانا اس کے تیں آیا نہیں
موہنی اور سوہنی ہے ان کا نام
پھرتی ہیں پھندنا سی دونوں صبح و شام

میر کی مثنویوں کے بارے میں مجنوں گورکھپوری اپنے ایک مقالے 'میر اور ہم' میں تحریر کرتے ہیں:

''میر کے کلام کو اگر رک رک کر اور کافی غور سے پڑھا جائے تو اس کے اندر ان کے زمانے کی ایک عنا گیختہ فریاد کا احساس ہوتا ہے جو چیخ پکار کی صورت نہیں اختیار کر پاتی''۔10

میر کی چھوٹی مثنویوں کا تعلق ان کی ذات سے ہے یا ان کے قریبی ماحول سے۔ مثلاً بلیوں کا حال جن کی پیاری پیاری میوں سے میر بہت محظوظ ہوتے ہیں۔ اسی طرح کتوں کا حال جن کی بعض عادات سے انھیں بڑی نفرت ہے:

چار آتے ہیں چار جاتے ہیں
چار عف عف سے کان کھاتے ہیں

اسی طرح اپنے گھر کا حال، کھٹملوں کا حال، سفر کا حال، برسات کی کہانی اور بکری کے متعلق مثنوی وغیرہ وغیرہ۔ جھوٹ کی مذمت میں میر تقی میر نے جو مثنوی تحریر کی ہے، وہ سماج کے ایک بڑے طبقے کے احوال کو بیان کرتی ہے۔ اس مثنوی میں اس عہد کی تہذیب پوری توانائی کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ چنانچہ ملاحظہ فرمائیں:

اے جھوٹھ آج شہر میں تیرا ہی دور ہے
شیوہ یہی سبھوں کا یہی سب کا طور ہے
اے جھوٹھ تو شعار ہوا ساری خلق کا
کیا شہ کا کیا وزیر کا کیا اہل دلق کا
اے جھوٹھ تجھ سے ایک خرابی میں شہر ہے
اے جھوٹھ تو غضب ہے قیامت ہے قہر ہے
اے جھوٹھ رفتہ رفتہ ترا ہوگیا رواج
تیری متاع باب ہے ہر چار سو میں آج
اے جھوٹھ کب ہے عرصہ میں تجھ سا حریف اب
تیرے ہی حکم کش ہیں وضیع و شریف اب

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ میر کی مثنویاں فن اور تہذیب دونوں کا حسین امتزاج ہیں۔ ان میں ہندوستانی مشترکہ روایت ایک زندہ حقیقت کے طور پر جلوہ گر ہے۔ میر نے ادب کے ذریعے اس تہذیب کو محفوظ کر کے آنے والی نسلوں تک منتقل کیا ہے۔ میر تقی میر کی مثنویاں برصغیر کی مشترکہ تہذیب کا آئینہ ہیں۔ ان میں انسان دوستی، صوفیانہ فکر، عوامی رسوم اور لسانی امتزاج وہ پہلو ہیں جو گنگا جمنی روایت کی اساس ہیں۔ میر کی مثنویاں نہ صرف ادبی کمالات کی حامل ہیں بلکہ ہندوستانی مشترکہ تہذیب کی جیتی جاگتی مثال ہیں۔

حواشی

1 مقدمہ شعروشاعری، صفحہ 40-239۔
2 افکار میر، ایم حبیب خان، انڈین بک ہاؤس علی گڑھ، سن اشاعت 1967ء، صفحہ 364 کا حاشیہ۔
3 ریختہ ڈاٹ کام۔
4 مقدمہ شعروشاعری، صفحہ 62-261۔
5 تلاش میر، نثار احمد فاروقی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی، سن اشاعت 1974ء، صفحہ 46-145۔
6 ایضاً، صفحہ 190۔
7 افکار میر، احمد حبیب خان، انڈین بک ہاؤس علی گڑھ، سن اشاعت 1967ء، صفحہ 184۔
8 ایضاً، صفحہ 191۔
9 ایضاً، صفحہ 374۔
10 ایضاً، صفحہ 181۔

Dr. Mohammad Afzal Husain Misbahi
Asstt. Prof. of Urdu
M.M.V, Banaras Hindu University
Varanasi, Uttar Pradesh
Mob.:9810358883
E-mail: afzalmisbahi@gmail.com

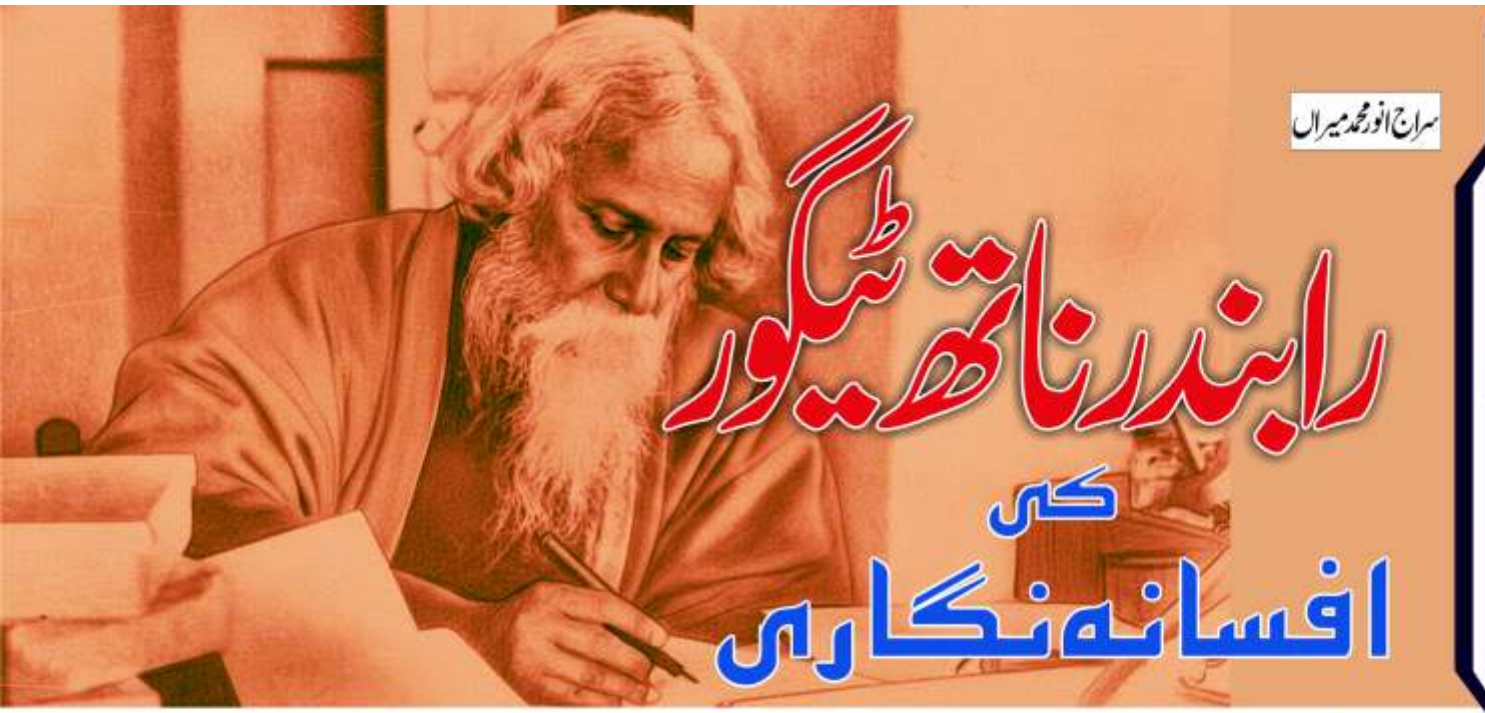

رابندر ناتھ ٹیگور کی افسانہ نگاری

سراج انور محمد میراں

ہندوستانی ادبیات میں اردو اور بنگلہ ادب کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ بنگلہ زبان تقریباً سوسے زیادہ بولیوں کوملا کرایک زبان کی شکل میں وجود میں آئی۔ اسی طرح اردو زبان نے بھی مختلف زبانوں، علاقوں اور ادوار سے استفادے کے نتیجے میں ایک مستقل اور معیاری زبان کی شکل اختیار کی اور جب زبان کا یہ سفر ادب کی طرف گامزن ہوا تو اس میں افسانوی اور غیر افسانوی ادب نے جگہ پائی۔

ہر ادب کسی نہ کسی مخصوص معاشرے اور تہذیب کی پیداوار ہوتا ہے۔ ادب کے ساتھ ایک پورا تہذیبی و تاریخی پس منظر بھی ہوتا ہے۔ خود ہندوستان جیسے تہذیبی ولسانی اعتبار سے وسیع وعریض ملک میں کئی بڑی زبانیں ہیں جن کے پاس ادب کی متحرک اور شاندار روایت موجود ہے اور آج بھی یہ زبانیں اور ان کا ادب زندہ و توانا ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور ہندوستانی ادب کے ایک عظیم فن کار تھے جنھوں نے اپنی علمی اور تخلیقی صلاحیتوں سے ہندوستان کی فکری وفنی روایات کو ثروت مند بنایا۔

رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنی تخلیقات کے ذریعے بنگلہ زبان وادب کو عالمی سطح پر متعارف کرایا۔ انھوں نے اپنے مجموعہ کلام 'گیتانجلی' کا انگریزی میں ترجمہ کر کے مغربی دنیا میں بھی اپنی انفرادی حیثیت قائم کی۔ ان ہی خصوصیات کی بنا پر انھیں نوبل پرائز جیسا عالمی انعام حاصل ہوا۔

ٹیگور نے اپنے عہد کی زندگی، زمانہ اور ثقافت کے بدلتے ہوئے منظر نامے کی تلخیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ انھوں نے اپنے مشاہدے اور غور وفکر سے ایسے ادب کی تخلیق کی جو عصری شعور سے ہم آہنگ ہے۔ ان کی تخلیقات کو سامنے رکھ کر انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کی سماجی وسیاسی، معاشی اور تہذیبی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔

ان کے یہاں حقیقی ہندوستان نظر آتا ہے۔ انھوں نے ہندوستان، ہندوستانی عوام کی زندگی اور مسائل کی تصویر کشی کی ہے۔ ٹیگور نے افسانوی ادب کو ایک نئی جہت، نئی فکر اور نیا انداز بیان عطا کیا۔ نفسیاتی الجھنوں اور معاشی مسائل کا اظہار ملتا ہے۔

بچوں کی نفسیاتی خصوصیات کو اپنے افسانوں کا مرکز بنا کر انھوں نے اپنے فن کو ایک نئی جہت عطا کی۔ فن اور تکنیک کے حوالے سے تجربے بھی کیے خواہ وہ موضوعات کی سطح پر ہوں یا ہیئت اور تکنیک کی سطح پر۔ ان کے یہاں تکنیک میں کئی ایسے نئے تجربے کیے گئے جو دوسرے افسانہ نگاروں سے بالکل مختلف ہیں۔ ٹیگور اس وقت کی سیاسی اور سماجی ہنگامہ خیزیوں سے ایک ساتھ ایک ہی طرح متاثر ہوئے۔ ٹیگور نے نہ صرف اپنے ملک کی زبان کے ادب کو مالا مال کیا بلکہ دنیا کی دوسری زبانوں کے عظیم ادیبوں کو بھی متاثر کیا۔ فنی نقطہ نظر سے ہندوستانی ادب کو عالمی ادب کی برابری کے قابل بنایا، جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ جہاں ایک طرف ہندوستانی قوم کے مزاج، مسائل اور مصائب پر ان کی گہری نظر تھی وہیں عالمی ادب کے فنی اقدار، مزاج اور معیار کے نمونے بھی ان کے سامنے تھے۔ وہ ادب کے ذریعے عوامی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے کوششیں کرتے رہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور کے افسانوں کے متعلق کوئی بھی گفتگو ان کے پس منظر کو جانے بغیر نتیجہ خیز نہیں ہوسکتی۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے مختلف تصورات کا اجمالی جائزہ پیش کر دیا جائے۔ ٹیگور کے عہد میں ملک کی اجتماعی زندگی عجیب دور سے گزر رہی تھی۔ سیاسی، سماجی، مذہبی اور معاشرتی صورت حال بد سے بدتر ہو رہی تھی۔

ٹیگور نے جب اپنا تخلیقی سفر شروع کیا تو انگریزی تہذیب شہری زندگی میں داخل ہو چکی تھی۔ قدیم طرز معاشرت کے بطن سے جدید تہذیب جنم لے چکی تھی۔ راجہ رام موہن رائے کی نئی طرز فکر کے ساتھ ہی بنگال میں جدید رجحانات کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔

ٹیگور کے افسانوں میں اس عہد کے مختلف رجحانات کا اثر نظر آتا ہے۔ ان میں انیسویں صدی کی اصلاحی تحریکوں کے دور رس اثرات کے ساتھ ساتھ بیسویں صدی میں شروع ہونے والی سیاسی سرگرمیوں اور ہندوستانی قومیت کے تصور کی جھلک بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کی کہانیاں تغیر پذیر معاشرے کا نمونہ پیش کرتی ہیں۔ انھوں نے فلسفیانہ لغزشوں سے پرہیز کیا ہے۔ ان کا وہ انداز جس کے ذریعے وہ اپنے کرداروں کو نمائندہ بناتے ہیں، وہ بنگالی معاشرے میں پوری طرح جذب ہو جاتا ہے۔ ان کی کہانیاں اس دور کے رسم و رواج اور سماجی قوانین کی بخوبی وضاحت کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ اس دور کی ہندوستانی تاریخ کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتی ہیں۔ وہی دور جس میں 'مہاتما گاندھی' نے انھیں 'گرودیو' یعنی 'روحانی رہنما' کا خطاب دیا تھا۔ جس طرح ٹیگور نے تقریباً 66 سال کے عرصے تک قلم کے ذریعے پر اثر حکمرانی کی، وہ دور

متوسط طبقے کے لیے نہایت ترقی یافتہ دور تھا۔

ماہیت، تناسب اور موضوع کے اعتبار سے ٹیگور کے افسانوں کی مختلف قسمیں ہیں۔ عشق و محبت سے لے کر بھوت پریت تک ان کے افسانوں کے موضوع رہے ہیں۔ فنی اعتبار سے ٹیگور کے افسانے صاف ستھرے اور بے عیب ہیں ان کا مقابلہ کسی بھی زبان کے بہترین افسانوں سے کیا جاسکتا ہے۔ شاعری اور گیتوں کی طرح ٹیگور نے آخری دنوں تک افسانے بھی لکھے۔ ان کے افسانوں کا بغور مطالعہ کرنے پر ان کے فنی ارتقا کے مختلف مدارج اور فرق کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ ٹیگور کے 9 افسانوی مجموعے شائع ہوئے ہیں جن میں ہر طرح کے افسانے شامل ہیں۔

ٹیگور کے افسانے نئے پیشہ وارانہ طبقے اور سماج کی جاگیردارانہ ساخت کی تنزلی کے گواہ ہیں۔ صنعتی نظام، نقل وحمل، ترسیلی ابلاغ و ذرائع کی ترقی نے طبقہ، فرقہ، اور مذہب کی درمیانی خلیج کو کسی حد تک عبور کیا تھا۔ سیاسی، معاشی اور تہذیبی اثرات سے ٹیگور بھی محفوظ نہ رہ سکے، انھوں نے سماجی، سیاسی اقتصادی، رومانی، اور مافوق الفطری جیسے تمام موضوعات پر کہانیاں لکھیں۔ لیکن زیادہ تر کہانیوں میں سماجی مسائل کو پیش کیا ہے۔ ان کے اہم موضوعات میں دیہاتی اور شہری زندگی کے عناصر کے مابین کشیدگی، انگریزی تعلیم کی قدروں کو غلط استعمال کرنے کا رجحان، قومیت کے ہنگامی حالات کا اثر، اور بنگالی عورتوں کی گومگو والی کیفیات جن کے ساتھ رسم ورواج کے نام پر ناروا سلوک کیا جاتا تھا اور جو، اب نئے طوفان کے اثر سے بنگلہ گھروں کے لیے خطرہ بن چکی تھیں، زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔

جب ان کا افسانہ 'گھیٹر کتھا' (گھاٹ کی باتیں) شائع ہوا تو اس وقت وہ مشرقی بنگال میں خاندانی زمین کی دیکھ بھال کے سلسلے میں مصروف تھے۔ وہاں بنگالی کسانوں کے معمولات کا ہمدردانہ مشاہدہ، دیہات کے موسم، وہاں کے لوگوں کی طبیعت اور ان کے مزاج سے قریبی تعلقات نے ادبی نگارشات کے لیے مواد فراہم کیا۔ پرماندی پر سنہری کشتی پر سوار ان کی سیاحت کا اصل مقصد اگرچہ جائداد کی دیکھ بھال تھا لیکن جہاں جہاں وہ رکتے، رعایا سے ملتے، ان کی درخواستیں سنتے، ان کی شکایات کو دور کرنے کی کوشش کرتے، اس طرح وہ گاؤں کے لوگوں کی زندگی سے بہت قریب ہو گئے۔ رابندر ناتھ ٹیگور پہلے ایک شاعر تھے بعد میں افسانہ نگار۔ حقیقت میں وہ ایک رومان پسند فن کار تھے۔ بچپن ہی سے انھیں فطرت سے قلبی لگاؤ تھا۔ ان کے تمام ادبی کارنامے فطرت کے حسین وجمیل مرقعوں سے پر ہیں۔ ٹیگور اوائل عمری میں اپنے والد کے ہمراہ سفر ہمالہ میں حسن قدرت سے مسحور ومتاثر ہوئے۔ اس سفر میں انھیں قدرتی مناظر دیکھنے کا موقع ملا اور ٹیگور کو نہایت فرحت و مسرت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد یہ جادو برابر اثر کرتا رہا انھوں نے ابتدا سے ہی نیچر کو مادر شفیق سمجھا اور اسی کی آغوش محبت میں دینی پرورش اور روحانی تربیت پائی۔

ان کے افسانوں میں مناظر قدرت، اور فطرت انسانی کی مختلف النوع کیفیات کا اظہار ملتا ہے۔ صرف انسانی زندگی ہی نہیں، انھیں فطرت میں منعکس زندگی سے بھی پیار تھا۔ فطرت ان کی نظر میں بذات خود ایک جاندار وجود ہے۔ حسن فطرت کی پرستش اور اس کی نیرنگیوں کا محاکاتی مطالعہ ٹیگور کے فن کی جان ہے۔ فطرت ان کے آرٹ میں بے جان نہیں، ذی روح حساس اور کہیں کہیں باشعور نظر آتی ہے۔

ٹیگور نے پوری کائنات سے ایک تعلق خاطر قائم رکھا ہے۔ انھوں نے سمندر کے سکوت سے ہم کلامی کی تھی۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں پہاڑوں اور رات کی تاریکیوں سے سرگوشی کی ہے۔ اپنی یادداشت پیش کرتے ہوئے جہاں کہیں بھی موقع ملا ہے اس طرح کے مناظر پیش کیے ہیں:

''اس وقت رات بھیگ چکی تھی۔ سمندر کی لہریں ساکت ہو چکی تھیں۔ اور جھاؤں کی جھاڑیوں کی سرسراہٹ بالکل تھم چکی تھی۔ سمندر کے ساحل پر پھیلی ہوئی ریت پر درختوں کے سائے بے حس وحرکت تھے۔ نیز شفق پر نیلے پہاڑی سلسلے امبر تلے خاموش تھے۔ اس کھلے اجلے پن اور گہری خاموشی کے درمیان ہم کئی لوگ اپنی سیاہ پر چھائیوں کے ساتھ خاموشی سے چلتے رہے۔''

ٹیگور سے پہلے مناظر فطرت کو افسانے میں خوبصورتی کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن ٹیگور نے انھیں انسانی جذبات و احساسات کے اظہار کی زبان دی۔ چاند کو انسان کا راز دار اور غمگسار دوست بنایا، ندی کو ایک رقاصہ سے تشبیہ دی، چاندنی کو کہیں غشی کی حالت میں دکھایا تو کہیں سناٹے کی چادر اوڑھے ہوئے ایک وداع ہوتے ہوئے مہمان کا نام۔ الغرض فطرت کے ان حسین نظاروں کے ذریعے انھوں نے اپنے کرداروں کی نفسیات کا اظہار کیا ہے۔ اور ان کے جذبات کی ترجمانی کے لیے ان کا موزوں استعمال کیا ہے۔

ٹیگور کا تخیل انتہائی وسیع ہے۔ مناظر فطرت کی عکاسی اور جذبات کی مصوری ٹیگور کا خاص حصہ ہے۔ وہ ہر طرح کے انسانوں اور مختلف انسانی جذبات کی کیفیات کو اسی طرح اپنا لیتے ہیں اور ان میں شاعرانہ جوش وخروش اس طرح بھر دیتے ہیں، گویا وہ ان کا ہی حصہ ہو۔ عورتوں کی مزاج شناسی اور ان کے جذبات کے اظہار میں ٹیگور کو خاص ملکہ حاصل ہے۔ ان کے بہت سے ایسے افسانے ہیں جن میں عورتوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے وہ نسوانی فطرت کی تہ تک پہنچ گئے ہیں۔ ان کا تخیل فطرت انسانی پر اتنا حاوی ہے گویا اپنی شخصیت ان لوگوں کی شخصیت میں تحلیل کر دی ہے۔ ان کی وسیع نظر ان کی جذبہ شناسی، اور ہمدردی ہمہ گیر ثابت ہوئی۔ انھیں غریب کاشتکاروں کی اس سپاٹ اور سادہ زندگی سے بھی سابقہ پڑا جس میں تکلف اور تصنع نہیں تھا۔ جھونپڑوں میں انھیں غریبی اور امیری کی وہ نمایاں تفریق نظر آئی، جو وہ پہلے محسوس نہیں کر سکے تھے۔ ان کی کہانیوں، اشعار اور خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ ٹیگور پہلے تصورات کی دنیا میں تھے۔ لیکن شیلائی پہنچنے کے بعد حقیقت کی دنیا میں آ گئے۔

ٹیگور کے ابتدائی دور کے افسانوں میں قدیم مشرقی تمثیلی اور تخیلی انداز نمایاں نظر آتا ہے۔ اس نوع کے افسانوں میں 'انارکلی'، 'ہڈیوں کا پنجر' (Skeleton) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ 'انارکلی' تاریخی واقعے کے پس منظر میں لکھا گیا افسانہ ہے۔ یہ عہد مغلیہ کے اس دور کی کہانی ہے جب ہندوستان کے تخت شاہی پر اکبر اعظم کی حکومت تھی۔ اس کا موضوع محبت، رومان اور اصولوں کے درمیان کشمکش اور اختلاف ہے۔ سلیم اور انارکلی کی لازوال عشقیہ داستان کا مرکزی کردار شہزادہ سلیم ہے۔ جو اپنے دربار کی ایک کنیز انارکلی کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ جب شہنشاہ اکبر کو اس کا علم ہوتا ہے تو وہ انارکلی کو اذیتوں اور ظلم کا نشانہ بناتا ہے اور اپنے بیٹے کو آگاہ کر دیتا ہے کہ ایک کنیز کسی بھی طرح تخت شاہی کی ملکہ نہیں بن سکتی۔ اس میں قصہ گوئی کا بیانیہ انداز ہے۔ انارکلی کا کردار اس افسانے میں دلکش اور

موثر ہے۔ اس کے ذریعے ٹیگور نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ محبت جب اپنے اعلیٰ ترین پیکر یعنی ایثار و قربانی کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے تو امر ہو جاتی ہے۔

'ہڈیوں کا ڈھانچہ' بظاہر ایک تخیلی افسانہ ہے لیکن ٹیگور نے اسے آپ بیتی کے انداز میں لکھا ہے۔ بچپن میں وہ جب علم طب سیکھ رہے تھے تو انسانی ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ اکثر ان کے زیر مطالعہ رہتا تھا اسے دیکھ کر انھیں اس انسان کا خیال آتا جس کی وہ ہڈیاں تھیں، اور وہ سوچتے کہ انسانی روح جوان ہڈیوں سے جدا ہو گئی ہے شاید کبھی اپنے پرانے مکان کو دیکھنے آجاتی ہو، اچانک ایک رات ایسا ہی ہوا۔ وہ روح آگئی اور اس نے اپنی ماذی زندگی کی مکمل روداد سنائی۔ اسے اپنے بے پناہ حسن پر کتنا ناز تھا، اپنے قدر شناس شوہر کی موت سے وہ کتنا خوش ہوئی، اور پھر کیسے اس نے ایک خوش رو ڈاکٹر ستیش کمار سے والہانہ عشق کیا اور جب عشق میں ناکامی ہوئی تو اس نے عین اس روز جب ستیش کمار کی شادی ایک دوسری لڑکی سے ہونے والی تھی اسے زہر دے دیا اور خود بھی زہر کھا کر اپنے ہی ہاتھوں انجام کو پہنچی۔

ٹیگور کے افسانوں کو تاریخ کے لحاظ سے مختلف ادوار میں تقسیم کیا جائے تو ان میں مختلف موضوعات کے علاوہ اس زمانے کی حقیقی تصویر کی جھلک بھی دکھائی دے گی۔ ٹیگور کا پیغام بنگال کے دیہاتی اور شہری لوگوں کی فطرت کے درمیان خلا کو پر کرنے کا پیغام ہے۔ جن لوگوں کا معیار زندگی پست ہے، جو شہری زندگی سے کوئی رابطہ نہیں رکھتے، مہذب لوگوں کی نظر میں ان کی کوئی عزت نہیں رہتی اور رئیسوں کے تعلیمی رجحان کے پرفریب خیال سے ٹیگور بہت پریشان رہا کرتے تھے۔ وہ پرمسرت آزادی کا احساس جس کے ذریعے بہت سارے بنگالی نوجوانوں نے انگریزی تعلیم کو خوش آمدید کہا لیکن تعلیم کا غلط استعمال کر کے اپنی پرانی جگہ بھی چھوڑ دی۔ ٹیگور کے تین افسانے ایسے ہی مختلف لہجوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ 'پرائشچت' (1896)، 'راشمنی کا لڑکا' (1910)، 'تپسوی' (1916)۔ یہ تین افسانے تعلیمی نظام کے ذریعے پیدا ہونے والے تصادم سے تعلق رکھتے ہیں۔

'راشمنی کا لڑکا' افسانے میں ایک دولت مند خاندان کی ایک مفلس شاخ اپنی شرافت قائم رکھنے کے لیے جس طرح تکلیف دہ جدوجہد کرتی ہے اس کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ وہ تعلیم حاصل کرنے کلکتہ جاتا ہے۔ وہاں بھوکا پیاسا رہ کر اندھیری سیلن زدہ کوٹھری میں تعلیم حاصل کرتا ہے۔ اور تنگ دستی کی وجہ سے اپنے والدین کو اپنی ضرورتوں اور بیماری سے بھی لاعلم رکھتا ہے۔ بیماری نے بڑھ کر خطرناک شکل اختیار کر لی اور جب تک اس کے والدین آئے اس کا افسانہ زندگی ختم ہو چکا تھا۔ اسی طرح افسانہ 'تپسوی' کا 'برودہ' بھی پرائشچت کے اناتھ بندو کی طرح انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے لیکن دوبارہ امتحان میں ناکام ہونے کی وجہ سے گھر سے غائب ہو جاتا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد اس کے سادھو بننے کی خبر ملتی ہے۔ برودہ اپنی بیوی کو چھوڑ جاتا ہے جو اپنے شوہر کے خواب کو پورا کرنے کے لیے خود بھی جوگن بن جاتی ہے۔ بارہ سال کے بعد اس کا شوہر واپس آتا ہے، لیکن

مغربی لباس میں اور ایک انگریزی واشنگ مشین کا سیلز مین بن کر۔ افسانہ اس جگہ ختم ہوتا ہے جہاں وہ اپنی جیب سے ایک فہرست نکال کر پیش کرتا ہے۔ ان افسانوں میں ٹیگور نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے، کہ دولت کے ذریعے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا وہم ہی جدت پسند اور روایت پسندی کے درمیان تصادم کی وجہ ہے۔

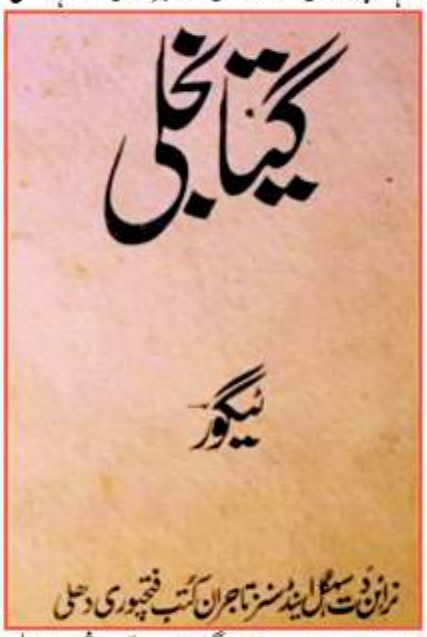

رابندر ناتھ کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے مافوق الفطری عناصر کے ذریعے کہانی میں ایسے موضوعات پیش کیے ہیں جو پر اسرار اور غیر یقینی ہوتے ہوئے بھی اس دور کی سماجی زندگی کے رسم و رواج اور عقائد کی عکاسی کرتے ہیں۔ ٹیگور کا ایک اور وصف ہے۔ انھوں نے افسانوں میں پہلی دفعہ غربا کو مناسب مقام دیا، علاوہ ازیں حالات اور ماحول کا عکس دکھائی دیتا ہے، ان پر جو تصورات اور احساسات غالب تھے ان کا پتا چلتا ہے۔

ٹیگور کو فنون لطیفہ سے روحانی لگاؤ تھا۔ ان کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ بے حد عمیق تھا۔ وہ ادب کے تمام نکات و رموز سے واقف تھے۔ ان کے فکشن میں حسنِ ترتیب، توازن اور واقعات میں فطری ربط ہے۔ فضا، ماحول، مکالمہ بلکہ جزئیات کا بیان بھی نہایت دلکش ہے۔ لیکن جو چیز ان کے افسانوں میں سب سے زیادہ نکھر کر آئی ہے وہ کردار نگاری ہے۔ ان کے افسانوں کے بیشتر کردار فعال اور متحرک ہیں جو اپنے اعمال و افعال کا قاری کے ذہن پر دیرپا اور بھرپور تاثر ثبت کرتے ہیں۔ ٹیگور نے انسانی فطرت کو بے نقاب کر کے رکھ دیا ہے۔ 1918 میں جب شانتی نکیتن کو 'وشو بھارتی' کے بطور بین الاقوامی تعلیمی ادارے کی شکل عطا کی گئی تو ٹیگور نے اس کے قیام کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا تھا:

''ہندوستان کو دنیا سے سچے اور صحیح رشتوں کے ساتھ جوڑنا ہوگا۔ انسانیت دنیا کی تمام سچائیوں سے بڑی حقیقت ہے۔ ہندو، بدھ، سکھ، عیسائی، اور مسلمان ہر نسل و مذہب اپنے اپنے مذہبوں کی عظیم روایات رکھتے ہیں اور یہ سب الگ الگ دھارے آگے بڑھتے ہوئے ایک دھارے میں بدل جاتے ہیں۔ سب لوگوں کو حق ہے کہ وہ سچائی کی تلاش میں جس میں انسان مصروف ہے، شامل ہو جائیں مشرق و مغرب میں کوئی فرق نہ ہو۔ ''وشوا بھارتی'' ہی ایسی جگہ ہوگی جہاں حق کی یہ جستجو ہندوستان کو دنیا کے بقیہ حصوں کے ساتھ منسلک کر دے گی۔''

ٹیگور کو مطالعے کا حد درجہ شوق تھا اور یہ مطالعہ نہایت متنوع اور ہمہ پہلو تھا۔ انھوں نے بنگلہ کے علاوہ سنسکرت، اردو اور انگریزی ادبیات کا عمیق مطالعہ کیا تھا۔ ان کے ذاتی کتب خانے میں ادب، تاریخ، فلکیات، طب، ارضیات، کیمیا سے لے کر دیہی معاشیات، امداد باہمی، بنک کاری کے ساتھ ریشم کے کیڑوں کی افزائش، تیل اور برتن سازی، چرم سازی، نقاشی، پکوان، سرکہ سازی، وغیرہ سے متعلق کتابیں موجود تھیں۔ انھوں نے ان کتابوں کا مطالعہ محض وقت گذاری کے لیے نہیں، بلکہ اپنے ذہنی افق کو وسیع تر کرنے کے لیے کیا۔ ان کے اندر مختلف چیزوں کو جاننے اور محسوس کرنے کا فطری داعیہ موجود تھا اور ان کے مطالعے کا تنوع ان

کے اس فطری رجحان کی غمازی کرتا ہے۔ شاعری کی طرح ٹیگور کے افسانے بھی فطرت کے نغموں سے معمور ہیں۔ ان کی نگاہ میں فطرت کوئی مردہ، بے جان، ساکت چیز نہیں بلکہ زندگی کی حرارت سے متحرک ہے اور اس کے مختلف مظاہر میں انسانی صفات شامل ہیں۔ انھوں نے موسم کو رقص کرتی خواتین لکھا اور اوس پر چمکتی کرنوں کو سورج سے آنے والا محبت کا پیغام قرار دیا۔

ٹیگور کے افسانوں کے مرد کرداروں کو بھی مختلف روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ ایک طرف ہم تن تنہا پوسٹ ماسٹر کو دیکھتے ہیں، تو دوسری طرف ندا کشور کی شکل میں ایک عملی شخص کو۔ ٹیگور جس عہد میں پیدا ہوئے اس وقت مغربی تہذیب نے ہندوستانی زندگی کے پرسکون سمندر میں ایک تموج پیدا کر دیا تھا۔ جس سے ہر طرف بیداری کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ بیداری کی یہ لہر سب سے پہلے بنگال میں پیدا ہوئی۔ کلکتہ اور اس کے نواح میں نہ صرف تاجر اور فوجی افسران آئے بلکہ منتظمین، عیسائی مبلغین، اور سب سے زیادہ ایسے مبلغین آئے جو اپنے فن میں کمال رکھتے تھے۔ ان میں برطانیہ کے علاوہ فرانس، ہالینڈ، اور یوروپ کے دوسرے ملکوں کے لوگ بھی شامل تھے۔ اس کے ابتدائی اثرات ہندوستانیوں نے قبول کیے اور اہل علم نے یوروپ کی تقلید کو اپنا شعار بنایا۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ اثرات زائل ہونے شروع ہوئے۔ پھر بھی مغربی تہذیب نے زندگی کے جو نصب العین پیش کیے تھے وہ اب بھی سامنے تھے۔ اس کے ساتھ ہندوستان کے ماضی کی قدریں بھی روز بہ روز اجاگر ہوتی جا رہی تھیں۔ ٹیگور کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ انھوں نے جدید تہذیب کے مطالبات کو قدیم ہندوستانی اور عہد وسطی کی قدروں کو ترک کیے بغیر قبول کیا اور جوان روایات سے ہٹ گئے اور مغربی روایات کو قبول کر لیا، انھوں نے اپنی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا۔

رابندر ناتھ ہر کام کو بہتر انداز سے کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے وہ خود محنت اور جد و جہد کرتے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے۔ ان کی زندگی جب کسی ہموار دور سے اطمینان کے ساتھ گزرنے لگتی، تو وہ ایسا محسوس کرتے جیسے مقید ہو گئے ہوں۔ پھر وہ اسے چھوڑ کر ایک ایسے نئے راستے پر نکل پڑتے جہاں ان کی قوت تخلیق و اختراع کو اظہار کا موقع ملتا۔

وطن پرستی اور قومی شعور ٹیگور کو ورثے میں ملا تھا۔ سودیشی تحریک سے بھی ان کی وابستگی رہی۔ ٹیگور نے اپنی زندگی اور اپنے ادب کو محض قومیت تک محدود نہیں رکھا بلکہ ان کی فلسفیانہ بصیرت سے دیار ہند میں جس نشاۃ الثانیہ کی شروعات ہوئی اس نے ملکوں اور سرحدوں کے فاصلے مٹا دیے۔

رابندر ناتھ ٹیگور کی تخلیقات بین الاقوامی سطح پر پسندیدگی کی نظر سے دیکھی گئیں اور انھیں آفاقی شہرت بھی حاصل ہوئی۔ اس کے باوجود ان کی تخلیقات ہندوستانی عناصر کی بھینی بھینی خوشبو اور قومی جذبے سے سرشار ہیں۔ ٹیگور نے جو کردار تخلیق کیے ہیں وہ انتہائی معمولی درجے کے عام انسان ہیں لیکن ان کے حرکات و سکنات، غموں اور خوشیوں سے غیر معمولی بصیرت کا انعکاس ہوتا ہے۔ راجہ رام موہن رائے اور برہمو، سماج کی تعلیمات نے بھی ان کو متاثر کیا تھا۔ ان تعلیمات کے زیر اثر ان کے خیالات اور فکر میں وسعت پیدا ہوئی اور انھوں نے مغربی تہذیب کی اچھائیوں کو اپنانا ضروری سمجھا۔ انگریزوں کی آزادہ روی نے بھی ٹیگور کو بے حد متاثر کیا تھا۔ وہ یوروپ کے اعلیٰ تمدن اور اور بے شمار سائنسی ترقی کی تحسین کرتے تھے۔ انگریزوں کے ذریعے لائی ہوئی نئی تہذیب اور نئے علوم وفنون سے مستفید ہونے کی ترغیب دیتے تھے۔ انگریز مصنفوں خاص کر ورڈس ورتھ اور شیلی جیسے شاعروں کی تخلیقات بھی انھیں پسند تھیں کیوں کہ ان میں انسانی محبت، انصاف اور انسان کی آزادی جیسے موضوعات سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔

رابندر ناتھ ٹیگور کبھی سیاست داں نہیں رہے لیکن وہ ایک سیاسی مفکر ضرور تھے۔ ان کی حب الوطنی الگ نوعیت کی ہے۔ انسانیت کے لیے ان کے دل میں محبت کا جو جذبہ تھا اس نے انھیں اپنے ملک اور قوم سے بھی محبت کرنا سکھایا۔ افسانہ نگار بہر حال ایک فنکار ہوتا ہے اور اس لیے ان کی کوئی فنی تخلیق ان کی شخصیت کی رنگ آمیزی سے خالی نہیں ہو سکتی ہے۔ اس کے مصداق ان کے افسانے ہیں جن میں ان کی زندگی کے حالات و حوادث کے نقوش بھی ملتے ہیں۔

ٹیگور کے افسانوں کے پلاٹ بنگال کے ماحول سے ظہور میں آتے ہیں۔ بنگال کی دل موہ لینے والی ہریالی، ندی، پہاڑ، وادی، جنگل، چشمے، درخت، پرندے، موسم، ہوا، کشتی، کھیت، مزدور اور ملاح ان کے افسانوں میں روح ڈال دیتے ہیں اور ان کے دل و دماغ کی صداقت ان میں اثر پیدا کر دیتی ہے۔ سیکڑوں ایسے واقعات کو وہ افسانوں کا موضوع بناتے ہیں اور ان میں حقیقت کا رنگ بھر کر اپنی تخلیقی صلاحیت سے سحر آفرینی پیدا کر دیتے ہیں۔

ٹیگور نہ صرف فطرت کی رعنائیوں سے خود لطف اندوز ہوتے بلکہ اس میں دوسروں کو بھی شریک کرنا چاہتے تھے۔ ان کے افسانوں میں بھی وہی انفرادی حسن، فکر و نظر کی تازگی اور شاعرانہ حسن کاری ہے جو شاعری اور دوسری اصناف میں ان کی جمال آفریں شخصیت کے افسوں سے روح بن کر دوڑتی ہے۔

ٹیگور حق بینی اور حق شناسی سے کام لینے والے فنکار تھے، زندگی کو وہ حقیقی نقطہ نظر سے دیکھنے کے عادی تھے۔ وسیع القلب، بیدار مغز اور کشادہ فکر و نظر کے مالک تھے۔ وہ ایک ایسے ملک و معاشرے کی تشکیل چاہتے تھے جس میں انسان آزاد ہو، نہ کوئی ظلم کرنے والا ہو اور نہ کوئی ظلم سہنے والا ہو۔ ان کے یہاں مساوات انسانی کا مرتبہ سب سے مقدم ہے اور سماج کو تمام برائیوں سے پاک ہونے کی آرزو کرتے ہیں، جس میں نہ کسی قسم کی لوٹ ہو اور نہ بدعنوانی۔ یعنی ایک معمولی غریب بھی خوشحال زندگی بسر کرے۔

غرض کہ ٹیگور کے افسانوی ادب نے ملک کی ہر زبان کے فن کاروں اور ادیبوں کو شدت سے متاثر کیا ہے۔ ناول ہوں یا افسانے رابندر ناتھ نے ہمیں جو نئی چیز دی ہے وہ عوام کی زندگی اور ان کے روز مرہ مسائل کی حقیقت پسندانہ عکاسی ہے۔ ٹیگور سے پہلے ہمیں ناولوں اور افسانوں میں زمیندار، رئیس اور راجے مہاراجے ملتے ہیں لیکن کہیں کوئی عام آدمی کا کردار ابھر کر نہیں آتا۔ کسی کسان یا مزدور کا ذکر نہیں آتا۔ ٹیگور نے ہمیں ایسے لوگوں کی زندگی سے پہلی بار آگاہ کیا۔ ان کے کئی افسانوں میں شہزادیاں اور بنگال کی دیہاتی لڑکیاں ایک دوسرے کے شانہ بہ شانہ کھڑی دکھائی دیتی ہیں۔ ٹیگور کے افسانوں کا کمال یہ ہے کہ اس میں ایک طرف اعلیٰ خاندانوں کے افراد کو اور دوسری طرف نچلے اور غریب طبقے کے لوگوں کو جگہ دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عوام و خواص میں ان کے افسانے یکساں طور پر مقبول ہوئے۔

■

Siraj Anwar Md. Miran
Plot. No: 10 Near Sana School
Chaitantaya Nagar Taroda (BKD)
Nanded- 431605 (Maharashtra)
Mob.: 9021745378
sirajanwr98@gmail.com

شہزادی کلثوم کی شاعری

منظور احمد گنائی

وادی کشمیر میں اردو ادب کی آبیاری کرنے میں جہاں شعرانے اپنے جوہر لطیف سے نگارشات عالیہ میں اضافہ کیا، وہیں شاعرات نے بھی اپنے قیمتی جواہر پاروں سے ادب کو مالا مال کیا ہے۔ یہاں کے ادبی ماحول میں اردو کے بڑے بڑے شاعر پیدا ہوئے جن میں یقینی طور پر اگر چہ اردو شاعرات کی تعداد کم ہے لیکن اس کم تعداد نے ہی اردو ادب میں اپنی شناخت کو یقینی بنایا۔ شاید زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں عورت کا عمل دخل نہ ہو۔ انھوں نے فن کی پختگی اور خلوص وصداقت کے ساتھ اپنے تجربات، مشاہدات اور احساسات کا اس طرح اظہار کیا جسے واردات قلبی کی سچی ترجمانی کہا جاسکتا ہے۔ یہ بھی ایک سچ ہے کہ خاتون ادیبوں کو پہلے اتنی فکری صلاحیت اور آزادی حاصل نہیں تھی کہ وہ اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا برملا اظہار کرسکیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی ان کی جولانی طبع کے انتہائی نفیس اور اعلیٰ درجے کا ادب وجود میں آیا ہے۔ اردو غزل جسے ہر زمانے میں لعن طعن کا نشانہ بنایا گیا، لیکن یہاں کی شاعرات نے اردو شاعری میں اپنے فکری اثاثے سے ادب میں نئے زاویے تراشے ہیں۔ کشمیر میں جہاں تک اردو غزل کا تعلق ہے یہاں کی پہلی شاعرہ زینب بی بی محجوب کو تصور کیا جاتا ہے۔ ان کا شعری سرمایہ ''گلبن نعت'' کے نام سے شائع ہوا جس میں غزلوں کے علاوہ حمد، نعت اور منقبت پر بھی تذکرہ ملتا ہے۔ یہاں یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کچھ محققین نے انھیں ریاست جموں وکشمیر میں اردو کی پہلی غزل گو شاعرہ کے طور پر یاد کیا ہے اور یہ بڑی حد تک درست ہے۔

یہاں اس بات کا تذکرہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ریاست جموں وکشمیر کے لوگ ہندوستان کے مختلف شہروں میں روزگار، تجارت اور دیگر ضروریات کے لیے سفر کرتے رہے۔ لیکن کچھ حضرات تجارت اور روزگار کے لیے بہت مدت تک کچھ شہروں میں آباد ہوکر رہ گئے۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ تجارت کے سلسلے میں کسی شہر میں رہ کر وہ وہاں کا مستقل شہری بن گیا بلکہ حقیقت کچھ اور ہے۔ اسی تجارت کے سلسلے میں شہر سرینگر کا ایک خاندان راجستھان کی راجدھانی جے پور جا کر شال وغیرہ کا کاروبار کرنے کے لیے مقیم ہوا۔ مختلف محققین کا خیال ہے کہ وادی کشمیر میں اردو غزل کا نام جس صاحب فہم اور روشن خیال شاعرہ پر جاتا ہے وہ شہزادی کلثوم ہی ہے۔ شہزادی کلثوم اردو ادب میں بالخصوص جموں وکشمیر کے ادبی دبستان میں یگانہ روزگار تھیں۔ ان کا اصلی نام شہزادی کلثوم اور تخلص کلثوم تھا۔ ان کی پیدائش جے پور راجستھان میں ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں 1928 میں ہوئی۔ دستور کے مطابق ابتدائی تعلیم حاصل کی لیکن 1949 میں محض اکیس سال کی عمر پاکر سرینگر میں انتقال کرکے اپنے حقیقی مالک سے جا ملی۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ کچھ محققین نے شہزادی کلثوم کو راجستھان کی شاعرہ قرار دیا ہے لیکن کشمیر کے کچھ محققین نے انھیں وادی کشمیر سے تعلق رکھنے والی شاعرہ کے طور پر یاد کیا ہے۔ اس سلسلے میں عبدالقادر سروری نے اپنی کتاب ''کشمیر میں اردو'' میں اس بات کو ثابت کیا ہے کہ شہزادی کلثوم وادی کشمیر کی ایک اہم شاعرہ تھیں۔ اس بات کی تصدیق مندرجہ بالا سطور سے خوب ہوجاتی ہے۔ جہاں ایک طرف راجستھان کے محققین انھیں جے پور کی شاعرہ مانتے ہیں لیکن اس ذیل میں شاہد احمد جمالی کا موقف زیادہ معتبر معلوم ہوتا ہے:

''1947 میں آپ بیمار ہوئیں۔ جب طبیعت سنبھل نہ سکی تو کشمیر کے شہر سرینگر اپنے بھائی کے ہمراہ چلی گئیں۔ یہ شہر آپ کے بزرگوں کا قدیم شہر ہے۔ یہاں کی آب وہوا میں معمولی راحت ملی۔ دو سال کے اندر بیماری کی ہی حالت میں عین عالم شباب میں 21 سال کی عمر پاکر 1949 میں وادیِ کشمیر میں انتقال کیا۔''

(شاہد احمد جمالی، چند شاعرات راجستھان اور کچھ بھولے بسرے شعرا، ص:34-35)

اس بات کی مزید وضاحت بابائے جمالیات اور صدر شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی ڈاکٹر شکیل الرحمن نے کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ:

''شہزادی کلثوم ریاست جموں وکشمیر کی پہلی اردو شاعرہ ہیں اور شاید اس وقت تک آخری بھی۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ انھیں ادبی ماحول اور ادبی محفلوں اور مشاعروں سے استفادہ کا کبھی کوئی موقع نہیں ملا۔''

(یادگار کلثوم 1962، دیباچہ از ڈاکٹر شکیل الرحمن، ص:15)

مندرجہ بالا اقتباسات سے پتہ چلتا ہے کہ شہزادی کلثوم وادی کشمیر سے تعلق رکھتی تھیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ڈاکٹر شکیل الرحمن شہزادی کلثوم کے شعری مجموعے کے دیباچے میں کیسے اس بات کو درج کرتے کہ کلثوم وادیِ کشمیر کی پہلی غزل گو شاعرہ ہیں، جس نے بہت کم عمر پاکر اس دنیائے فانی سے کوچ کیا۔ ان دلائل سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ شہزادی کلثوم کشمیر کی پہلی غزل گو شاعرہ

تھیں جنھوں نے کم عمری میں ہی اپنا شعری مجموعہ تخلیق کیا۔ عالم شباب میں انتقال کرنے کے باعث وہ اپنا شعری کلام شائع نہ کرسکی۔ شہزادی کلثوم کا شعری مجموعہ ''یادگار کلثوم'' کے نام سے 1962 میں ان کے برادر اکبر نے مرتب کر کے شائع کیا۔

شہزادی کلثوم ادبی حلقوں میں ایک شاعرہ کے طور پر متعارف ہوئیں۔ انھوں نے زندگی کے قلیل عرصے میں شاعری کی اور شاید وباید محض پانچ سال تک اپنے خیالات قلبی جذبات کی سچی ترجمانی کرتی رہی۔ لیکن انہی پانچ سال کی مدت میں انھوں نے اردو غزل میں اپنے فنی نقطہ نظر سے ایک نیا انداز ایجاد کیا۔ ان کے مجموعہ کلام میں غزلیں، نظمیں، نعت اور منقبت شامل ہیں۔ اردو میں ان کی پہچان ایک شاعرہ کے طور پر ہے اور شاید ان کی غزل گوئی کا پلڑا ہی باقی کلام پر بھاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں وہ تمام فنی وفکری لوازمات نظر آتے ہیں جو ایک کامیاب غزل گو شاعرہ کے کلام سے مطلوب ومقصود ہیں۔ ان کی غزلوں میں جہاں فلسفہ تصوف، الہام اور آورد کا احساس ملتا ہے وہیں دوسری طرف زمانے کی نابرابری، دردوکرب، انتشار، موت، تقدیر، قسمت، عشق حقیقی ومجازی، استحصال اور انسان کی زبوں حالی پر غزلیں ملتی ہیں۔ ان کی غزل گوئی میں تشبیہات واستعارات کے ساتھ ساتھ نادر تلمیحات کا بھی خوب استعمال کیا گیا ہے۔ ان کے کلام کو پرکھتے ہوئے مختلف ناقدینِ فن نے جس انداز سے اپنی رائے پیش کی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ عالم جوانی میں ایک نوجوان شاعرہ کے ظاہری وباطنی احساسات فی البدیہہ وجود میں آسکتے ہیں۔ اس بات سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایک کامیاب اور فنی پیچیدگیوں پر مہارت رکھنے والی شاعرہ تھیں، جن کی فنی مہارت کا اعتراف واقرار بڑے بڑے نقادوں نے کیا ہے۔

شہزادی کلثوم ایک کشادہ ذہن، وسیع القلب، فکروفن کی بلندیوں کو چھونے والی خوش گو شاعرہ تھیں۔ ان کی شاعری میں تصوف کے اعلیٰ نمونے بھی مل جاتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں فکروفن کی بلندی، شدت جذبات، اظہار، جوش، اجتماعی فکروا حساس، تخیل کی بلند پروازی، احساس کی گہرائی، حسین ودلکش الفاظ کی روانی اور سادہ بیانی بدرجہ اتم موجود ہے۔ اردو غزل ونظم کے ساتھ ساتھ انھوں نے اردو سلام میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی غزلیں متنوع موضوعات پر مشتمل ہیں اور شاید اسی لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی غزلوں میں ذہنی اور فکری میلانات کا ایک لامتناہی سلسلہ مل جاتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر یوں کہا جاسکتا ہے کہ غزلوں میں مثبت خیالات، نشست الفاظ اور سلاست وروانی ایسی خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے ان کی غزلیں ادب پر اپنا نقش ثبت کرنے میں کامیاب ہوچکی ہیں۔

ان ہی خیالات اور احساسات کی صداقتوں کی ترجمانی، مع مکمل تفسیر وتشریح نہ صرف ذہن کے دریچے وا کرتی ہے بلکہ وارفتگی دل کا بھی خیال ملتا ہے۔ اس بات کا صحیح اندازہ ان کے کلام سے لگایا جاسکتا ہے۔

جب اہل وطن کو عشق کا عرفان ہوگیا
حسن فریب کار پشیمان ہو گیا
آرہی ہے میری آنکھوں میں سمٹ کر کائنات
خواب پورا ہوچکا اب وقت ہے تعبیر کا
نکلا نہ بعد مرگ بھی سینے سے تیر ناز
دل میں ادھر چبھا ادھر ارمان ہو گیا

غزل میں ان کے یہاں کلاسیکی شعرا کی پرچھائیں خوب نظر آتی ہے اور نظم عہد جدید کے میلانات سے مملو ہے۔ لیکن کلثوم کو جس صنف کی وجہ سے شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ غزل ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید کلثوم غزل کے سبھی فنی وادبی لوازمات اور اس کے آداب واسلوب نگارش سے بخوبی واقف تھیں۔ گویا کلثوم نے اساتذہ فن کی نازک خیالی، زبان کا رچاؤ، طرز نگارش، لب ولہجے کی فراوانی کے ہوتے ہوئے شعر کہے ہیں۔ بعض اشعار میں تو ان کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں جو اسلوب اور لب ولہجے کے تیکھے پن سے ہمارے دلوں کو مسحور کر لیتے ہیں۔

نہ ملی پناہ دل کو تیرے حسن بے اماں سے
مری حسرتوں کو رویے کوئی کہہ دے نوحہ خواں سے
سوئے دل جو نگاہ ہوتی ہے
بخدا بے پناہ ہوتی ہے
سر اٹھا تھا نہ ابھی سجدوں سے
سامنے ان کا آستانہ تھا
ڈگمگاتا ہے دل جہاں کلثوم
وہ محبت کی راہ ہوتی ہے

شہزادی کلثوم کی فنی اور فکری بصیرتوں کے مینار کافی بلند اور اعلیٰ تھے مگر افسوس کہ وہ کم سنی میں ہی انتقال کر گئیں۔ لیکن پھر بھی انھوں نے جو مختصر سا شعری سرمایہ یادگار چھوڑا ہے وہ چیز دیگر معلوم ہوتی ہے۔ ان کا کلام مختصر ہی صحیح لیکن متلاطم ضرور ہے۔ ان کے بارے میں کشمیر کے ایک مشہور شاعر ایاز رسول نازکی لکھتے ہیں:

''کشمیر کے اردو شعری افق پر جو خواتین نہایت آن بان کے ساتھ روشن ہوئیں ان میں ایک نام اپنی کم عمری میں ہی انتقال کرنے والی ''شہزادی کلثوم'' کا بھی ہے۔''

(مشمولہ ''شیرازہ، جموں وکشمیر اردو شاعری نمبر''، جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر کشمیر، جلد 52، شمارہ 6-7، ص:84)

جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جاچکا ہے کہ کلثوم کی شاعری متنوع موضوعات کی حامل ہے۔ ان کی شاعری میں مدحت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی مضامین ملتے ہیں۔ گویا یوں کہا جاسکتا ہے کہ کلثوم کے دل میں ابتدا سے ہی اسلام اور اسلام کے متعلقات ومنسلکات کی عظمت ورفعت موجود تھی۔ انھوں نے جگہ جگہ پر اشارے دیے ہیں کہ ان کی زندگی حسن وعشق کی سچی تصویریں پیش کرتی ہیں۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ ان کے دل میں انسان کامل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور عظمت اپنی انتہاہ گہرائیوں کے ساتھ رچی بسی ہے۔ ان کے اشعار میں حضرت علیؓ سے والہانہ محبت وعقیدت کا اظہار خوب نظر آتا ہے۔ چند اشعار پیش ہیں:

مٹتے مٹتے کہہ رہا ہے موج دریا سے حباب
میرے دم کے ساتھ ہے رشتہ میری تعمیر کا
ہوں غبار کارواں منزل عشق علی
خاک ہے نظروں میں میری مرتبہ اکسیر کا
آرزو کلثوم کی بس یہ ہے بہر پنج تنؑ
دیکھ لے آنکھوں سے روضہ حضرت شبیرؑ کا

کلثوم کے کلام میں تصوف کے اعلیٰ نمونے بھی ملتے ہیں۔ یعنی تصوف کے وہ مسائل جو اردو کے تقریباً سبھی شعرا کے یہاں موجود ہیں۔ کلثوم نے بھی اپنے کلام میں ان خشک اور پیچیدہ مسائل پر اظہار خیال کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے اس بات کا پختہ یقین ہوتا ہے کہ وہ کسی حد تک اپنی زندگی سے مایوس نظر آرہی تھیں۔ مطلب یہ کہ ان کی زندگی میں حسرت ویاس، ناامیدی، خوابوں کی شکستہ تعبیر، ویرانی اور قنوطیت کا عنصر غالب نظر آرہا ہے۔ زمانے کی کرب ناکی، انتشار، جنگ آزادی کی تلاش وجستجو، معصوموں کا قتل عام، انگریزوں

کا ظلم وستم، استحصال اور لوگوں کے خودغرضانہ رویے نے انھیں قدرے مایوس کیا ہے، جس کا تذکرہ ان کے کلام میں ہر سطح پر ملتا ہے۔ان کا کلام پڑھ کر انسان کی بے بسی و بے کسی آنکھوں کے سامنے عیاں ہو جاتی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

مایوسیوں نے حسرت و ارماں مٹا دیے
کیسا یہ گھر بھرا تھا کہ ویران ہو گیا

اب تک ہے میرے دل میں وہی حشر آرزو
بھولی نہیں ہوں آپ کی پہلی نظر کو میں

میرا حال تباہ سن لیجیے
یہ حکایت نہیں حقیقت ہے!

ابتدا جس کی موت ہے اے دل
اس محبت کی انتہا بھی مانگ!

مرنا نہ میرا مرنا ، جینا نہ میرا جینا
پھر کیوں گنا رہا ہے کوئی مری خطائیں

شہزادی کلثوم اردو کے کلاسیکی شعرا میں میر، غالب اور اقبال سے براہ راست متاثر نظر آتی ہیں۔ان کی کلاسیکی شاعری میں چونکہ منطقی اور استدلالی طور طریقے سے 'زمانہ' کی تراش خراش ہوئی۔اردو کی کلاسیکی شاعری مختلف نظریے اور فکر (Attitudes) کی چھان پھٹک کے بعد وجود میں آتی ہے۔گویا ایک روح بے چین نظر آتی ہے جس کی وجہ سے تلاش وجستجو، شوق وآرزو، استعجاب، بے خودی، حوصلہ اور ہمت گویا ایک دائرے میں چھوٹے چھوٹے کئی دائرے ملتے ہیں۔ان کا کلام پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کلثوم سوال وجواب کا پیرایہ اختیار کر کے ایک نیا انداز اختیار کرنا چاہتی تھی۔گویا کلثوم سوال کرتی ہیں اور کوئی دوسرا جواب دے کر بات کو مکمل کر لیتا ہے۔یعنی ایک مکالماتی فضا ہے۔ان کے کلام میں ایسے بہت سے اشعار ہیں جن میں سوال وجواب کا انداز مل جاتا ہے۔کچھ اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

کعبہ نہیں، کلیسا نہیں، دیر بھی نہیں
پھر کیا سمجھ رہی ہوں تری رہ گزر کو میں؟

کرو تم لاکھ تدبیریں تو کیا ہے
وہی ہوگا جو قسمت کا لکھا ہے

تعبیر اس کی حشر ہے، کس کو خیال تھا؟
اتنا اہم نہ سمجھی تھی خواب سفر کو میں؟

خار وگل ہی میں الجھ کر رہ گئی میری نظر
کب یہ ہم آہنگی سود و زیاں سمجھی تھی میں!

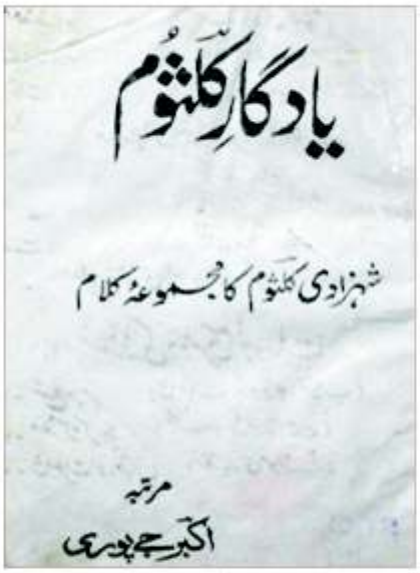

ہر قطرہ ہے تلاطم دریا کی یادگار
ہر ذرہ ہے مواد بیاباں لیے ہوئے

محو تھی یاد یار میں کلثوم
موت کب آگئی خدا جانے!

ان اشعار کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کلثوم نے اپنے قلبی حالات وجذبات کو جس فنی چابکدستی کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔گویا ان کی زندگی کی داستان شکستہ دل کی داستان ہے اور زمانے کے کرب وانتشار کو بھی انھوں نے اپنے کلام میں بیان کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ان کی شاعری گویا اپنے تمام داخلی وخارجی معاملات کو اپناتے ہوئے دل کی داستان پیش کرتی ہے۔ کلثوم کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر شکیل الرحمن ''یادگار کلثوم'' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''شہزادی کلثوم کی شاعری کی عمر ان کی اپنی عمر سے اتنی کم ہے کہ صورت ومعنی کے ارتقا کا کوئی خیال بھی پیدا نہیں ہوتا۔غالباً اس شاعری کی عمر صرف پانچ سال ہے۔یہ صرف ایک اشارہ، ایک ادا اور ایک پیکر ہے۔یہ پہلا زینہ بھی نہیں کہا جاسکتا، یہ صرف ایک تبسم اور ایک گہرا نقش ہے۔''

(پروفیسر شکیل الرحمن، پیش لفظ ''یادگار کلثوم'' 1962، ص:15)

شہزادی کلثوم زندگی سے کسی حد تک مایوس نظر آتی ہیں اور ان کے کلام میں احساس کمتری کا مادہ جنم لینے لگتا ہے۔ان کی زندگی آلام ومصائب میں گزری، اسی لیے ان کے اکثر اشعار میں زندگی کی شکست وریخت کا انداز ہوتا ہے۔وہ اپنی قسمت سے اتنی نالاں تھیں کہ ان کے چھونے سے گوہر بھی سیاہ پتھر بن جاتا ہے۔انھوں نے اپنے اشعار سودا اور آتش کی زمینوں میں موزوں کیے ہیں۔ان شعرا کی اتباع میں لکھے گئے دو اشعار مثال کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔

جان دے دی یہ کہہ کے عاشق نے
تو نے دی ہے تیری امانت ہے

طور سے پوچھ اہل طور سے پوچھ
طالب دید کی سزا کیا ہے

آج کل کچھ ایسا برگشتہ ہوگیا
لعل چھوتے ہی میری قسمت سے پتھر ہوگیا

شہزادی کلثوم نے اردو غزل میں اپنی قلبی واردات، محسوسات اور جذبات کو زیادہ تر اخلاق کی تربیت میں پیش کیا ہے۔ان کی شاعری کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے بعض شاعرات کی طرح تذکیر کے نقرئی اور روایتی بستے میں رہنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اپنے لہجے میں مضمون آفرینی اور خیال کی جدت سے شاعری کو بلند سے بلند مقام عطا کیا۔ ان کے کلام کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ کم لکھنے کے باوجود اردو شاعری میں ایک منفرد طرز کی شاعرہ ہیں۔ان کی شاعری میں رومانیت کا عنصر نہ ہونے کے برابر ہے۔ بلکہ عشق ومحبت کو ایک نیا موڑ دینے کی ہمیشہ جستجو رہتی تھی، اخلاقیات کا درس جگہ جگہ نظر آتا ہے۔وہ بار بار اس بات کا احساس دلاتی ہیں کہ:

غیروں پہ بھروسہ ہو، تعجب کا محل ہے
اپنا بھی برے وقت میں اپنا نہیں ہوتا

دشمن پہ بھی اللہ، برا وقت نہ ڈالے
غربت میں تو سایہ بھی ہمارا نہیں ہوتا

بہرحال شہزادی کلثوم وادی کشمیر کی ایک فعال اور شعروشاعری میں نئی جہتیں پیش کرنے والی ایک شاعرہ تھیں۔جنھوں نے اپنی قلیل المدت زندگی میں اپنی عظمت کا لوہا منوایا ہے۔ انھوں نے اردو شاعری میں جس فکر کی طرف لوگوں کے اذہان کو متوجہ کیا وہ جلی حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ انھوں نے اردو شاعری کو خلوص، صداقت اور زبان کی سادگی سے مالا مال کر دیا۔

■

Dr. Manzoor Ahmad Ganie
Deptt.of Urdu Govt Degree College for Women Anantnag (Kashmir)
Pin:192124
Ph No:6005903959
E-mail: mganie283@gmail.com

پنکج کمار

راجا نرسنگھ راج عالی کی غزلیہ شاعری

حیدرآباد کی روشن فضاؤں میں اردو ادب کے جہاں کئی غیر مسلم شعرا و ادبا ایسے ہیں جو اپنی روشنی سے محفلوں کو منور کرتے ہیں۔ ان میں داموروز، جانکی ناتھ پرشاد، کنول پرشاد، محبوب نرائن اور دیگر قابل ذکر شخصیات شامل ہیں۔ اسی تابناک ادبی افق میں بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں راجہ نرسنگھ عالی نے قدم رکھا اور اپنی تخلیقات سے اردو کے شعری خزانے میں وہ اضافہ کیا جو آج بھی محافل ادب کی روشنی کا سبب ہے۔

راجہ نرسنگھ عالی نے اپنی زندگی کے 1892 سے 23 جون 1957 تک کے عرصے میں حیدرآباد کی ادبی فضا کو اپنی گراں قدر خدمات سے زرخیز بنایا۔ وہ راجہ گردھاری پرشاد محبوب نواز کے مایہ ناز فرزند تھے، جنہوں نے نہ صرف شاہی محل کے امور کی نگرانی کی بلکہ خانساماں کے فرائض بھی احسن طریقے سے انجام دیے۔ کمسنی میں والد کی وفات کے بعد انھیں اور ان کے بھائیوں کو اسٹیٹ کورٹ آف وارڈ کی خصوصی نگرانی میں رکھا گیا، لیکن اپنی محنت اور صلاحیت سے تمام امور بحسن و خوبی سنبھالے گئے۔ میر محبوب علی خان آصف نے 1900 میں راجہ نرسنگھ عالی کو ''راجہ بہادر'' کے خطاب سے نوازا، جو ان کی خدمات اور مقام کی روشن علامت ہے۔

راجہ نرسنگھ راج عالی نے ابتدا میں ہندی، مراٹھی اور فارسی زبان کی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ بعد ازاں مدرسہ عالیہ میں داخلہ لے کر میٹرک تک تعلیم مکمل کی۔ ان کی ادبی بصیرت کا مظاہرہ فارسی رباعیات کے اردو ترجمے میں بھی نظر آتا ہے، جو ان کے شعری ذوق اور زبان دانی کی اعلیٰ مثال ہے۔

ادبی میدان کے ساتھ ساتھ راجہ نرسنگھ عالی نے سرکاری امور میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ 1919 میں وہ مہتمم سیونگ بینک اور نظامت ٹپہ کے فرائض سرانجام دے چکے تھے اور دیگر محکمہ جات میں بھی ان کی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ ان کے انتظامی اور سماجی کردار نے ان کی ہمہ جہت شخصیت کو اجاگر کیا، جس کا اثر نہ صرف ادبی محافل بلکہ حیدرآباد کی ثقافتی فضاؤں پر بھی پڑا۔

راجہ نرسنگھ عالی کی شخصیت خلوص و یگانگت، وسیع النظری، انسان دوستی اور ایثار کا مجسمہ تھی۔ وہ نہ صرف شعری محافل کے علمبردار تھے بلکہ حب الوطنی اور تہذیبی اقدار کے مضبوط حامی بھی تھے۔ ان کی موجودگی میں حیدرآبادی ادبی محافل کی رونق دور دور تک پھیلتی اور شہر کے ادبی منظرنامے کو روشنی بخشتے۔

دیوان عالی کو ڈاکٹر شیلا راج نے نہایت محنت اور تحقیق کے ساتھ مرتب کیا ہے، جس سے کلاسیکی شاعری کے ادبی و فکری پہلو واضح ہوتے ہیں۔ یہ تدوین قاری کو شاعر کے اسلوب اور زبان کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ یہ کتاب ایس۔اے۔آفسٹ پرنٹرز، حیدرآباد سے شائع ہوئی ہے۔ اس دیوان میں غزلیں، نظمیں، مرثیے، مثنوی اور دیگر شعری اصناف بھی شامل ہیں۔ ہم نے اپنی تحقیق و مطالعے کو صرف غزلیہ شاعری تک محدود رکھا، جہاں جذبوں اور احساسات کی باریک ترجمانی کا گہرائی سے جائزہ لیا۔ غزل کے فنی و جمالیاتی پہلوؤں کو سمجھنے کی شعوری کوشش رہی۔

تنقیدی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو راجہ نرسنگھ عالی کی شاعری میں کلاسیکی اور جدید رجحانات کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ ان کا کلام نہ صرف مقامی ثقافت اور تہذیبی رنگ سے لبریز ہے بلکہ فارسی و ہندی ادب کی لطافت اور تراکیب بھی اس میں نمایاں ہیں۔ ان کی ادبی خدمات ہمیں یہ پیغام دیتی ہیں کہ ادب صرف شعر و نثر نہیں، بلکہ اخلاق، تہذیب، انسان دوستی اور سماجی شعور کا مظہر بھی ہوسکتا ہے۔

وصل کی شب میں چند بوسوں کا
معاف کیجیے حساب کیا کرنا
دل کا ستانا جرم ہے دل کا دکھانا کفر ہے
کعبہ خدا کا جان اسے اس کو کبھی نہ ڈھائے جا
دل کو تم صاف کرو یہ ہے اللہ کا گھر
یہی معبد، یہی مسجد، یہی مندر اپنا
فقیری تو ہے بادشاہی سے بڑھ کر
نہیں اس میں کچھ بھئے کسی سے نہ ڈرنا
سر میں ہے عشق، سر جدا نہ ہوا
فرض عاشق ابھی ادا نہ ہوا
ہر درد پر تڑپ تھی یہاں برق کی طرح
اچھا ہوا کہ سینے میں اب دل نہیں رہا
خلش بغیر یہاں موسم بہار آیا
چنے جو پھول تو پھولوں کے ساتھ خار آیا
عشق میں مرنا تو ہے معمولی کام
زخم دل تو نے سیا اچھا کیا

یہ اشعار بظاہر مختلف کیفیات، لہجوں اور موضوعات پر مشتمل نظر آتے ہیں، مگر ان سب کے باطن میں ایک ہی فکری دھارا بہتا ہے: عشق بطور اخلاقی، روحانی اور وجودی تجربہ۔ یہ کلام محض جذباتی اظہار نہیں بلکہ شعوری طور پر تشکیل دی گئی ایک فکری دنیا ہے جہاں دل مرکز کائنات بن کر ابھرتا ہے، عقل پس منظر میں چلی جاتی ہے اور مذہب، اخلاق اور انسانیت ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں۔

وصل کی شب میں بوسوں کے حساب سے انکار دراصل اس بات کا اعلان ہے کہ عشق کو پیمانوں میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ شاعر یہاں لذت وصل کو ریاضیاتی منطق سے آزاد کر کے انسانی تجربے کی اس سطح پر لے جاتا ہے جہاں جذبہ اپنی مکمل خود مختاری میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ یہ رویہ کلاسیکی اردو غزل کی اس روایت سے جڑا ہے جہاں عشق ہمیشہ عقل سے بغاوت کرتا رہا ہے، مگر یہاں یہ بغاوت شوخی نہیں بلکہ شعوری انتخاب بن جاتی ہے۔

دل کو کعبہ قرار دینا اور دل شکنی کو کفر سے تعبیر کرنا، ان اشعار کو محض رومانوی نہیں رہنے دیتا بلکہ اخلاقی احتجاج میں بدل دیتا ہے۔ شاعر مذہبی علامات کو ان کی رسمی حیثیت سے نکال کر باطنی معنویت عطا کرتا ہے۔ یہاں خدا تک رسائی کا راستہ عبادت گاہ نہیں بلکہ انسان کا دل ہے۔ یہ فکر تصوف کی اس روایت سے ہم آہنگ ہے جہاں انسان کی حرمت سب سے بڑا مقدس اصول ہے۔

دل کو معبد، مسجد اور مندر قرار دینے والا شعر وحدت ادیان کا نعرہ نہیں بلکہ وحدت انسانیت کا اعلان ہے۔ شاعر مذہب کو تقسیم کے بجائے تطہیر کا ذریعہ بناتا ہے۔ دل کی صفائی یہاں محض اخلاقی اصطلاح نہیں بلکہ ایک مکمل فکری موقف ہے جو خارجی عبادت کو داخلی سچائی کے تابع کر دیتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں شاعری مذہبی مکالمے میں مداخلت کرتی ہے اور اسے انسان دوست رخ عطا کرتی ہے۔

فقیری کو بادشاہی پر فوقیت دینا، طاقت اور اقتدار کے مروجہ تصورات کو منہدم کرتا ہے۔ یہ شعر معاشرتی ڈھانچے پر خاموش مگر گہری ضرب ہے۔ شاعر کے نزدیک اصل اقتدار خوف سے آزادی ہے، اور فقیری اسی آزادی کی علامت ہے۔ یوں یہ کلام محض روحانی نہیں بلکہ سماجی شعور کا بھی حامل بن جاتا ہے۔

عشق کو فرض قرار دے کر شاعر خود احتسابی کی ایک نئی سطح قائم کرتا ہے۔ سر کا سلامت ہونا یہاں ناکامی کا استعارہ ہے، جو اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ عشق محض دعوے سے مکمل نہیں ہوتا۔ یہ شعر عاشق کو اس کے رومانوی خمار سے نکال کر قربانی کے کڑے معیار پر پرکھتا ہے۔

دل کے نہ رہنے کو راحت قرار دینے والا شعر جدید انسان کی داخلی تھکن کا بیان ہے۔ مسلسل درد اور تڑپ نے احساس کو بوجھ بنا دیا ہے۔ یہ شعر ہمیں بتاتا ہے کہ بعض اوقات بے حسی بھی بقا کی ایک صورت بن جاتی ہے۔ یہ جدید حسیت کی نمائندگی کرتا ہوا کلام ہے جہاں شدت احساس خود اپنے خلاف دلیل بن جاتی ہے۔

بہار اور کانٹوں کا ساتھ آنا زندگی کی اس تلخ حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ خوشی ہمیشہ خالص نہیں ہوتی۔ یہ شعر رومانوی فریب کو توڑ کر تجربے سے پیدا ہونے والی دانش کو سامنے لاتا ہے۔ شاعر یہاں حسن اور الم کو لازم و ملزوم قرار دیتا ہے۔

آخری شعر میں عشق میں مرنے کو معمولی اور زخم سینے کو بڑا عمل قرار دینا، پورے متن کا فکری حاصل بن جاتا ہے۔ یہاں عشق خودترسی، شور یا ہلاکت نہیں بلکہ ضبط، تسلسل اور شعوری بقا کا نام ہے۔ شاعر عشق کو ایک بالغ اخلاقی تجربہ بنا دیتا ہے۔

مجموعی طور پر یہ اشعار اردو شاعری کی اس روایت سے جڑے ہیں جہاں عشق، تصوف اور اخلاق ایک دوسرے سے جدا نہیں۔ یہ کلام نہ صرف دل کو مخاطب کرتا ہے بلکہ قاری کے فکری ضمیر کو بھی جھنجھوڑتا ہے۔ یہی اس شاعری کی اصل تنقیدی قوت ہے۔

سلیمان اطہر جاوید یوں لکھتے ہیں:

''عالی کے مزاج میں تصوف کی کارفرمائی رہی ہوگی اور اردو کی کلاسیکی شاعری، فقرا اور اہل اللہ کی صحبتوں سے بھی انھوں نے فیض اٹھایا۔ چناں چہ تصوف عالی کی شاعری کے اہم موضوع کے بطور ہے۔''

(دیوان عالی، ص 11، سلیمان اطہر جاوید)

سکھایا تو نے ہی مجھ کو طریق مے نوشی
اے شیخ تیری ہی صحبت نے بادہ خوار کیا
مرغن امیری غذائیں ہیں بے حظ
ہے اک کافی روکھی سی نان محبت
بڑی مشکل سے وہ راضی ہوئے تھے حال دل سننے
یہ قسمت ہے کہ وہ آئے ہیں اب خواب گراں ہو کر
نگاہ شوق ہر صورت میں تجھ کو دیکھ لیتی ہے
گرفتار محبت مست ہے بے خانماں ہو کر
ڈرو نہ وقت مصیبت سے، آفتوں کو سہو
یہی ہے حکم مشیت کسی کو کیا معلوم
دیکھی ہے کب کسی نے یہ آہ و فغاں کہاں
لگتی ہے آگ دل میں مگر ہے دھواں کہاں
برباد دل ہے اس میں تمناؤں کو نہ ڈھونڈ
اجڑی ہوئی سی بستی میں آبادیاں کہاں

یہ اشعار بطور مجموعی ایک ایسے شعری بیانیے کی تشکیل کرتے ہیں جس میں عشق، رندی، اخلاقی زوال، باطنی کرب اور تقدیر باہم پیوست ہو کر ایک فکری وحدت پیدا کرتے ہیں۔ شاعر محض جذبات کا اظہار نہیں کرتا بلکہ سماجی و اخلاقی تضادات کو شعری تجربے میں ڈھال دیتا ہے۔ غزل کی کلاسیکی روایت یہاں برقرار بھی ہے اور اس پر سوال بھی قائم کیا گیا ہے، جو اسے محض تقلید کے دائرے سے نکال کر تنقیدی سطح تک لے جاتا ہے۔

ان اشعار میں زہد اور رندی کی کشمکش محض مذہبی یا اخلاقی بحث نہیں رہتی بلکہ سماجی منافقت کی علامت بن جاتی ہے۔ شیخ کی صحبت سے مے نوشی سیکھنا اور صدر بزم زہد کا تماشا بن جانا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ طاقت، تقدس اور وعظ اکثر اپنے الٹ نتائج پیدا کرتے ہیں۔ شاعر یہاں اخلاقیات کے رسمی ڈھانچے کو منہدم کرتا ہے اور یہ سوال اٹھاتا ہے کہ اصل فساد کہاں سے جنم لیتا ہے— گناہ سے یا ریا سے۔ محبت کے اشعار میں قناعت اور داخلی سچائی کو فوقیت دی گئی ہے۔ مرغن امیری غذاؤں کے مقابلے میں روکھی نانِ محبت کا تصور اس امر کو واضح کرتا ہے کہ روح کی تسکین مادی فراوانی سے نہیں بلکہ خلوص سے وابستہ ہے۔ یہی فکر خواب اور نگاہ شوق کے اشعار میں بھی جلوہ گر ہے، جہاں وصال ایک خارجی واقعہ نہیں بلکہ ایک ذہنی اور وجدانی کیفیت بن جاتا ہے۔ داخلی کرب اور خاموشی ان اشعار کا ایک اہم حوالہ ہے۔ آہ و فغاں کے بغیر جلتے دل اور اجڑی بستی جیسے استعارے اس بات کی دلیل ہیں کہ شاعر شور نہیں بلکہ سکوت کے ذریعے شدت احساس پیدا کرتا ہے۔ یہ رویہ جدید شعری حسیت سے قریب ہے، جہاں درد کی بلند آواز نہیں بلکہ اس کی گہرائی معنی خیز ہوتی ہے۔

تقدیر اور مصیبت پر مبنی شعر مجموعے کو ایک اخلاقی اور فکری توازن عطا کرتا ہے۔ یہاں صبر کو کمزوری نہیں بلکہ

شعوری انتخاب کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ حکم مشیت کا حوالہ انسانی علم کی حد بندی کو واضح کرتا ہے اور شاعر قاری کو تسلیم و رضا کے ایک باوقار مقام تک لے جاتا ہے۔

بطور مجموعی یہ اشعار انکار، اعتراف اور آگہی کے مراحل سے گزرتے ہوئے ایک مربوط فکری کُلّیہ تشکیل دیتے ہیں۔ شاعر روایت سے جڑا رہتے ہوئے اس پر تنقیدی نگاہ ڈالتا ہے، جس کے باعث یہ شاعری نہ صرف جذباتی طور پر مؤثر بلکہ فکری طور پر بیدار کرنے والی بن جاتی ہے۔ یہی اس مجموعے کی اصل ادبی قوت اور معنوی تازگی ہے۔

دل کی زد میں پارسائی کیا کروں
بندہ بت ہوں خدائی کیا کروں
نہ کھلنے پائے کبھی راز تیری محفل کا
تمام پردوں کو ارض و سما کے سیتا ہوں
نہ ہے بہار کی حسرت نہ ہے غم صرصر
میں نام لے کے تیرا شب و روز جیتا ہوں
قوم میں اب کہاں ہے علم و ادب
ہائے مکتب کو دیکھتا ہوں میں
ضیائے داغ دل کام آ گئے شب ہائے ہجراں میں
کہ ایسی روشنی ہوتی نہیں شمع شبستاں میں
جو نکلے کوئے جاناں سے ہوا معلوم یہ ہم کو
ہوئے واپس گلستاں سے ہوئے داخل بیاباں میں
تم حقارت سے نہ دیکھو کسی چھوٹے کو یہاں
یاں شجر ہوتے ہیں پنہاں ان خفی دانوں میں

زاہد علی مدیر سیاست حیدرآباد، ان کی شاعری کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''ان کی تمام شاعری دلی جذبات اور واردات قلب قلبی کی آئینہ دار ہے۔ ان کے کلام کے مطالعے سے یہ بات روشن ہوگئی ہے کہ کلاسیکی شعری ادب سے ان کے فکر و فن کا گہرا رشتہ ہے۔'' (دیوان عالی، ص،8، زاہد علی)

تماشہ اور کیا ہوگا یہ قدرت کے کرشمے کا
کہ جس نے روح پھونک دی ہے فقط ایک خاک بے جاں میں

ان اشعار کا مجموعی مطالعہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ شاعر کی تخلیقی کائنات محض جذباتی واردات تک محدود نہیں، بلکہ ایک گہری فکری اور تہذیبی شعور کی حامل ہے۔ کلام میں عشق، تصوف، اخلاق اور اجتماعی احساس ایک دوسرے میں اس طرح مدغم ہیں کہ ہر شعر اپنی انفرادی معنویت کے ساتھ ساتھ مجموعی فضا کو بھی تقویت دیتا ہے۔ شاعر داخلی کرب کو محض ذاتی تجربہ بنا کر پیش نہیں کرتا بلکہ اسے انسانی اور سماجی تناظر میں وسعت عطا کرتا ہے، جس سے اشعار قاری کے ذاتی تجربے سے بھی ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔

فنی اعتبار سے شاعر کلاسیکی غزل کی روایت سے گہرا رشتہ رکھتا ہے۔ استعاراتی نظام، تشبیہات اور علامتیں — جیسے دل، داغ، شمع، کوئے جاناں، گلستاں اور بیاباں — روایتی ہیں، مگر ان کی پیش کش محض تقلیدی نہیں۔ شاعر ان پیکروں میں نئی معنوی جہات پیدا کرتا ہے، جس سے روایت جمود کا شکار ہونے کے بجائے متحرک محسوس ہوتی ہے۔ یہی وصف کلام کو فنی استحکام اور تہذیبی وقار عطا کرتا ہے۔

تصوف ان اشعار کی فکری اساس ہے، مگر یہ تصوف واعظانہ یا عقیدتی نہیں بلکہ تجربہ ذات پر مبنی ہے۔ خدا، بت، راز، نام اور روشنی جیسے تصورات باطن کی علامتیں بن کر سامنے آتے ہیں۔ شاعر یقین سے زیادہ سوال کو اہمیت دیتا ہے، اور یہی سوالی فضا کلام کو فکری طور پر زندہ رکھتی ہے۔ اس تصوف میں انسانی کمزوری کا اعتراف بھی ہے اور روحانی جستجو کی شدت بھی، جو اسے محض رومانویت سے بلند کر دیتی ہے۔ ساتھ ہی ان اشعار میں جدید شعور کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔ قوم، مکتب، حقارت اور خفی دانے جیسے الفاظ سماجی ناہمواری، فکری زوال اور طبقاتی بے حسی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ شاعر کسی براہ راست احتجاج کے بجائے تہذیب یافتہ تنقید کو ترجیح دیتا ہے، جس سے کلام میں وقار اور سنجیدگی برقرار رہتی ہے۔ یہ اسلوب جدید انسان کی داخلی بے چینی اور اجتماعی مایوسی کی عکاسی کرتا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کلام روایت اور جدیدیت کے درمیان ایک بامعنی مکالمہ قائم کرتا ہے۔ شاعر نہ ماضی پرست ہے نہ محض جدید رجحانات کا اسیر؛ بلکہ وہ تصوف کی روحانی بصیرت، کلاسیکی جمالیات اور جدید فکری سوالات کو یکجا کر کے ایک متوازن اور معتبر شعری تجربہ پیش کرتا ہے۔

یہی ہم آہنگی ان اشعار کو محض مطالعے کے بجائے سنجیدہ تنقیدی غور و فکر کا مستحق بناتی ہے۔

شمع پہ پروانے نے گر کر کہا
زندگی میں موت کا چرچا کریں

یہ شعر کلاسیکی استعارے (شمع و پروانہ) کو وجودی سوال میں بدل دیتا ہے۔ پروانے کی قربانی یہاں محض عشق کی علامت نہیں بلکہ زندگی کے اندر پوشیدہ موت کی صداقت کا اعلان ہے۔ شاعر اس تصور کو چیلنج کرتا ہے کہ زندگی فقط بقا کا نام ہے؛ بلکہ وہ موت کو زندگی کی ناگزیر گفتگو بنا دیتا ہے۔ شمع و پروانہ کی روایت میں عاشق خاموش جل کر مر جاتا ہے، مگر یہاں وہ بولتا ہے — یہی جدید شعری شعور ہے۔ موت کو موضوع چرچا بنانا دراصل انسانی بے خبری پر طنز ہے۔ یہ شعر زندگی کی رومانویت کو توڑ کر اس کے سفاک سچ کو سامنے لاتا ہے۔ لہجہ فلسفیانہ ہے مگر احتجاج بھی پوشیدہ ہے۔ شاعر قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ہم زندگی کی بات کرتے ہیں یا صرف موت سے فرار چاہتے ہیں۔

سچی دنیا میں کوئی یار نہیں
اب یہاں سایہ اغیار نہیں

عالی کا یہ شعر جدید انسان کی تنہائی کا اعلان نامہ ہے۔ شاعر ''سچی دنیا'' کی ترکیب کے ذریعے سماجی منافقت پر ضرب لگاتا ہے۔ یہاں یار کی عدم موجودگی محض شخصی غم نہیں بلکہ اجتماعی رشتوں کے انہدام کی علامت ہے۔ دوسرا مصرع مزید تلخ ہے جہاں اغیار کے سائے تک غائب ہو چکے ہیں — یعنی دشمنی بھی بے معنی ہو گئی ہے۔ یہ تنہائی اس حد تک شدید ہے کہ تصادم بھی باقی نہیں رہا۔ شاعر انسانی رشتوں کو مفاد سے مشروط دکھاتا ہے۔ یہ شعر مابعد جدید بے معنویت (absurdity) کی جھلک رکھتا ہے۔ لہجہ سرد، کٹا ہوا اور غیر جذباتی ہے — جو خود ایک تنقیدی حربہ ہے۔

سبھی ہیں مال کے دولت کے زر کے شیدائی
کوئی غریب کا ہے کس کا، اس جہاں میں نہیں

شاعر کا یہ شعر سرمایہ دارانہ سماج پر براہ راست فرد جرم عائد کرتا ہے۔ شاعر کسی ایک طبقے کو نہیں بلکہ ''سبھی'' کو مخاطب کر کے اجتماعی اخلاقی زوال کی نشاندہی کرتا ہے۔ دولت یہاں صرف زر نہیں بلکہ انسانی ضمیر کی جگہ لے چکی ہے۔ دوسرا مصرع سماجی بے حسی کی انتہا کو ظاہر کرتا ہے جہاں غریب کا کوئی نہیں۔ یہ شعر محض ہمدردی نہیں بلکہ اخلاقی سوال ہے۔ شاعر قاری کو اس جرم میں شریک ٹھہراتا ہے۔ اسلوب سادہ مگر معنوی شدت رکھتا ہے۔ یہ احتجاجی شاعری کی واضح مثال ہے۔

رضا کی منزلت خاصان داور لے کے آتے ہیں
وگرنہ سارے انسان حق برابر لے کے آتے ہیں

یہ شعر عدل، اختیار اور طاقت کے تضاد کو بے نقاب کرتا ہے۔ شاعر مساوات کے دعوے کو رد کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اصل فرق رضا اور طاقت سے پیدا ہوتا ہے۔ ''خاصان داور'' عدالتی و سیاسی اشرافیہ کی علامت ہیں۔ انسان پیدائشی طور پر برابر ہو سکتے ہیں مگر انجام میں نہیں۔ یہ شعر نظام انصاف پر گہرا سوال ہے۔ یہاں تقدیر نہیں، ادارے ذمے دار ہیں۔ لہجہ شکوہ نہیں بلکہ افشائے حقیقت ہے۔ شعر فکری طور پر نہایت مضبوط اور تہہ دار ہے۔

نہیں ہے راہ صداقت میں کوئی خوف و خطر
ہزاروں جھوٹ ہیں ایک جھوٹ کے نبھانے کو

یہ شعر سچ اور جھوٹ کے سماجی توازن کو الٹ دیتا ہے۔ شاعر سچ کو آسان اور جھوٹ کو مشکل مگر طاقتور ثابت کرتا ہے۔ ایک جھوٹ کو قائم رکھنے کے لیے ہزار جھوٹ درکار ہوتے ہیں—یہ سماجی نفسیات کا گہرا مشاہدہ ہے۔ پہلا مصرع مثالی ہے، دوسرا زمینی حقیقت۔ یہ تضاد شعر کی جان ہے۔ شاعر سچ کی اخلاقی برتری بیان کرتا ہے مگر سماجی شکست بھی دکھاتا ہے۔ یہ شعر سیاسی تناظر میں بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ تنقید غیر محسوس مگر کاری ہے۔

سچ ہے بہتر ہیں درندے بھی ان انسانوں سے
ہولیاں خون کی جو کھیلتے ہیں جانوں سے
وقت سے پہلے نہ تقدیر سے زائد عالی
کون دیتا ہے کسے میرے خدا سے پہلے

یہ شعر تقدیر اور اختیار کے صوفیانہ تصور کو بیان کرتا ہے۔ شاعر انسانی طاقت اور منصوبہ بندی کی حد دکھاتا ہے۔ یہاں شکوہ نہیں بلکہ اعتراف ہے۔ دوسرا مصرع توحیدی فکر کو مضبوط کرتا ہے۔ شاعر خدا کو آخری منبع عطا قرار دیتا ہے۔ یہ شعر دنیاوی حرص کے مقابل صبر کی تلقین ہے۔ اس میں سکون بھی ہے اور تنبیہ بھی۔ کلاسیکی فکری روایت کا تسلسل نظر آتا ہے۔ لہجہ متوازن اور فکری ہے۔

درد ہی سے رونق انسان ہے
درد جس دل میں نہ ہو حیوان ہے

یہ شعر انسانیت کی تعریف نئے سرے سے وضع کرتا ہے۔ شاعر درد کو کمزوری نہیں بلکہ انسان کی شناخت قرار دیتا ہے۔ درد سے خالی دل کو حیوان کہنا اخلاقی معیار قائم کرتا ہے۔ یہ شعر جدید انسان کی بے حسی پر کاری ضرب ہے۔ شاعر احساس کو تہذیب کی بنیاد مانتا ہے۔ یہاں فلسفہ، اخلاق اور جمالیات جمع ہو جاتے ہیں۔ اسلوب سادہ مگر فیصلہ کن ہے۔ یہ شعر ایک مکمل اخلاقی منشور ہے۔

مکیں کیسے یہاں کسی کا مکاں ہے
جو آتا ہے نظر وہ مہمان ہے

یہ شعر دنیا کی ناپائیداری کا کلاسیکی مگر مؤثر بیان ہے۔ شاعر ملکیت کے تصور کو فریب قرار دیتا ہے۔ مکین اور مکان کا رشتہ عارضی ٹھہرتا ہے۔ یہ صوفیانہ فکر کا خالص اظہار ہے۔ دنیا کو سرائے کہنا نئے انداز میں سامنے آتا ہے۔ لہجہ واعظانہ نہیں بلکہ سوالیہ ہے۔ قاری کو اپنے وجود پر غور کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ معنوی سادگی اس شعر کی طاقت ہے۔

ایک ہی ذات ہے جاری ساری نام دوئی کا آئے کیوں کر
شیخ و برہمن مل کے بتائیں کس کا سجدہ کون کرے

یہ شعر فکری اعتبار سے پورے مجموعے کا مرکز ہے۔ شاعر توحید کے تصور کو سماجی و مذہبی نفاق کے مقابل رکھتا ہے۔ شیخ و برہمن دونوں کو مخاطب کرنا بڑی جرأت ہے۔ یہ مذہبی اجارہ داری پر براہِ راست حملہ ہے۔ شاعر عبادت کو انسانوں کے ہاتھ سے چھین کر ذات واحد کو لوٹا دیتا ہے۔ سوالیہ لہجہ فیصلہ کن بن جاتا ہے۔ یہ شعر احتجاج بھی ہے اور فلسفہ بھی۔ معنوی سطح پر نہایت بلند ہے۔

یہ اشعار معاصر اردو شاعری میں احتجاج، اخلاقی اضطراب اور وجودی شعور کی ایک بامعنی مثال ہے۔ شاعر فرد کے داخلی کرب کو سماج کے اجتماعی زوال سے جوڑ کر پیش کرتا ہے، یوں یہ اشعار محض ذاتی تجربے کا بیان نہیں بلکہ ایک عہد کی فکری دستاویز بن جاتے ہیں۔ شمع و پروانہ، درد و حیوان، مکین و مکان، شیخ و برہمن جیسے کلاسیکی استعارے جدید سماجی شعور کے ساتھ برتے گئے ہیں، جس سے روایت اور جدیدیت کے درمیان ایک بامقصد ربط قائم ہوتا ہے۔

ان اشعار میں سب سے نمایاں پہلو انسانی رشتوں کی شکستگی اور اخلاقی قدروں کا انہدام ہے۔ شاعر بار بار اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ موجودہ سماج میں تعلقات مفاد، زر اور طاقت کے تابع ہو چکے ہیں۔ ''یار'' اور ''اغیار'' دونوں کی عدم موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان نہ صرف دوسروں سے بلکہ خود اپنی انسانیت سے بھی کٹ چکا ہے۔ یہ تنہائی محض نفسیاتی نہیں بلکہ تہذیبی ہے، جہاں اجتماع اپنی معنویت کھو بیٹھا ہے۔

سرمایہ داری اور طبقاتی ناانصافی اس مجموعے کی ایک مضبوط فکری جہت ہے۔ دولت کو مرکزِ قدر بننے پر شدید تنقید کی گئی ہے، جہاں غریب کا کوئی پرسان حال نہیں۔ شاعر اس سماجی جرم کو کسی ایک طبقے تک محدود نہیں رکھتا بلکہ پورے معاشرے کو اس کا شریک ٹھہراتا ہے۔ اسی تناظر میں عدل، انصاف اور مساوات کے دعووں کو بھی بے نقاب کیا گیا ہے، جہاں انسان اگرچہ پیدائشی طور پر برابر ہے مگر انجام میں طاقت اور وابستگی کی بنیاد پر نابرابر ہو جاتا ہے۔

یہ اشعار سچ اور جھوٹ کے فلسفے کو بھی گہرے سماجی شعور کے ساتھ برتتے ہیں۔ شاعر سچ کو اخلاقی اور فطری قدر کے طور پر پیش کرتا ہے، جب کہ جھوٹ کو ایک ایسا نظام دکھاتا ہے جو اپنی بقا کے لیے مسلسل خود کو دہراتا ہے۔ یہاں سچ کی برتری اخلاقی ہے مگر اس کی سماجی قیمت بہت زیادہ ہے، جو شاعر کے احتجاجی لہجے کو مزید تقویت دیتی ہے۔

انسانی درندگی اور تشدد کا بیان اس مجموعے کا سب سے جارحانہ مگر بامقصد پہلو ہے۔ شاعر انسان کو درندوں سے بدتر قرار دے کر تہذیبی دعووں پر کاری ضرب لگاتا ہے۔ مذہب، تہوار اور ثقافت کے نام پر ہونے والے خونریز اعمال کو بے نقاب کر کے شاعر یہ سوال اٹھاتا ہے کہ اگر یہی انسانیت ہے تو وحشت اور تہذیب میں فرق کہاں باقی رہ جاتا ہے۔ یہ لہجہ محض اشتعال نہیں بلکہ اخلاقی احتساب ہے۔

اس احتجاجی فضا کے ساتھ ساتھ اشعار میں صوفیانہ اور وجودی شعور بھی پوری شدت سے موجود ہے۔ تقدیر، وقت، درد اور فنا کے تصورات انسان کو اس کی حد یاد دلاتے ہیں۔ درد کو انسانیت کی شرط قرار دینا اور دنیا کو عارضی قیام گاہ سمجھنا شاعر کی فکری گہرائی کو ظاہر کرتا ہے۔ یہاں قضا و قدر سے مکالمہ شکوہ نہیں بلکہ شعوری سوال ہے، جو انسان کو عاجزی اور خود آگہی کی طرف لے جاتا ہے۔

■

Dr.Pankaj Kumar (Guest Faculty)
Department of Urdu Kirori Mal College
Delhi University-110007
Mob: 9063426590
E-mail:pankajurdu.kamal@gmail.com

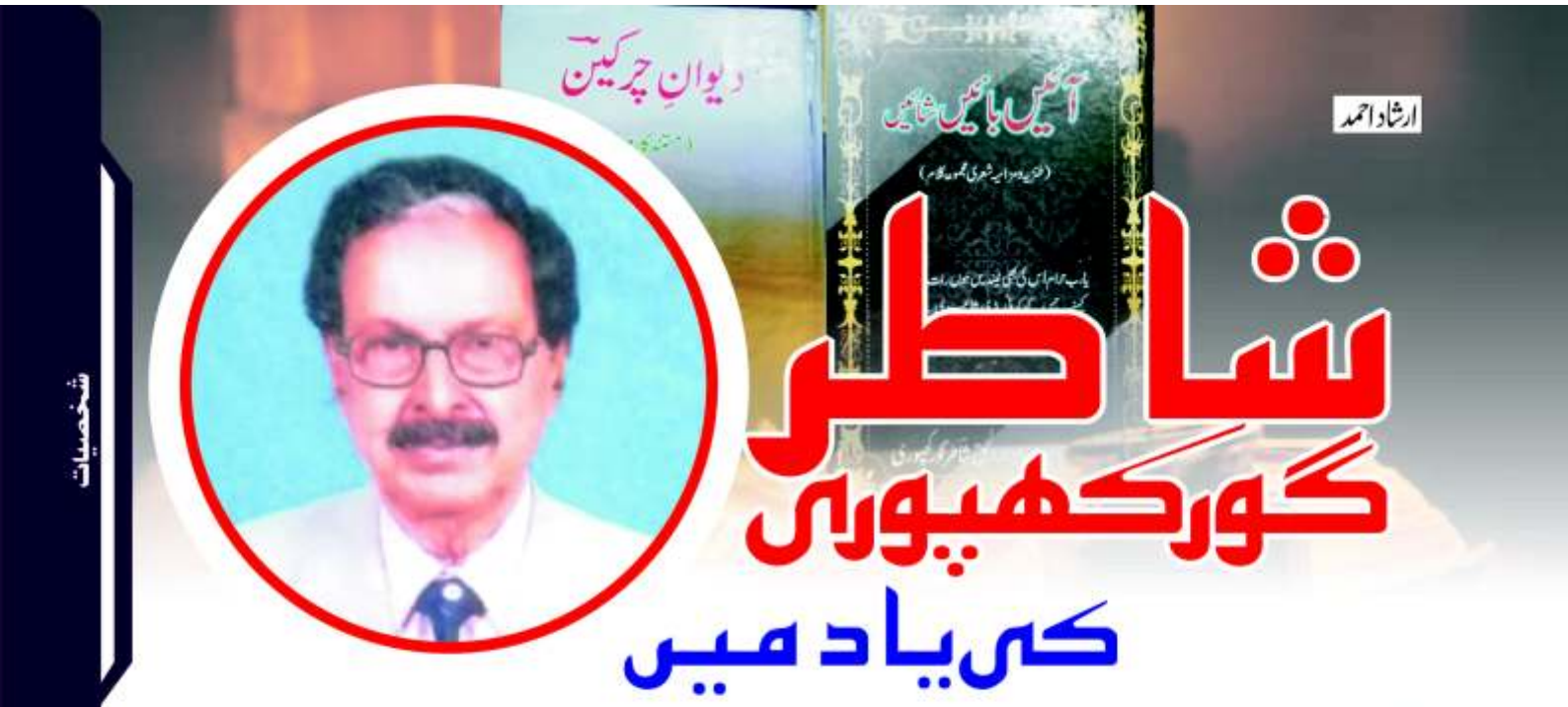

ارشاد احمد

شاطر گورکھپوری کی یاد میں

مجھے زندگی میں گورکھپور کی تین ادبی ہستیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ان میں سے دو قلمکار اب خلد نشیں ہو چکے ہیں۔ ایک مسلم انصاری، دوسرے ابرارالحق شاطر گورکھپوری اور تیسرے ڈاکٹر عبیداللہ چودھری جو ابھی بقیدحیات ہیں اور ان سے ملاقات و مکالمات کا سلسلہ جاری ہے۔ تقریباً پندرہ سال قبل شاطر گورکھپوری سے مل کر ایسا محسوس ہوا تھا کہ وہ علم وادب کے نہ صرف شیدائی ہیں بلکہ شخص شناس بھی ہیں۔ ان کی باتوں میں طنز و مزاح کا پہلو نمایاں ہوتا تھا۔ وہ خوبصورت تھے، چہرہ پرکشش تھا اور خوش لباسی سے ان کی شخصیت دل آویز بن جاتی تھی۔ ان سے ایک ملاقات کا نقش ایسا ہوتا تھا کہ انھیں فراموش کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہ سراپا باغ و بہار تھے۔ میرے جیسے کم آمیز اور کم سخن شخص سے بھی آخری وقت تک ادبی رشتہ نبھاتے رہے۔ آخرکار شاطر گورکھپوری 22/جون 2023 کو داغ مفارقت دے گئے۔

9/مئی 2013 کی بات ہے۔ شام کا وقت تھا۔ میں پتہ پوچھتے پوچھتے الٰہی باغ جناب شاطر گورکھپوری کے دولت کدے پر پہنچ گیا۔ تاریخ اس لیے یاد ہے کہ اس دن انھوں نے دستخط کے ساتھ 'دیوان چرکین' عنایت کیا۔ دیوان چرکین پر اردو بک ریویو میں تبصرہ شائع ہوا تھا اور اس میں شاطر صاحب کا پتہ بھی درج تھا۔ دروازے پر پہنچا تو ان کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ میں نے سلام کیا اور کہا ''مجھے شاطر صاحب سے ملنا ہے''۔ انھوں نے نہایت والہانہ انداز سے جواب دیا کہ ''میں ہی شاطر گورکھپوری ہوں، کہیے کہاں سے تشریف آوری ہوئی ہے''؟ گول مٹول صاف ستھرا چہرہ، کالے گھنے بال، درمیانہ قد اور آنکھوں کے پیچھے سے جھانکتی شوخ، زمانہ شناس آنکھیں اور دیدہ زیب کپڑوں میں ملبوس شاطر گورکھپوری کا میں پہلی ملاقات میں ہی گرویدہ ہو گیا۔

''کچھ دنوں قبل میں نے آپ کی ترتیب دی ہوئی کتاب 'دیوانِ چرکین' پر تبصرہ پڑھا تھا۔ میں اسی کتاب کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں''۔ میں نے ایک ہی سانس میں اپنی بات کہہ دی۔ شاطر صاحب مکان کے اگلے حصے میں بنے مہمان خانے میں داخل ہو گئے۔ میں بھی ان کے ہمراہ اس کمرے میں چلا گیا۔ صوفے پر دراز ہوتے ہی باتوں کا سلسلہ چل پڑا۔ ادبی گفتگو کے ساتھ ساتھ سیاسی اور مذہبی باتیں بھی ہوئیں۔ چرکین کی ادبی حیثیت پر بھی تبادلۂ خیال ہوا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس وقت چرکین پر میری معلومات کافی کم تھی۔

اس دوران انھوں نے دیوان چرکین کا ایک نسخہ نکالا، صفحہ پلٹا اور لکھا۔

ہدیۂ خلوص، برائے ڈاکٹر ارشاد احمد صاحب
شاطر گورکھپوری۔ 9/مئی 2013

نیچے اپنا موبائل نمبر بھی ڈال دیا تاکہ بہ آسانی گفتگو ہوتی رہے۔

اسی دن شاطر صاحب نے اپنے استاد جناب مسلم انصاری سے ملوانے کا اہتمام کیا۔ جناب مسلم انصاری ان کے بغل گیر تھے۔ وہ درجنوں کتابوں کے مصنف و مؤلف تھے۔ اس دن مسلم انصاری نے اپنی کتاب 'دبستان گورکھپور' کی ایک جلد عنایت فرمائی۔ وہ ایک ادبی تنظیم 'دائرۂ ادب' کے سکریٹری تھے۔ گورکھپور کا یہ ادارہ آج بھی فعال ہے۔

میں 22 فروری 2022 کو گورکھپور کے سبز پوش ہاؤس کسی کام کے سلسلے میں گیا۔ وہاں کے خواجہ فرید سے گزارش کی کہ الٰہی باغ چلنے کا اہتمام کریں۔ ارادہ تھا کہ شاطر صاحب سے ملاقات ہو۔ خواجہ فرید نے اپنی اسکوٹی نکالی اور ہم دونوں شاطر گورکھپوری کے پاس پہنچ گئے۔ وہ مہمان خانے میں تنہا بیٹھے تھے اور اپنی پرانی ڈائری کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ میں نے سلام کیا تو پہچان گئے۔ پھر اسی جوش و خروش سے میرا استقبال کیا۔ میں نے ایک بھرپور نظر ان کے جسم پر ڈالی۔ ان کا جسم ناتواں ہو چلا تھا، چہرے پر افسردگی اور پیروں کی نقاہت واضح طور پر عیاں تھی۔ کچھ دیر مرض و معالجے پر گفتگو ہوئی۔ میں سمجھ گیا کہ شاطر صاحب کی زندگی مشکلوں میں ہے۔ اس دن انھوں نے اپنا شعری مجموعہ 'آئیں بائیں سائیں' کی ایک کاپی بڑے خلوص سے میرے حوالے کی۔

شاطر گورکھپوری سے پہلی مگر یہ مختصر ملاقات دیرینہ رفاقت میں بدل جائے گی، میں نے سوچا نہیں تھا۔ جب مہینے دو مہینے گزر جاتے تو مرحوم خود فون کرتے اور حال چال پوچھتے اور گورکھپور آنے کی دعوت دیتے۔

شاعر مذکور کا اصل نام ابرارالحق اور تخلص شاطر گورکھپوری ہے۔ موصوف کی ولادت 15/جولائی 1941 کو محلہ الٰہی باغ ضلع گورکھپور میں ہوئی۔ ان کے والد بزرگوار کا اسم گرامی محمد سمیع ہے۔ شاطر کی ابتدائی تعلیم والد محترم کے زیر سایہ ہوئی۔ بعد ازاں انصار انگلش اسکول، گورکھپور سے دسویں تک تعلیم حاصل کر کے میاں صاحب انٹر کالج، گورکھپور میں داخلہ لیا۔ ابھی تعلیمی سلسلہ

جاری تھا کہ 1966 میں انھوں نے بیک وقت تین مقابلہ جاتی امتحانات میں کامیابی حاصل کی۔ دبستان گورکھپور کے مؤلف جناب مسلم انصاری کے مطابق:

''حسن اتفاق کہ 1966 میں بیک وقت تین محکموں ریلوے، فرٹیلائزر اور اسٹیٹ بینک آف انڈیا کے امتحانات میں شرکت کی اور کامیاب امیدواروں میں ابرار الحق کا نام سرفہرست تھا۔ اب ان کے لیے یہ طے کرنا مشکل ہوگیا کہ کس ایک محکمے کو ترجیح دیں۔ کچھ تجربہ کار اشخاص کی صلاح پر انھوں نے اسٹیٹ بینک آف انڈیا کی ملازمت کو ترجیح دی''۔

(دبستان گورکھپور: مؤلف، مسلم انصاری، ص641)

شاطر گورکھپوری کو طالب علمی کے زمانے سے ہی شعروسخن سے لگاؤ پیدا ہوگیا تھا۔ گورکھپور کا ادبی ماحول بھی اچھا تھا۔ اکثر وبیشتر شعروادب کی محفلیں سجتی تھیں۔ شاطر ان محفلوں میں باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے شعر موزوں کرنا شروع کیا اور قریب ہی مقیم جناب مسلم انصاری کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہوگئے۔ اس وقت گورکھپور کے ادبی افق پر طنز و مزاح کے شاعر ایشوری شرن سریواستو کی بڑی دھوم تھی۔ وہ دائرۂ ادب، گورکھپور کے تربیت یافتہ شاعر تھے اور ان کا تخلص نادم تھا۔ جب نادم گورکھپوری کا انتقال ہو گیا تو طنز ومزاح کی دنیا پھیکی پڑ گئی۔ تبھی جناب مسلم انصاری نے انھیں مشورہ دیا کہ'' آپ طنزیہ ومزاحیہ شاعری کریں اور شاطر تخلص رکھ لیں''۔ شاطر گورکھپوری نے ان کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ظریفانہ شاعری شروع کر دی۔ ابتدائی دور میں انھوں نے نادم صاحب کے مصرعوں پر تضمینیں لکھیں لیکن بہت جلد انھوں نے اس روش کو ترک کر دیا اور آزادانہ طور پر ظرافت نگاری کرنے لگے۔ اس زمانے کو یاد کرتے ہوئے شاطر گورکھپوری رقم طراز ہیں:

''1975 کے اوائل سے نادم صاحب کی طبیعت کچھ زیادہ ناساز رہنے لگی اور وہ ادبی نشستوں میں شرکت کرنے سے معذور ہو گئے۔ جس کی وجہ سے ادب کے ماحول میں ایک بڑا خلا پیدا ہوگیا، جسے پُر کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جناب مسلم انصاری نے مشورہ دیا کہ 'دیر کس بات کی، آگے بڑھو اور شعر گوئی شروع کر دو'۔ میں ان کی بات پر مسکرا کر راضی ہوگیا تو انھوں نے شاطر تخلص رکھنے کا مشورہ دیا جس پر آج تک کاربند ہوں۔''

(آئیں بائیں سائیں: شاطر گورکھپوری، ص5)

شاعری دراصل انسان کے جمالیاتی شعور اور نفسیات کی دلفریب ترجمانی کا نام ہے۔ شاعری میں فکر و وجدان کی آمیزش اسے رفعت و بلندی عطا کرتی ہے۔ شاعری کا موضوع کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ بعض

شاطر گورکھپوری کی شاعری کا اصل میدان طنز و مزاح ہے۔ گورکھپور میں نادم گورکھپوری کی وفات کے بعد خالی ہوئی ظرافت کی دنیا کو آباد کرنے کے لیے شاطر اس جانب ملتفت ہوئے اور تا حیات اسی راستے پر گامزن رہے۔ ان کا شعری مجموعہ 'آئیں بائیں سائیں' تقریباً پچاس سالہ شعری و ادبی زندگی کا حسین گلدستہ ہے۔ اس میں نعت، منقبت، نظم، قطعات اور غزلیں ہیں۔ لیکن بجز مذہبی کلام کے تمام تخلیقات کا رنگ، اسلوب اور انداز طنزیہ و مزاحیہ ہے۔

ناقدین کا خیال ہے کہ شاعری صرف اعلیٰ قدروں اور لطیف جذبات کی ترجمانی کا نام ہے۔ ایسی حالت میں انسان کی وہ ذہنی کیفیت جب کسی کی بد اخلاقی اور کردار کی کج روی سے رنجیدہ ہوکر مغلظات سنانے کی ہوتی ہے، وہ صفحۂ قرطاس پر نہیں آسکتی ہے۔ لیکن اردو شاعری میں چند شعرا ایسے ہیں جنھوں نے اس متضاد کیفیت کی ترجمانی فنی اور فکری بالیدگی کے ساتھ کی ہے۔ اس ضمن میں جعفر زٹلی (1658-1713) کا نام سرفہرست ہے۔ بعض شعرا کے فحش کلام یا تو ضائع ہو گئے یا اخلاقی کٹرپن اور مذہبی دقیانوسی کی وجہ سے شرف قبولیت سے محروم رہے۔ اس ضمن میں سید باقر علی چرکین خوش قسمت ہیں کہ ان کے کلام کو متعدد ناشروں نے نہ صرف شائع کیا بلکہ قارئین تک رسائی کو ممکن بنایا۔

شاطر گورکھپوری طنز و مزاح کے شاعر تھے اس لیے انھیں چرکین کی شاعری سے قلبی، ذہنی وفکری لگاؤ تھا۔ ان کے دل میں یہ خواہش تھی کہ چرکین کے مستند کلام کو جمع کر کے ایک دیوان شائع کیا جائے۔ لیکن تمام طبع شدہ اور غیر مطبوعہ کلام تک ان کی رسائی نہیں تھی۔ شاطر گورکھپوری نے اس سمت میں اپنی کوشش جاری رکھی۔ کچھ دنوں کے بعد چرکین کی شائع شدہ تخلیقات کے بارے میں انھیں جانکاری مل گئی۔ اس کے بعد انھوں نے رضا لائبریری، رامپور اور خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ کے عہدیداران سے رابطہ کیا اور دیوان چرکین کے طبع شدہ نسخوں کا عکس حاصل کیا۔ کچھ دوسرے اہل ذوق نے بھی ان کی مدد کی۔ اس طرح شاطر گورکھپوری کے پاس دیوان چرکین کے تین مطبوعہ اور دو غیر مطبوعہ نسخے دستیاب ہو گئے۔ انھوں نے تمام نسخوں کا مطالعہ اور موازنہ کر کے ایک نیا دیوان چرکین تیار کیا۔ پرانے نسخوں کی کتابت وطباعت کی غلطیوں کی اصلاح کی اور لفظوں کو یکسانیت سے ہمکنار کیا۔ اس نئے دیوان کی اشاعت 2007 میں ہوئی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن 2009 میں منظر عام پر آیا۔ اس کا مفصل مقدمہ شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے۔ بقول فاروقی:

''ہمیں جناب شاطر گورکھپوری کا ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے کئی مطبوعہ اور مخطوطہ نسخوں کی مدد سے دیوان چرکین کا یہ بہت اچھا نسخہ تیار کیا ہے۔ علاوہ بریں ان کی یہ جرأت رندانہ بھی لائق داد ہے کہ انھوں نے ترتیب وتدوین نو کے لیے چرکین جیسے مشکل اور اکثر لوگوں کی نظر میں محض ہزال وانحوکہ شاعر چرکین کا دیوان منتخب کیا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ جدید اشاعت ثابت کردے گی کہ چرکین نرے ہزال اور ہنسوڑ قسم کے فحش گو نہیں ہیں بلکہ ان کے کلام میں شاعرانہ فنکاری، لسانی دروبست، استعارہ سازی اور مضمون آفرینی کے بھی رنگ چوکھے ہیں''۔

(دیوان چرکین، مرتب: شاطر گورکھپوری، ص16)

اردو شاعری میں چرکین کا مقام و مرتبہ منفرد ہے۔ ان کا اپنا نظریہ ہے جس پر وہ مضبوطی سے کاربند ہیں۔ وہ ایک ایسے زمانے کے نمائندہ شاعر ہیں جنھوں نے نتیجہ کی فکر کیے بغیر برازیات میں بڑا نام کیا۔ انھوں نے بڑی بہادری سے اور بے خوف ہوکر ایک غیر مقبول اور بدنام رنگ سخن کو اختیار کیا اور اسے اعتبار بخشا۔ عام قارئین برازیات اور فحشیات میں فرق کو نہیں سمجھتے اور کلام چرکین کو فحشیات کے خانے میں ڈال کر نظر انداز

کر دیتے ہیں۔ بعض ناقدین نے حقارت آمیز رویہ اپنایا اور چرکین کی تمام نگارشات کو اخلاقی اقدار کے نقطۂ نظر سے پرکھا۔ اس طرح وہ اشعار بھی تسلیم نہیں کیے گئے جن میں جنسی تلذذ، غلاظتِ فکر، نجاست کا بیان، معشوق کی سفلہ پروری، بدتہذیبی اور ذلت و خواری جیسے موضوعات نہیں ہیں۔ شاطر گورکھپوری نے ادبی دیانت داری سے چرکین کی شاعری پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور ان کے شعری وفکری امتیازات کی نشاندہی کی ہے۔ انھوں نے بلاتفریق ان کے تمام کلام کو یکجا کیا ہے اور اشعار کی روشنی میں چرکین کے مقام و مرتبے کا تعین کیا ہے۔ شاطر کا یہ کارنامہ نہ صرف لائق ستائش ہے بلکہ قابل تقلید بھی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کریں۔

اک نہ اک عارضہ رہا ہم کو
تھم گئے دست تو بخار آیا

چرکین رہا نہ پاس تجھے نام و ننگ کا
قائل ہوں اپنے نشۂ مے کی ترنگ کا

ناپاک ہیں اغیار، تم ان کو نہ کرو قتل
ہووے گا نجس خنجرِ خوں خوار تمھارا

مے کدے سے نہ غرض مجھ کو نہ میخانے سے
مجھ کو چرکین ہے شب و روز درِ یار سے ربط

نہ پایا اس سے کبھی اپنی گفتگو کا جواب
دہانِ یار نظر آیا لا جواب ہمیں

صاحب کی بے وفائی سے خطرہ نہیں مجھے
تم پھر گئے تو پھر گئے، پروا نہیں مجھے

شوق گلگشت کا چرکین کو جس دم ہو جائے
گل ہر ایک باغ میں رشکِ گلِ آدم ہو جائے

'آئیں بائیں سائیں' ابرارالحق شاطر گورکھپوری کے طنزیہ ومزاحیہ کلام کا مجموعہ ہے، جس کی اشاعت جنوری 2020 میں ہوئی۔ اس شعری مجموعے کو انھوں نے ڈاکٹر عزیز احمد، گورکھپور کے نام منسوب کیا ہے۔ اس کتاب کی ابتدا حسب روایت نعت پاک سے ہوئی ہے۔ دیگر نعتوں میں انھوں نے حضرت محمدؐ سے اپنی گہری محبت وعقیدت کا اظہار کیا ہے۔ یہ اشعار شاطر کے مخلصانہ جذبات واحساسات کے ترجمان ہیں۔

دور شباب ہو کہ وہ بچپن حضور کا
بے داغ تھا ہمیشہ ہی دامن حضور کا

ہر اک عدو کو فتح کے دن کر دیا معاف
دیکھو یہ حوصلہ یہ بڑکپن حضور کا

شاطر گورکھپوری کی شاعری کا اصل میدان طنز ومزاح ہے۔ گورکھپور میں نادم گورکھپوری کی وفات کے بعد خالی ہوئی ظرافت کی دنیا کو آباد کرنے کے لیے شاطر اس جانب ملتفت ہوئے اور تا حیات اسی راستے پر گامزن رہے۔ ان کا شعری مجموعہ 'آئیں بائیں سائیں' تقریباً پچاس سالہ شعری وادبی زندگی کا حسین گلدستہ ہے۔ اس میں نعت، منقبت، نظم، قطعات اور غزلیں ہیں۔ لیکن بجز مذہبی کلام کے تمام تخلیقات کا رنگ، اسلوب اور انداز طنزیہ ومزاحیہ ہے۔

شاطر گورکھپوری کا مزاج ظریفانہ ہے۔ ان کی طبیعت میں بذلہ سنجی ہے۔ سرکاری ملازمت ایسی تھی کہ جس نے انھیں وقت کا پابند بنا دیا اور بھلے برے لوگوں کے ساتھ زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھا دیا۔ چونکہ ان کی معاشرتی زندگی کا حلقہ وسیع تھا اس لیے مختلف عادات و اطوار کے افراد سے سابقہ پڑا۔ شاطر گورکھپوری کا شعری سرمایہ ایسے ہی فرومایہ اور بلند پایہ افراد اور کردار کے نفسیاتی مطالعے کا ماحصل ہے، جسے وہ اشعار کے قالب میں قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

ذہانت جہالت کی مرہون نکلی
شرافت خباثت کی معجون نکلی

اٹھایا جو کل شیخ جی کا مصلیٰ
تو نیچے اک پاؤ افیون نکلی

ہے اگر مطلب براری کا خیال
ان کے در پہ دم ہلاتے جائیے

جبیں تراش لینے کا ماہر بنا دیا
بننا چاہتا تھا جو آخر بنا دیا

ایسا دیکھا جاتا ہے کہ ظریفانہ شاعری میں سیاسی رہنما اور مذہبی مولوی سب سے زیادہ تضحیک کا نشانہ ہیں۔ یہ دونوں موضوعات طنز ومزاح کے لیے اولیت کا درجہ رکھتے ہیں اور اس کے ذائقے کا مزا طفل وجواں، خواندہ وناخواندہ، عاقل ونادان اور حاکم ومحکوم سبھی لیتے ہیں۔ اس طرح ایک مزاحیہ شاعر کی تخلیقات اگر حقیقت پر مبنی ہو تو اس کے متعدد اشعار ضرب المثل بن جاتے ہیں اور انہی اشعار کی بنا پر وہ شاعر حیاتِ جاوداں حاصل کر لیتا ہے۔ حضرتِ چرکین بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ شاطر گورکھپوری نے چرکین کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے طنز ومزاح کا راستہ اپنایا لیکن برازیات وفحشیات اور رکاکت وابتذال سے اپنے دامن کو پاک رکھا۔

ہر منسٹر کی آرزو ہے یہی
زندگی گزرے عیش و مستی میں
یعنی اول تو موت آئے نہیں
اور اگر آئے بھی تو کرسی میں

جب سے لگی ہے ان کو شکم پروری کی چاٹ
تفریق مٹ گئی ہے حلال و حرام کی

واعظ بہک بہک کے کریں کیوں نہ گفتگو
اب لت جو لگ گئی ہے انھیں سو گرام کی

شاطر گورکھپوری کی ہزلیات میں بھی طنز ومزاح کا رنگ غالب ہے۔ چونکہ شاطر کا مزاج خالص ہندوستانی ہے اس لیے ان کی ہزلیات میں ہندوستانی آداب واطوار، رسم ورواج اور معاشرتی زندگی کا عکس واضح طور پر نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں صدفی صد ہندوستانی لفظیات اور محاورات کا استعمال ہوا ہے۔ کہیں کہیں بھوجپوری اور ہندی لفظوں کا استعمال بڑی چابکدستی سے کیا ہے۔ اس طرح کے اشعار ہماری قرأت پر گراں نہیں گزرتے بلکہ خالص مقامی اور علاقائی ہونے کا حظ دیتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کریں۔

لائی اس مقام پہ اب دوستی مجھے
دنیا دکھائی دیتی ہے دس نمبری مجھے

رسمِ وفا نباہ دی زندہ دلی کے ساتھ
جوتے بھی کھائے عشق میں ہم نے خوشی کے ساتھ

اس پیار کی منزل پہ لے آئی ہے رسوائی
جب مجھ پہ پڑے جوتے جوتوں کو حیا آئی

تم چوٹ محبت کی کھا کر تو ذرا دیکھو
ملتے ہیں مزے کیا کیا جب چلتی ہے پروائی

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شاطر گورکھپوری کا ادبی کارنامہ منفرد، اہم اور دلچسپ ہے۔ انھوں نے چرکین جیسے بدنام زمانہ شاعر کے منتشر کلام کو یکجا کیا اور اس کی صحت کی جانچ پرکھ کی اور تدوینی مرحلے کو سر کرتے ہوئے طباعت سے ہمکنار کیا۔ ساتھ ہی معیاری ظریفانہ شاعری سے اردو ادب بالخصوص دبستان گورکھپور کو مالا مال کیا۔ آنے والی نسلیں شاطر گورکھپوری کے ادبی کارناموں کا یقیناً اعتراف کریں گی۔

■

Dr. Irshad Ahmad
1731, Amna Manzil, Islamia Nagar
Siwan- 841226 (Bihar)
Mob.:9771443219
drirshadahmad05@gmail.com

حسین الحق کی ناول نگاری

ایک جائزہ

زبیدہ نسیم

جدید اردو ناول نگاروں میں حسین الحق ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا شمار 1960 کے بعد آنے والے فکشن نگاروں کی صف میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اس دور کا مشاہدہ کیا جب ترقی پسند تحریک زوال پذیر ہورہی تھی اور جدیدیت اپنے عروج پر تھی۔ سماجی تبدیلیوں اور نئی صدی کے رجحانات کو انھوں نے گہرائی سے محسوس کیا۔ فکشن نگاروں کے ہجوم میں حسین الحق نے اپنی منفرد شناخت اور اسلوب قائم کیا۔ ان کا اسلوب نئے موضوعات، عصری مسائل، تصوف کی گہرائیوں اور منفرد انداز بیان پر مشتمل ہے، جس کی بدولت وہ اپنے ہم عصروں میں نمایاں مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ انھوں نے اردو کے کئی شاہکار افسانے تخلیق کیے، جنھیں بعد میں افسانوی مجموعوں کی شکل میں منظر عام پر لایا گیا جیسے: پس پردہ شب، صورتحال، بارش میں گرا مکان، گھنے جنگلوں میں، مطلع، سوئی کی نوک پر رکا لمحہ، نیو کی اینٹ۔ ان کے ناولوں میں بولومت چپ رہو، فرات اور اماوس میں خواب شامل ہیں۔ ان کی تحریروں میں جہاں بہترین اسلوب کی جھلک ملتی ہے، وہیں علامتی اظہار اور جدیدیت کے تجرباتی اثرات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کی ناول نگاری کے متعلق ''پروفیسر اسلم جمشید پوری اپنے مضمون ''اقلیتی ڈسکورس کا نمائندہ ناول اماوس میں خواب'' میں اس طرح لکھتے ہیں:

''حسین الحق کے بہت سے افسانے اور ناولوں میں اقلیتی ڈسکورس بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ دراصل بابری مسجد کے انہدام کے واقعے نے ہمارے فکشن نگاروں کو بہت متاثر کیا۔ حسین الحق نے اپنی تحریروں میں اقلیتوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور ایسے ماحول کو خواہ وہ بہار کا ہو، ممبئی کا ہو، یا اتر پردیش کے مختلف شہروں کا، یا پھر بین الاقوامی سطح پر مسلمانوں کے خلاف ہونے والی سازش اور عمل کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اپنی تحریروں میں اس کا اظہار بھی کیا۔''1

حسین الحق نے ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے مثبت پہلوؤں کو سمو کر اردو افسانے اور ناول کو نئی جہت بخشی۔ اگر چہ ان کا شمار جدید اور مابعد جدید اردو ناول نگاروں میں ہوتا ہے مگر ان کی زیادہ توجہ افسانہ نگاری پر مرکوز رہی ہے۔ اسی وجہ سے ان کے ناول کم اور طویل وقفے کے بعد منظر عام پر آئے۔ ان کا پہلا ناول ''بولومت چپ رہو'' 1990 میں اور دوسرا ناول ''فرات'' 1992 میں اور تیسرا ناول ''اماوس میں خواب'' 2017 میں شائع ہوا۔

''بولومت چپ رہو'' حسین الحق کا پہلا ناول ہے۔ اس ناول میں ہندوستان کے تعلیمی نظام کے بنیادی مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔ یہ ناول صفحہ 17 سے شروع ہوکر 183 پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار افتخار الزماں ہے جو ایک بہادر اور بے باک شخصیت کا مالک ہے، جو آزادی کے بعد بے حد خوش دکھائی دیتا ہے لیکن جیسے ہی ایک پرائمری اسکول قائم کرتا ہے، اسے کئی مشکلات اور اذیت ناک حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ماسٹر افتخار الزماں ایک اسکول کھولتا ہے، جہاں وہ بطور ہیڈ ماسٹر اور چپراسی دونوں کردار نبھاتا ہے اور بچوں کی تعلیم کے لیے انتھک محنت کرتا ہے۔ جب اسکول کو سرکاری حیثیت مل جاتی ہے، تو وہاں نئے اساتذہ تعینات کر دیے جاتے ہیں اور اسکول میں مختلف تقریبات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ جن میں اعلیٰ افسران اور نئے اساتذہ کی تعریفیں کی جاتی ہیں لیکن ماسٹر افتخار الزماں کی قربانیوں کو مکمل طور پر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ان تقریروں سے دل برداشتہ ہوکر افتخار الزماں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کہیں اس کی تمام قربانیاں بے سود نہ ثابت ہوں۔ افتخار الزماں اپنے دوست رامیشور سے کہتا ہے کہ اس نے ملک کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کردی، اور اس کے بدلے میں کبھی کچھ نہیں مانگا اور اس نے کسی کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کیا لیکن اب اسے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ گزشتہ چند برسوں میں اس کی سماجی پہچان ختم ہوتی جارہی ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ معاشرے کے لیے نقصان دہ نہیں رہا، اب اسے یہ بھی سمجھ میں آگیا ہے کہ معاشرے میں اس کی آواز اب بے اثر ہوچکی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر خالد اشرف اس طرح رقمطراز ہیں۔

''حسین الحق کے ناول ''بولومت چپ رہو'' 1990 کا سابق انقلابی اور موجودہ ہیڈ ماسٹر افتخار الزماں اپنے معاشرے سے کٹا ہوا فرد ہے۔ اس نے آزادی کی تحریک میں جمہوریت، مساوات اور معاشی عدل کے خوابوں کی تکمیل کے مقصد سے حصہ لیا تھا لیکن آزادی کے بعد اس کے دیکھتے دیکھتے اس کے یاران ہم پیالہ و ہم نوالہ کامیاب دنیادار بن گئے۔ دراصل افتخار الزمان کا مسئلہ اپنے معاشرے میں حسب سابق نہ ملنے والے ریکوگنائزیشن اور احترام کا ہے۔''2

فرات: حسین الحق کا دوسرا ناول ہے جو 1992 میں منظر عام پر آیا۔ یہ ایک متنوع فکری جہات کا حامل منفرد ناول ہے۔ جس میں مصنف نے نئی نسلوں میں پیدا ہونے والی ذہنی، جذباتی اور اخلاقی تبدیلیوں کو بڑی صداقت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ حسین الحق نے وقار احمد کے توسط سے پانچ نسلوں پر مشتمل ایک کہانی بیان کی ہے اور قاری کو سوچنے اور عمل کرنے کے نئے زاویے فراہم کیے ہیں۔ ناول کی کہانی وقار احمد کے گرد

گھومتی ہے، جن کی 75 سالہ زندگی کے تجربات اور ابا جان و دادا جان کی یادوں کے پس منظر میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ وقار احمد کی زندگی جدید و قدیم روایات کے درمیان کشمکش کی عکاسی کرتی ہے۔ ''فرات'' دراصل ایک خاندان کی کہانی ہے، مگر رفتہ رفتہ اس کی وسعت بڑھتی جاتی ہے، اس میں ماضی کے جبر، نسلوں کا فرق، مذہبی رویے، سیاست، تہذیب اور زندگی کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں۔ یہ ناول نہ صرف نظریاتی مسائل اور اقتدار کے تصادم کو اجاگر کرتا ہے بلکہ اس میں ہندوستانی مسلمانوں کی تقسیم وطن کے بعد سے جاری عدم تحفظ کی کیفیت کو بھی شدت سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ ناول اس تلخ حقیقت کو بھی سامنے لاتا ہے کہ مسلمانوں کے پاس یا تو ماضی کی عظمت کے قصے ہیں یا حال کی بدعنوانیاں اور وہ انھی یادوں کے سہارے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ناول انسانی وجود کے مختلف پہلوؤں کو اتنی گہرائی سے اجاگر کرتا ہے کہ فرد کی شناخت کا مسئلہ نمایاں ہو جاتا ہے جبکہ جبر، کائنات کا تصور بھی کہانی کے تسلسل میں شامل ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار وقار احمد اپنی زندگی کو اپنی مرضی کے مطابق گزارنے کی کوشش کرتا ہے لیکن جیسے ہی عمر کے آخری مرحلے میں داخل ہوتا ہے، ماضی کی یادیں اسے اپنی گرفت میں لینے لگتی ہیں۔ اس کے تعلقات ٹوٹ جاتے ہیں اور وہ حال سے کٹ کر ماضی کی دنیا میں کھو جاتا ہے۔ ماضی اور حال کے درمیان چھائی دھند اس کی زندگی پر چھا جاتی ہے، جس سے وہ ایک مخلص انسان سے بدل کر خود غرض اور خود پرست بن کر ابھرتا ہے۔ جب اس کی مایوسی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے تو وہ تبلیغی جماعت میں شامل ہو کر گھر چھوڑ دیتا ہے۔ حالانکہ اس کے روایتی مذہبی تصورات سے اختلافات ہوتے ہیں۔ تبلیغ کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے باوجود اسے اپنے سوالات کے جواب نہیں مل پاتے، تو وہ اس جماعت سے الگ ہو کر ایک اور راہ اختیار کرتا ہے۔ با اثر افراد اسے ایک اسکول کا پرنسپل بنا دیتے ہیں لیکن یہاں بھی اس کی بے چینی ختم نہیں ہوتی۔ جب وہ اپنی زندگی کا تجزیہ کرتا ہے تو اسے اندازہ ہوتا ہے کہ سب کچھ تبدیل ہو چکا ہے لیکن اس کی تلاش اب تک مکمل نہیں ہو سکی۔ وقار احمد کے پاس سب کچھ تھا دنیاوی آسائشیں، عزت و مرتبہ لیکن جو چیزیں ان کی زندگی سے غائب تھیں وہ تھی قلبی سکون، زندگی جینے کا سلیقہ، جو ان کی روح کی سب سے بڑی طلب تھی۔ اسی قلبی سکون کی تلاش انہیں یہاں لے آئی تھی مگر اب وہ خود کو تلاش کر رہے تھے۔ اقتباس ملاحظہ:

''وقار احمد اپنی تلاش میں گم تھے ____ مگر وہ اپنے آپ کو کیا تلاش کرتے کہ قدرت نے خود ان کے سامنے ان کو کھو دینے اور گم کر دینے کا بے معنی مگر دردناک ڈرامہ کھیلا تھا۔۔۔''3

''اماوس میں خواب'': حسین الحق کا تیسرا شاہکار ناول ہے۔ یہ ناول 2017 میں منظر عام پر آیا جو ایک وسیع کینوس پر لکھا گیا ہے۔ اس ناول کے لیے حسین الحق کو ساہتیہ اکیڈمی جیسے ایوارڈ سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ حسین الحق کے اس ناول کو ہندوستان کے سماجی اور تہذیبی حالات کا آئینہ کہا جا سکتا ہے۔ 23 ابواب اور 347 صفحات پر مشتمل اس ناول میں مصنف نے اپنے خیالات کو علامتوں، استعاروں اور تمثیلی پیرائے میں بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ یہ ناول، محبت، قربانی اور تہذیبی بقا کے احساسات پر مبنی ہے۔

یہ ناول ہندوستان کی آزادی کے بعد سماجی، سیاسی و تہذیبی حالات کو بیان کرتا ہے۔ اس ناول میں زیادہ تر بہار کی عکاسی کی گئی ہے اور اسماعیل نامی کردار کو ایک علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو ایک ایسے سماج کی نمائندگی کرتا ہے جو آزادی کے بعد سے اپنی منزل کی تلاش میں مصیبتوں اور آزمائشوں سے گزر رہا ہے۔ اسماعیل اس ناول کا مرکزی کردار ہے جو ان تمام مشکلات اور آزمائشوں کی تصویر پیش کرتا ہے جن سے آزاد ہندوستان کا سماج آج بھی گزر رہا ہے۔ اسماعیل سکون کی تلاش میں ملک کے مختلف حصوں کا سفر کرتا ہے اور بلا آخر بہار واپس آتا ہے اور یہاں ایک بم دھماکے میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ اس کی موت کے بعد اس کی اولاد کے ساتھ بھی یہی سانحہ پیش آتا ہے۔

حسین الحق نے 70 برس کی زندگی اور آزاد ہندوستان کی تاریخ کے اہم واقعات کو نہایت موثر انداز میں اس ناول کا موضوع بنایا ہے۔ یہ ناول آزادی کے بعد سے عصر حاضر تک ہندوستان کی تمام اہم سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کا ایک مکمل منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ناول میں تصوف کو اہمیت دی گئی ہے، جہاں صوفی تہذیب کی مثالوں کے ذریعے اتحاد، یکسانیت اور انسانیت کا درس دیا گیا ہے۔ یہ نقطہ نظر حالات وواقعات کے تجزیے میں گہرائی پیدا کرتا ہے اور ناول کے بیانیے کو مزید موثر بناتا ہے۔ پورا ناول مابعد آزادی کا تاریخی بیانیہ ہے اور اس بیانیہ کا تعلق ماضی، حال اور مسلمانوں کے مستقبل سے گہرا شغف رکھتا ہے۔ ناول کے متعلق ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی اپنے مضمون ''اماوس میں خواب معاصر ہندوستان کا استعارہ'' میں رقمطراز ہیں:

''...آزادی کے بعد کا یہ عرصہ ملک کے لیے جیسے بھی تغیرات سے بھرا رہا ہو انسان کے لیے ذہنی انتشار، قلبی خلفشار اور فکری اضطراب کا عرصہ رہا ہے، جس کا تعلق آج سے ہے اور آنے والے کل سے بھی... یہ ناول موجودہ سیاسی، سماجی، تہذیبی صورتحال کی عکاسی تاریخ کے بجائے تجربات کی روشنی میں کرتا ہے۔''4

مذکورہ اقتباس سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حسین الحق نے جس مہارت کے ساتھ طویل عرصے کے حالات و واقعات کو اس ناول میں پیش کیا ہے وہ ان کے وسیع مطالعہ، بلند تخیل اور فن پر گہری گرفت کا واضح ثبوت ہے۔ انھوں نے نہایت ہنرمندی سے واقعات کو اس انداز میں ایک دوسرے سے مربوط کیا ہے کہ ان میں برسوں کے تجربے اور مشاہدے کی گہری جھلک صاف نظر آتی ہے۔ یہ ناول نہ صرف ہندوستان کی تاریخ کے اہم واقعات کا آئینہ ہے بلکہ ایک گہری فکری اور تخلیقی کوشش ہے بھی جو قاری کو انسانیت، اتحاد اور سماجی انصاف پر غور و فکر کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔

حوالہ جات

1 مضمون: ''اقلیتی ڈسکورس کا نمائندہ ناول ''اماوس میں خواب'' از پروفیسر اسلم جمشید پوری رسالہ، عالمی فلک، شمارہ اپریل تا ستمبر 2022، ص 117۔

2 ''برصغیر میں اردو ناول نگاری'' از ڈاکٹر خالد اشرف، مشمولہ، اردو جرنل پٹنہ، 2015، ص، 170۔

3 ''فرات'' از حسین الحق ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، اشاعت 2016 ص 17۔

4 مضمون: ''اماوس میں خواب معاصر ہندوستان کا استعارہ'' از ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، رسالہ عالمی فلک شمارہ 7 و 8، اپریل تا ستمبر 2022 ص 132، 133۔

■

Zabida Naseem
Research Scholar
Deptt of Urdu University of Delhi(110007)
Mob.:9622565425
E-mail:-Zabidanaseem@gmail.com

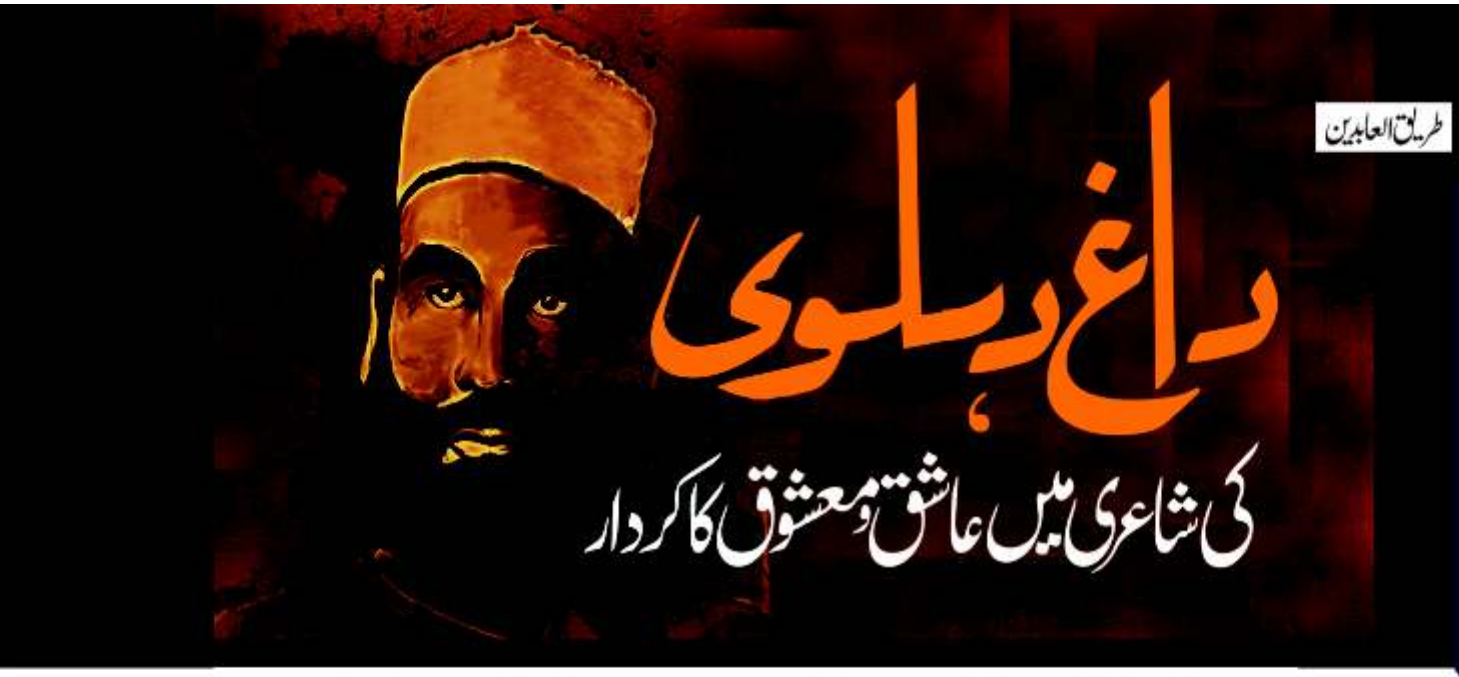

داغ دہلوی

کی شاعری میں عاشق و معشوق کا کردار

طریق العابدین

اردو غزل کی روایت میں عاشق و معشوق محض دو کردار ہی نہیں ہیں بلکہ وہ ایک مکمل شعری کائنات کی تشکیل کرتے ہیں۔ عاشق غزل میں جذبات و احساسات، اضطراب، وفاداری اور بے قراری کا نمائندہ ہوتا ہے جب کہ معشوق حسن، بے نیازی، تغافل اور جمالیاتی وقار کی علامت ہے۔ ان دونوں کے باہمی تعلق سے ہی غزل کا فکری، جذباتی اور جمالیاتی نظام وجود میں آتا ہے۔ اس رشتے کے درمیان رقیب، ہجر، وصال، امید و یاس اور شکایت جیسے عناصر جنم لیتے ہیں جو غزل کو ذاتی تجربے کے بجائے آفاقی بنا دیتے ہیں۔

داغ دہلوی کلاسیکی غزلیہ روایت کے متاخرین شعرا میں سے ہیں۔ ان کی شاعری میں جہاں عاشق کی بے قراری اور تڑپ وجود کا لازمی حصہ ہے، وہیں محبوب کا حسن و جمال اپنی تمام تر کیفیات کے ساتھ عاشق کے دل کو سکون اور قرار بھی عطا کرتا ہے۔ اس غزلیہ فضا میں رقیب بھی آس پاس گھات لگائے موجود ہوتا ہے جو عشقیہ واردات میں کشمکش اور ڈرامائیت پیدا کرتا ہے۔ داغ کی شاعری میں کلاسیکی اور جدید موضوعاتی تنوع واضح طور پر نظر آتا ہے۔ کلاسیکی شاعری کے بیشتر عناصر خواہ وہ مضامین کی نوعیت ہو یا جذبات و کیفیات کا بیان داغ کے کلام میں موجود ہیں، لیکن ان کی انفرادیت اس امر میں ہے کہ وہ تعبیر و تفہیم کی ایسی سہولت فراہم کرتے ہیں جو اکثر کلاسیکی شعرا کے یہاں مفقود نظر آتی ہے۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ کلاسیکیت کا ارتقائی سفر غالب سے گزرتا ہوا داغ کی شاعری میں ایک فطری تکمیل کو پہنچتا ہے۔

داغ کا کلام اپنے ہم عصروں میں نہایت منفرد دکھائی دیتا ہے۔ ان کے کلام کی زبان آسان، رواں اور مقبول عام ہے، وہ اسی سہل زبان میں نہایت عمدہ اور بامعنی مضامین باندھتے ہیں۔ یہ ہنرمندی داغ کو اپنے عہد کے شعرا میں ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔ غالب اور ذوق کے زیر سایہ علمی و شعری روابط نے بھی داغ کی شعری روش پر گہرے اثرات مرتب کیے، تاہم داغ نے ان دونوں اساتذہ کی مشکل پسندی اور دقت طلبی کے برعکس سادہ، شفاف اور عام فہم اسلوب اختیار کیا۔ مومن کی شعری روایت نے بھی داغ کو سہل پسندی اور معاملہ بندی کی طرف مائل کیا جو بعد میں ان کی شاعری کی شناخت بن گئی۔ ان کی شاعری میں سادگی محض سطحی یا عامیانہ وصف نہیں بلکہ ایک شعوری جمالیاتی انتخاب ہے۔ اس سادگی سے مراد یہ ہے کہ شعر میں باندھا گیا مضمون قاری پر بلا رکاوٹ منکشف ہو سکے۔ اس نکتے کی وضاحت حالی نے ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں اس طرح کی ہے کہ کلام کی سادگی کا معیار یہ ہونا چاہیے کہ خیال کیسا ہی بلند ہو اور دقیق ہو مگر پیچیدہ اور ناہموار نہ ہو۔

داغ کی شاعری کا ایک اور اہم وصف ان کی شعری حکمتِ عملی ہے، جس کی بنیاد زور کلام اور صفائی مضمون پر ہے۔ ان کے یہاں مضمون میں کسی قسم کی الجھن یا غیر ضروری پیچیدگی نظر نہیں آتی۔ اس نکتے کو پروفیسر احمد محفوظ نے اپنے مضمون ''داغ کی شعری حکمت عملی کے چند پہلو'' میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''داغ کی شعری حکمت عملی کا ایک نہایت اہم پہلو زور بیان ہے۔ ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ بیان کا زور وہیں زیادہ کارفرما ہوتا ہے، جہاں کلام میں برجستگی کی صفت زیادہ ہوتی ہے۔ اور برجستگی کے لیے عام طور سے کلام کی صفائی ضروری خیال کی جاتی ہے۔ اس صفت کو کلاسیکی ادبی تہذیب میں صفائی بیان، صفائی کلام اور صفائی گفتگو وغیرہ الفاظ سے ظاہر کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ اس سے زبان کی صفائی مراد نہیں ہے، بلکہ اس سے مضمون کو ایسے پیرائے میں ادا کرنا مراد ہے، جس میں کوئی الجھاو کی کیفیت نہ پائی جائے۔ اس طرح دیکھا جائے تو صفائی بیان، برجستگی اور زور بیان سب ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔''[1]

داغ کی زبان اور شعری ذوق استاد ذوق کی سرپرستی میں پروان چڑھا۔ ذوق کی شاعری میں دہلی کی بامحاورہ زبان جس کثرت سے استعمال ہوئی ہے، اس کا اثر داغ کے یہاں بھی نمایاں ہے۔ اسی لیے داغ کی شاعری میں سہل، رواں اور محاوراتی زبان کا غلبہ ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں جذبات کی فراوانی ہے؛ عاشق کی داخلی کیفیات اس طرح ابھرتی ہیں کہ قاری ان کی تڑپ اور اضطراب کو براہ راست محسوس کرتا ہے۔ اس اعتبار سے داغ نے مجازی عشقیہ شاعری کے دائرے کو وسعت دینے میں اہم کارنامہ انجام دیا۔

داغ کے یہاں عشقیہ جذبات کے بیان میں معاملہ بندی کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ معاملہ بندی کے سبب رقیب جیسے کردار کو ان کی شاعری میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس ضمن میں داغ، مومن کی روایت کی پیروی کرتے دکھائی دیتے ہیں، کیوں کہ مومن کے کلام میں بھی معاملہ بندی کے وصف نے رقیب کو ایک باقاعدہ شعری کردار بنا دیا ہے۔ معاملہ بندی دراصل اردو غزل کا ایک نفسیاتی اور خارجی پہلو ہے، جس کے ذریعے حسن و عشق کی واردات کو مجرد صورت دی جاتی ہے۔ اگرچہ اس خارجیت سے غزل کے داخلی امکانات

میں کسی حد تک محدودیت پیدا ہوتی ہے مگر رنگینیت، شوخی اور جذباتی شدت کے ذریعے اس کمی کی تلافی ہوجاتی ہے۔فراق گورکھپوری نے اپنی کتاب ''اردو کی عشقیہ شاعری'' میں معاملہ بندی کے تصور پر نہایت وقیع اور مفصل بحث کی ہے۔فراق کے نزدیک معاملہ بندی محض عشقیہ واردات کا سطحی بیان نہیں بلکہ یہ نفسیات کے اس شعبے سے تعلق رکھتی ہے جسے حرکات وسکنات (Behaviorism) کہا جاتا ہے۔ وہ معاملہ بندی کو خارجی محاکات کا نام دیتے ہیں اور اس کی جمالیاتی اور اساسی اقدار کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خارجی محاکات جسے عام طور پر معاملہ بندی کہتے ہیں نفسیات (Psychology) کے اس شعبے سے متعلق ہے جسے حرکات وسکنات (Behaviorism) کہتے ہیں۔ معاملہ بندی میں داخلیت تو نہیں ہوتی لیکن لطیف مصوری اور رنگینی کا اس میں نہایت دل کش عنصر ہوتا ہے۔۔۔لیکن معاملہ بندی والی شاعری کے لیے یہ لازمی نہیں کہ وہ سوقیانہ ہو یا سطحی ہو۔ احتیاط اور بچاؤ سے کام لیا جائے تو معاملہ بندی کے اشعار میں بھی پاکیزگی کا امکان ہے۔شرط یہ ہے کہ خارجیت کو نکھارا بھی جائے اور اسے کچھ دبایا بھی جائے۔ اس میں داخلیت کا امتزاج ہو اور لب ولہجہ میں وضاحت اور کنایہ، شوخی اور سنجیدگی کا میل ہو۔ معاملہ بندی کے ساتھ اردو غزل کی عشقیہ شاعری اپنی ہمہ گیر وسعتوں سے ذرا ہٹ آئی۔اب حقائق اور معارف کچھ اتر کر مخصوص طور پر مجازی حسن وعشق کے تاثرات کا اظہار شروع ہوتا ہے۔لیکن معنویت کی کمی حسن وعشق کی دل فریب رنگینیوں اور کیفیتوں سے ہوجاتی ہے۔''[2]

فراق کی یہ توضیح داغ دہلوی کی عشقیہ شاعری کو سمجھنے میں کلیدی اہمیت رکھتی ہے، کیوں کہ داغ کی غزلوں میں معاملہ بندی نہ تو محض خارجی واقعہ نگاری ہے اور نہ ہی سطحی جذباتیت، بلکہ اس میں شوخی اور رنگینی کے ساتھ سادگی اور نزاکت کا حسین امتزاج ہے،اس لیے داغ کے یہاں رقیب، وصل، ہجر اور شکایت جیسے عناصر محض واقعات نہیں رہتے بلکہ ایک نفسیاتی فضا قائم کرتے ہیں۔

یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ذوق اور مومن دونوں داغ کی شاعری کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مشاعروں میں داغ کے کلام کو غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوتی تھی۔ داغ کی زبان میں شائستگی، سلاست اور روانی اس حد تک موجود تھی کہ غالب جیسے عظیم شاعر بھی اس کے معترف نظر آتے ہیں۔اس ضمن میں ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنے مضمون ''غالب اور داغ'' میں نثار علی شہرت کے حوالے سے غالب کا ایک نہایت معنی خیز واقعہ نقل کیا ہے:

''ایک روز میں غالب کی خدمت میں حاضر ہوا۔اس وقت آپ کھانا نوش فرما رہے تھے۔ میں مؤدب ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔پھر فرمانے لگے۔دہلی والوں کی جو اردو ہے (جس کو مشک وعنبر کہنا چاہیے) اس کو ہی اشعار میں لکھنا چاہیے۔آخر عمر میں تو ہماری یہی رائے قائم ہوئی ہے۔ میں نے ادب کے ساتھ گزارش کی کہ داغ کی اردو کیسی ہے۔فرمانے لگے ایسی عمدہ کہ کیا کسی کی ہوگی۔ ذوق نے اردو کو اپنی گود میں پالا تھا۔ داغ اس کو نہ صرف پال رہا ہے بلکہ تعلیم دے رہا ہے۔''[3]

یہ اقتباس داغ کی لسانی عظمت کا اعتراف ہے اور داغ دہلوی بلاشبہ دہلی کی کلاسیکی اردو روایت کے آخری عظیم نمائندوں میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ ذوق نے جس زبان کی پرورش کی، داغ نے اسی زبان کو تہذیبی وقار، عشقیہ نزاکت اور عام فہم اظہار کے لیے ایک نئی توانائی عطا کی۔

داغ کی عشقیہ شاعری کی تفہیم میں ان کی ذاتی زندگی کا ایک پہلو بھی اہمیت رکھتا ہے۔داغ کو منی بائی جو حجاب کے تخلص سے شاعری کرتی تھیں، سے گہری انسیت بلکہ محبت تھی۔ اس تعلق نے جہاں داغ کی عشقیہ شاعری کو شدت، تجربے اور سچائی عطا کی، وہیں اس نے انھیں ذہنی کرب اور سماجی آزمائشوں سے بھی دوچار کیا۔کلکتہ کا سفر، رقیبوں کی چشمک اور معاشرتی دباؤ یہ سب تجربات داغ کے لیے کسی بھی طور خوش گوار ثابت نہ ہوئے۔ تاہم ان تمام تر اضطراب کے باوجود داغ کا عشق دبنے کے بجائے اور زیادہ نکھر کر سامنے آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ داغ کے اشعار میں عشق محض خیالی واردات نہیں بلکہ جیتی جاگتی، آزمودہ اور محسوس کی ہوئی حقیقت بن کر جلوہ گر ہوتا ہے۔ڈرامہ منی بائی کا اقتباس دیکھیں جو داغ دہلوی کی دلی کیفیات، عشقیہ اضطراب اور رقیب کے احساسِ کمتری کو نہایت موثر انداز میں آشکار کرتا ہے۔ یہ مکالمہ داغ کے شعور اور نفسیاتی کشمکش کا آئینہ دار ہے:

حجاب: میری زبان میں یہ طاقت کہاں کہ ہر بات کا جواب شعر سے دوں لیکن قسم کھا کے کہتی ہوں کہ آپ سے ملنے کے لیے بہت بے چین تھی۔

داغ: منی بائی عاشقوں کو تڑپانا معشوق کا ہمیشہ سے وطیرہ رہا ہے۔لیکن میرا تڑپنا کسی معمولی عاشق کا تڑپنا نہیں۔ میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ دل دینا کسے کہتے ہیں اور وہ بھی ایسے کو جو رقیب کے پہلو میں بیٹھ کر جلانے میں لطف حاصل کرے۔ میرا دل جل کر کباب ہوا جا رہا ہے لیکن تمھیں کاہے کو خبر ہوگی اور ہو بھی تو تمھیں میری فکر کیوں ہو۔ جانتی ہو چھوٹے نواب حاکم کے بھائی ہیں اور داغ صرف ایک شاعر۔ وہاں دولت ہے جاہ ہے حکومت ہے۔[4]

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ داغ نے عاشق کے احوال کو محض خارجی واقعات کے بیان تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اس کے جذبات وخیالات کی تہوں میں اتر کر اس کی تعبیر کی ہے۔ داغ کے یہاں عاشق کا طرہ امتیاز یہی ہے کہ وہ معشوق پر فدا اور اس کی ایک ایک ادا پر اپنا سب کچھ نثار کرنے کو آمادہ نظر آتا ہے۔تاہم شعری سطح پر یہ سب کیفیات علامتوں کے پیکر میں ڈھل جاتی ہیں۔ یوں عشق میں درپیش پریشانیاں دراصل ان داخلی غموں کی علامت بن جاتی ہیں جنھیں شاعر اپنے تجربے اور مشاہدے سے محسوس کرتا ہے۔اسی علامتی تناظر میں ان میری شمل کی کتاب ''رقص شرر (مترجم: قاضی افضال حسین) کا یہ اقتباس نہایت بامعنی ہے، جس میں عشق کو اذیت، اندوہ اور تطہیرِ باطن کے استعارے کے طور پر دیکھا گیا ہے:

''مسلسل اذیت اور اندوہ سے عشق ثابت ہوتا ہے۔ جیسے سونا تپ کر کندن ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے شاعر کبھی عشق کے ان شدائد کے لیے پیکر تراشتے نہیں تھکتے؛ بلبل الوہی حسن و وقار کی درخشاں علامت گلاب کی زخم خوردہ ہے۔ یا دیوانہ عاشق مجنوں جو صحرا میں جانوروں سے اپنے معشوق کی باتیں کرتا ہے یا فریب خوردہ فرہاد جو ملکہ شیریں کا پجاری ہے۔ (یہ عشق کے اسی رنج واندوہ کی علامتیں ہیں)''[5]

داغ کے یہاں عاشق کے احوال وکوائف چاکِ گریباں کی طرح صاف اور شفاف نظر آتے ہیں۔اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ داغ نے ان کیفیات کو محض تخیل کے زور پر نہیں برتا بلکہ انھیں اپنی ذاتی زندگی میں برتا اور جھیلا ہے۔ حسد، رشک اور رقیب کی بدعملی پر غصہ، یہ سب جذبات داغ کی شاعری میں پوری شدت کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں، اسی لیے عاشق ہر آن سب کچھ لٹانے پر آمادہ دکھائی دیتا ہے:

جو تجھ کو پایا تو کچھ نہ پایا، یہ خاک داں ہم نے خاک پایا
جو تجھ کو دیکھا تو کچھ نہ دیکھا، تمام عالم خراب دیکھا

کہتی ہے مری قبر پہ رو رو کے محبت
یوں خاک میں ملتے ہوئے ارماں نہیں دیکھا

داغ کی شوخ پسند طبیعت نے انہیں منی بائی کے

علاوہ بھی دیگر معاشقوں کی طرف مائل کیا، جن سے انھیں عشق کے مختلف تجربات حاصل ہوئے۔ عام طور پر عشقیہ شاعری میں عاشق کا بنیادی مطالبہ وصال ہوتا ہے، مگر داغ کے یہاں ایک نیا اور نفسیاتی طور پر پیچیدہ پہلو سامنے آتا ہے۔ یہ احساس کہ معشوق کو پا لینے کے بعد بھی عاشق سیراب نہیں ہوتا۔ محبوب پر قابو پانے کی خواہش تو پیدا ہوتی ہے، لیکن عاشق اس قابو کے لطف کو بھی برقرار رکھنا چاہتا ہے:

یہ شوق، یہ ارمان، یہ حسرت، یہ تمنا
کیا ہو مرے قابو میں تم آ جاؤ اگر آج

ان کے کلام میں عاشق، معشوق کی چھیڑ چھاڑ اور ناز و انداز سے خاص لطف اٹھاتا ہے۔ کلاسیکی شعرا میں اس نوع کی شوخی نسبتاً کم ملتی ہے، تاہم داغ کے متعدد معاشقوں کے باعث ان کی شاعری میں شوخ پسندی اور چلبلا پن نمایاں ہو گیا ہے۔ اگرچہ سودا کے یہاں بھی اس مزاج کی جھلک ملتی ہے، مگر داغ نے اسے ایک مستقل عشقیہ رویّے کے طور پر برتا ہے۔ عاشق کا چلبلا مزاج گویا اس کا ذوق بن جاتا ہے، جس کے ذریعے وہ معشوق سے قربت اور بے تکلفی قائم رکھتا ہے:

ان کو بغیر چھیڑ کیے چین ہی نہیں
کتنی شریر طبع ہے کیا چلبلا مزاج
دل لگی ہو یا ہنسی یا چھیڑ چھاڑ
ہوتے ہیں پیاروں کے پیارے ذوق، شوق

اس طرح داغ دہلوی کی عشقیہ شاعری میں عاشق ایک جیتا جاگتا، جذباتی طور پر متحرک اور نفسیاتی طور پر پیچیدہ کردار بن کر سامنے آتا ہے، جس میں کلاسیکی روایت کی پاس داری ہے اور ذاتی تجربے کی تازگی بھی۔ یہی امتزاج داغ کی شاعری کو اپنے عہد میں منفرد اور بے مثال بناتا ہے۔

داغ دہلوی کی شاعری میں محبوب کا سراپا جس فنی مہارت، جمالیاتی شعور اور حسی تجربے کے ساتھ کھینچا گیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ داغ نے معشوق کے حسن و جمال سے نجی اور ذاتی سطح پر محظوظ ہو کر اس تجربے کو شعری پیکر میں ڈھالا ہے، اور یہ وصف ان کے ہم عصر شعرا کے یہاں کم ہی نظر آتا ہے۔ محبوب کا سراپا بیان کرنا اردو شاعری میں عاشق کا سب سے محبوب مشغلہ رہا ہے، لیکن داغ کے یہاں یہ بیان محض روایت کی تقلید نہیں بلکہ ایک زندہ، متحرک اور محسوس کی ہوئی جمالیات کی ترجمانی ہے۔ داغ کے نزدیک معشوق کا حسن گویا انقلابِ زمانہ ہے اور اس حسن کا ٹھہر جانا وقت اور احساس کے رک جانے کے مترادف ہے۔ معشوق کی زلفیں سنوارنا، اس کی مختلف اداؤں کو آشکار کرنا ہے— کبھی عاشق کو جلانے کے لیے اور کبھی اپنے ناز و نخرے دکھانے کے لیے۔ اس تناظر میں معشوق کے حسن و سراپا کے بیان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ جب چلے تو قیامت بپا تھی چاروں طرف
ٹھہر گئے تو زمانے کو انقلاب نہ تھا
زلفیں نہیں کہ شانے سے آراستہ کیا
بگڑا ہوا مزاج بنایا نہ جائے گا

داغ کے یہاں معشوق محض سراپا حسن نہیں بلکہ ایک بااختیار اور خودسر کردار بھی ہے۔ وہ بے رحم بھی ہے اور بے توجہی اس کا شیوہ بھی۔ اگرچہ اس نوع کے مضامین کلاسیکی شعرا کے یہاں بھی ملتے ہیں، لیکن داغ کے بیان میں ایک الگ طرح کا جمالیاتی ذوق، نزاکت اور نفسیاتی گہرائی پائی جاتی ہے۔ معشوق کے تیکھے اور بے نیازی سے بھرپور الفاظ عاشق کے دل پر سخت گراں گزرتے ہیں، کیوں کہ عاشق کے اضطراب کو کم کرنے کی طاقت بھی محبوب کے الفاظ ہی رکھتے ہیں۔ معشوق کا بے التفاتی بھرا لب و لہجہ داغ کے یہاں یوں جلوہ گر ہوتا ہے:

کہا ظالم نے میرا حال سن کر
وہ اس جینے سے مر جائے تو اچھا

داغ نے جہاں محبوب کے حسن و جمال کی تعریف میں بے دریغ الفاظ صرف کیے ہیں، وہیں انھوں نے معشوق کی مختلف اداؤں کو نہایت خوب صورت پیرائے میں پیش کیا ہے۔ ان وارداتوں میں خوبیاں بھی ہیں اور خامیاں بھی۔ معشوق کی شوخی، ظرافت اور نزاکت داغ کے کلام میں خاص طور پر نمایاں ہیں۔ معشوق کا حسن قیامت خیز محسوس ہونا اور اس کے نتیجے میں عاشق کا اضطراب بڑھ جانا عشقیہ کیفیت کی شدت کو ظاہر کرتا ہے:

ہزار پردوں میں مشتاق دیکھ لیتے ہیں
اسے حجاب تھا، موسیٰ کو تو حجاب نہ تھا
کل اس نگاہ میں شوخی تھی کس قیامت کی
لڑا ہوا تو مرے دل کا اضطراب نہ تھا

داغ کے یہاں عاشق کے جذبات معشوق کے لیے نہایت شدید ہیں۔ عاشق کو ہر وہ شے ناپسند ہے جس میں معشوق کا عکس نظر آئے، کیوں کہ اسے اندیشہ رہتا ہے کہ کوئی اور بھی اس حسن تک رسائی حاصل نہ کر لے۔ یہاں تک کہ معشوق کی تصویر بھی عاشق کو گوارا نہیں، کیوں کہ محبوب کا تصور وہ صرف اپنے دل و دماغ تک محدود رکھنا چاہتا ہے:

ہم شکل ترا کوئی بھی دیکھا نہیں جاتا
ہم تو تری تصویر سے بھی چیں بجبیں ہیں

عاشق و معشوق کے دلی جذبات کے اظہار کے اعتبار سے داغ کی شاعری اپنے عہد کی نمائندہ اور بہترین عشقیہ شاعری شمار کی جاتی ہے۔ یہ بات بھی مسلم ہے کہ اگر داغ محض قدما کی اندھی تقلید کرتے تو ان کی زبان عوام کے قریب نہ آ پاتی۔ داغ نے مانوس، سبک اور سہل الفاظ کا انتخاب کیا، جو ان کے عہد کا اہم تقاضا تھا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ زندگی کے آخری دور میں خود غالب بھی سہل پسندی کی طرف مائل دکھائی دیتے ہیں۔ میر کی شعری روایت نے بھی شعرا کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا تھا کہ شاعری کو عوام سے جوڑنے کے لیے سبک اور سلیس زبان ناگزیر ہے۔

داغ نے مشکل پسندی کا وہ عہد بھی دیکھا جہاں شاہ نصیر اور شیخ ذوق کی زبان دانی نے شاعری کو ایک محدود دائرے میں مقید کر دیا تھا، اور غالب کی فارسی زدہ اردو شاعری بھی ان کے سامنے تھی۔ تاہم مومن اس دور کے واحد شاعر تھے جن کے یہاں مشکل پسندی کو حد سے زیادہ دخل حاصل نہ تھا۔ یہی تاریخی اور ادبی پس منظر داغ کی شاعری میں ایک فیصلہ کن موڑ ثابت ہوا، اور یہی تسہیلِ زبان ان کے کلام کے زبان زدِ عام ہونے کی سب سے بڑی وجہ بنی۔ اس طرح داغ نے اردو شاعری میں جو چراغ روشن کیا، اسے بجا طور پر اردو شاعری کی سہل پسندی کا عہد زرّیں کہا جا سکتا ہے۔

حوالہ جات

1 سہ ماہی، اردو چینل، جلد 19، شمارہ 2، مدیر ڈاکٹر قمر صدیقی، http://www.urduchannel.in/dagh-ki-sheri-hikmat-e-amli-ahmed-mahfooz/

2 اردو کی عشقیہ شاعری، فراق، کراچی، مکتبہ عزل و عمل، 1966، ص 91/93/94

3 داغ دہلوی نمبر، مرتبہ: شاہد ماہلی، نئی دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ، 2001، ص 37/38

4 مئی بائی حجاب، سید محمد مہدی، الہ آباد، انجمن تہذیب نو پبلیکیشنز ڈیویژن، 1978، ص 17/18

5 رقص شرر، پروفیسر ان میری شمل، مترجم: قاضی افضال حسین، نئی دہلی، غالب اکیڈمی، 2001، ص 19/20

■

Tariqul Abdeen
Research Scholar
Jawahar Lal Nehru University
New Delhi

تبصرہ وتعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے اور کتاب کے مشمولات کے تعلق سے قارئین کو اہم معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت پائی جاتی ہے۔ قدیم رسائل ومجلات نے نئی مطبوعات سے متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ تبصرہ ایک ذمہ داری کا عمل بھی ہے۔ اس لیے مبصرین کو تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، طوالت، تحسین اور نکتہ چینی سے گریز کرتے ہوئے کتاب کے اہم نکات پر اظہار خیال کرنا چاہیے۔ رسالے میں اردو زبان و ادب سے متعلق انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں شائع ہونے والی کتابوں پر تبصرے بھی شامل کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا مبصرین اس جانب بھی توجہ فرمائیں۔ (ادارہ)

وکست بھارت کا وژن اور اردو زبان

تشکیل و ترتیب: ڈاکٹر شمس اقبال
صفحات: 430، قیمت: 250 روپے، پہلی اشاعت 2026
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
مبصر: نہاں رباب، دہلی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی تازہ ترین مطبوعات میں شامل کتاب ''وکست بھارت کا وژن اور اردو زبان'' عصرِ حاضر کے فکری اور تہذیبی مباحث میں ایک وقیع اور معنی خیز اضافہ ہے۔ اس کتاب کی تدوین وترتیب ڈاکٹر شمس اقبال نے نہایت سلیقے اور فکری شعور کے ساتھ انجام دی ہے۔ اس میں قومی اردو کونسل کی عالمی اردو کانفرنس 2025 اور پٹنہ میں منعقدہ سیمینار میں پیش کیے گئے مقالات کو منظم ابواب کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ یوں یہ تصنیف محض مقالات کا مجموعہ نہیں رہتی بلکہ ایک مربوط فکری دستاویز کی صورت اختیار کر لیتی ہے، جو موجودہ قومی منظرنامے میں اردو زبان کے کردار، امکانات اور چیلنجز کا سنجیدہ وعمیق جائزہ پیش کرتی ہے:

''یہ کتاب اس حقیقت کی عکاسی کرتی ہے کہ اردو زبان محض شاعرانہ تخیل پرواز اور روایتی تخلیقی رومان پروری کی زبان نہیں، بلکہ اس کی تخلیقات میں قومی امنگوں اور وطنی آرزوؤں کی تکمیل کے عناصر بخوبی موجود ہیں۔ ساتھ ہی اس میں معاصر اردو دنیا کے لیے تحریک وترغیب کا سامان اور ایک دعوت فکر بھی مضمر ہے کہ ہم اپنے ادب کو موضوعاتی اعتبار سے جامد و یک رخا رکھ کر اردو زبان کو ترقیات سے ہم کنار نہیں کر سکتے۔''

اس کتاب کا مرکزی محور ''وکست بھارت'' کے تصور کو اردو زبان کے تناظر میں سمجھنا اور اس کے باہمی تعلق کو واضح کرنا ہے۔ ''وکست بھارت'' ایسے ہندوستان کا خواب ہے جو معاشی اعتبار سے مستحکم، سماجی سطح پر مساوی، تکنیکی طور پر ترقی یافتہ اور ثقافتی لحاظ سے متحرک وزندہ ہو۔ اس وژن میں ترقی کا مفہوم محض اقتصادی خوشحالی تک محدود نہیں بلکہ تعلیم، صحت، سماجی انصاف، مواقع کی برابری اور پائیدار ترقی جیسے عناصر بھی اس میں شامل ہیں۔ کتاب کے مقالات اسی وسیع تناظر میں اردو کی معنویت کو اجاگر کرتے ہوئے یہ ثابت کرتے ہیں کہ قومی ترقی کے اس ہمہ گیر سفر میں اردو کو نظر انداز کرنا دانش مندی نہیں ہوگی۔

کتاب کی نمایاں خصوصیات میں اس کی موضوعاتی ترتیب قابلِ ذکر ہے۔ ذیلی ابواب جیسے ''وکست بھارت کا وژن اور اردو''، ''اردو اور نسلِ نو کی تعلیم''، ''اردو فکشن میں سماجی و ثقافتی جہات''، ''اردو شاعری میں ہندوستان کی تعمیر وترقی کا وژن''، ''اردو زبان اور جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی''، ہندوستانی نالج سسٹم اور قومی وراثت: اردو تراجم کے آئینے میں''، ''ملک کی تعمیر وترقی میں اردو صحافت کا کردار'' اور ''اردو کی نئی بستیاں'' موضوع کی وسعت اور تنوع کو نمایاں کرتے ہیں۔ یہ تقسیم اس حقیقت کی غمازی بھی کرتی ہے کہ اردو زبان محض ادبی اظہار کا وسیلہ نہیں بلکہ فکری، تعلیمی، تہذیبی اور سماجی میدانوں میں بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔ اس منظم ترتیب کے باعث قاری مختلف زاویوں سے

اردو کے امکانات کا مطالعہ کرنے کے قابل ہوجاتا ہے۔

''اردو اور نسلِ نو کی تعلیم'' کے عنوان سے شامل مقالات خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ نئی نسل کی فکری تشکیل اور قومی شعور کی آبیاری میں زبان بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ اگر تعلیم کو معاشرتی ارتقا اور خود انحصاری کا ذریعہ سمجھا جائے تو یہ ناگزیر ہوجاتا ہے کہ اردو کو جدید سائنسی، تکنیکی اور سماجی علوم سے ہم آہنگ کیا جائے۔ کتاب اس امر پر زور دیتی ہے کہ صرف ماضی کی ادبی عظمت پر تکیہ کرنا کافی نہیں بلکہ اردو کو عصری تقاضوں سے جوڑ کر مستقبل کی فعال زبان بنانا ہوگا۔

اردو فکشن اور شاعری کے باب میں بھی نہایت سنجیدہ اور فکر انگیز مباحث پیش کیے گئے ہیں۔ اردو ادب نے ہر عہد میں اپنے زمانے کے مسائل، جذبات اور تہذیبی شناخت کو زبان دی ہے۔ امیر خسرو سے لے کر میر، غالب، انیس و دبیر، نظیر اکبر آبادی، پریم چند، فراق گورکھپوری اور قرۃ العین حیدر تک ایک درخشاں ادبی روایت موجود ہے جس نے ہندوستانی معاشرے کی روح کو الفاظ میں ڈھالا ہے۔ کتاب کے مضامین اسی روایت کو ''وکست بھارت'' کے تناظر میں پرکھتے ہوئے یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ آیا معاصر اردو ادب قومی ترقی کے مباحث میں فعال اور مؤثر کردار ادا کر رہا ہے؟ یہ سوال نہایت اہم ہے، کیونکہ ادب اگر عصری مسائل سے لاتعلق ہوجائے تو اس کی معنویت محدود ہوکر رہ جاتی ہے۔ اس لیے کہ کسی بھی زبان کے ادب میں روایت اور جدت کی آمیزش ہمیشہ اہم رہی ہے۔ ادب ماضی کی بازیافت کے ساتھ حال کے مشاہدات اور مستقبل کے امکانات کو ایڈریس کرتا ہے۔ اگر اس میں کسی پہلو کی نمائندگی نہیں ہوسکی تو پھر ادب کا ناقص تصور ہی سامنے آتا ہے۔

اردو اور جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی کے باہمی تعلق پر بحث اس کتاب کا ایک نہایت اہم اور عصری پہلو ہے۔ موجودہ دور میں ڈیجیٹل پلیٹ فارمز، مصنوعی ذہانت اور آن لائن ذرائع ابلاغ نے زبانوں کے استعمال اور اثر پذیری کو یکسر تبدیل کر دیا ہے۔ اگر اردو کو قومی اور عالمی سطح پر مؤثر بنانا ہے تو اسے ٹیکنالوجی کے میدان میں مستحکم بنیادیں فراہم کرنا ہوں گی۔ یونی کوڈ کی ترویج، ڈیجیٹل آرکائیوز کی تشکیل، آن لائن صحافت کا فروغ اور سوشل میڈیا کے تخلیقی استعمال جیسے امور پر سنجیدہ توجہ ناگزیر ہے۔ کتاب اس حوالے سے فکری رہنمائی فراہم کرتی ہے اور اردو کے مستقبل کو ڈیجیٹل عہد سے مربوط کرنے کی ضرورت پر زور دیتی ہے۔

''ہندوستانی نالج سسٹم'' اور قومی وراثت کے باب میں اردو تراجم کی اہمیت بھی نمایاں کی گئی ہے۔ ہندوستانی تہذیب و تمدن کا علمی سرمایہ مختلف زبانوں میں منتشر ہے۔ اردو نے ماضی میں سنسکرت، فارسی، عربی اور دیگر زبانوں کے علوم کو اپنے دامن میں سمیٹ کر علمی پل کا کردار ادا کیا ہے۔ آج بھی قومی وراثت کو نئی نسل تک منتقل کرنے کے لیے ترجمہ نگاری کو فعال اور منظم بنانا ضروری ہے۔ کتاب کے مقالات اس سمت میں واضح رہنمائی فراہم کرتے ہیں اور اردو کو علمی رابطے کی مؤثر زبان بنانے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔

اردو صحافت کے کردار پر مباحث بھی کتاب کی اہم کڑی ہیں۔ آزادی کی تحریک کے دوران اردو صحافت نے قومی شعور کی بیداری میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ آج کے دور میں بھی اسے ترقی، تعلیم، سماجی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی جیسے موضوعات کو فروغ دینے میں فعال کردار ادا کرنا ہوگا۔ ''وکست بھارت'' کے خواب کی تعبیر میں میڈیا کی حیثیت کلیدی ہے اور اردو صحافت اس ذمہ داری کو نہایت وقار کے ساتھ نبھا سکتی ہے۔

اس کتاب کا اسلوب مجموعی طور پر سنجیدہ، مدلل اور متوازن ہے۔ جذباتی نعروں کے بجائے فکری استدلال اور علمی مکالمے کو ترجیح دی گئی ہے۔ ماضی کی روایت، حال کے تقاضے اور مستقبل کے امکانات کو یکجا کر کے ایک جامع فکری منظرنامہ ترتیب دیا گیا ہے۔ تاہم بعض مقامات پر یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ عملی لائحۂ عمل کی مزید وضاحت کی جاسکتی تھی تاکہ نظری مباحث کے ساتھ عملی حکمتِ عملی بھی زیادہ واضح صورت میں سامنے آتی۔

مجموعی اعتبار سے ''وکست بھارت کا وژن اور اردو زبان'' ایک اہم اور بروقت فکری کاوش ہے جو اردو زبان کو قومی ترقی کے وسیع بیانیے سے مربوط کرتی ہے۔ یہ کتاب اس حقیقت کی یاددہانی کراتی ہے کہ زبانیں محض ابلاغ کا ذریعہ نہیں ہوتیں بلکہ قومی شناخت، تہذیبی شعور اور مستقبل کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔ اگر اردو اپنی درخشاں روایت کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے مستقبل کی سمت پیش قدمی کرے تو وہ یقیناً ''وکست بھارت'' کے خواب کی تعبیر میں مؤثر، مثبت اور تخلیقی کردار ادا کرسکتی ہے، اور اس کے سرمائے میں متنوع چیزیں بھی شامل ہوسکتی ہیں جن سے 'وکست بھارت' کے لیے تیار ہورہے ذہن کی بہترین تربیت اور آبیاری ہوسکتی ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159 E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

ماحولیاتی ادبی تنقید

مرتب: ارتضیٰ کریم

قیمت:600، روپے، سنہ اشاعت2025

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

مبصر: پروفیسر قدوس جاوید
27، گرین ہیلز، بھاٹنڈی، جموں -181152

میر کا ہر سخن مقام سے ہے:

وقفہ،وقفہ سے سمندر منتھن کرکے اردو دنیا کو نت نئے ادبی لعل و گہر سے روشناس کروانا، پروفیسر ارتضیٰ کریم کی فطرت ہے۔ ''ماحولیاتی ادبی تنقید'' موصوف کی تنقیدی شانِ کریمی کی نئی کروٹ ہے۔ گزشتہ پچاس، ساٹھ برسوں کے دوران 'اردو فکشن کی تنقید'، 'عجائب القصص'، 'گریز'، 'نوطرز مرصع'، 'خواجہ احمد عباس'، 'سہیل عظیم آبادی'، 'قرۃ العین حیدر'، 'انتظار حسین' جیسے تاریخ ساز کارناموں کے بعد بھی ارتضیٰ کریم نے اردو تنقید و تحقیق ،ترتیب و تدوین میں اور کیسے کیسے گراں قدر اضافے کیے ہیں اس کا حساب رکھنا غمِ جہاں کا حساب رکھنے سے کم نہیں۔ پیش لفظ میں اردو تنقید کے بدلتے منظر نامہ کے حوالے سے ،تنقید کی معتبر شاخ ''ماحولیاتی تنقید'' (ECO.CRITICISM) کی بصیرت مندانہ توضیح و تعبیر کی ہے۔ ارتضیٰ کریم کی تحقیق ہے کہ، دسویں صدی ہجری میں بغداد اور بصرہ کے علمائے ماحولیات کے متعلق جو مباحث اور فرمودات میں ماحولیاتی ادبی تنقید کی خوشبو محسوس کی جا سکتی ہے۔ ماحولیات سے متعلق عرب علما کے بعض افکار و خیالات کو مولوی اکرام علی نے عربی سے اردو میں ترجمہ کرکے 1939 میں شائع کر دیا تھا۔ لیکن امداد امام اثر کی تالیف 'کتاب الاثمار' (1887) اردو میں 'ماحولیات' پر پہلی باضابطہ کتاب ہے۔ اس کتاب میں سرور الہدیٰ نے ،دیہی زندگی کی تصویر کشی کرنے والی شاعری (Pastora Poety) کے بعض نمونوں سے بحث کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وسطی دور میں گاؤں دیہاتوں کی زندگی اور معاشرت میں تعصبات اور بیجا توقعات سے ماورا اور نظام فطرت سے ہم رشتہ ماحول میں توازن و تناسب قائم رکھنے کے، کیسے کیسے آداب کی پیروی عام تھی لیکن آج جدت پسندی کے عنوان سے ، ماحول کو خوشگوار رکھنے والے آداب و اقدار پر Consumer Culture کی زائیدہ تقلیدی جدت پسندی کی گرد جم رہی ہے اور اس کے بطن سے ماحول میں 'روز اک تازہ تماشا' نئے عنوان کے ساتھ ظہور پذیر ہوکر ماحولیاتی پراگندگی کا سبب بن رہا۔ ارتضیٰ کریم کا اس اہم ترین سماجی مسئلے کی جانب توجہ کرنا اور اردو قارئین کی توجہ بھی اس جانب مبذول کروانا ہی اس کتاب کی ترتیب و تدوین کا مقصدِ اصلی ہے۔ 'نیچر' سے قریب خوشگوار ماحول کی تشکیل جدید کے عمل کی تکمیل کے لیے ارتضیٰ کریم نے عتیق اللہ، علی رفاد فتیحی، ناصر عباس نیر، احمد سہیل، سرور الہدیٰ اور رغبت شمیم سے لے کر صوفیہ یوسف، کاشف علی ررخشندہ مراد، طارق ہاشمی ،وغیرہ کی تحریروں کو اپنی کتاب میں شامل کرکے اپنی روایتی فراخ دلی کا ثبوت دیا ہے، کیوں کہ بہر حال ارتضیٰ کریم کی گفتگو عوام سے ہے۔ مقصد بڑا ہو تو دل بھی بڑا رکھنا ناگزیر ہے۔

ماحولیاتی ادبی تنقید میں خاصے کی چیزوں میں اورنگ زیب نیازی کے مقالے ''تانیثی ماحولیات: اردو کے تناظر میں'' کے علاوہ ماحولیات سے متعلق چھ مضامین کے اردو ترجمے بھی نہایت قابل قدر ہیں۔ اس تاریخ ساز تالیف میں اردو کی مختلف اصناف اور شخصیات کے حوالے سے بھی مضامین شامل کیے گئے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ارتضیٰ کریم اپنی ادبی بینائی میں نگاہِ شوق کو شریک کرکے ادبی افکار و نظریات کے ان تازہ جہانوں کو بھی اپنی تنقیدی نظر کی گرفت میں لے لیتے ہیں جن جہانوں تک معاصر ناقدین اور دانشوروں کی رسائی بہت بعد میں ہوتی ہے۔ ویسے اس کتاب میں انتظار حسین ، مجید امجد، اور پروین شیر کے یہاں ماحول نگاری کی نشاندہی خوب تو ہے لیکن بہتر ہوتا اگر برصغیر کے وسیع اور رنگا رنگ ماحولیاتی تناظرات کے مدِ نظر، مختلف اور متضاد سماجی، سیاسی ،معاشی ،لسانی اور ثقافتی ماحول اور معاشرہ میں زندگی گذارنے والے فکشن نگاروں کے ناولوں اور افسانوں میں پیش کیے گئے مثبت اور منفی ماحولیاتی انتشار و بحران کو بھی سمیٹنے کی کوشش کی جاتی۔ اس کتاب ''ماحولیاتی ادبی تنقید'' کے دوسرے حصے میں 'عملی مطالعہ' کے تحت ناصر عباس نیر اور رغبت شمیم ملک کے علاوہ ،کاشف علی / رخشندہ مراد ،طارق ہاشمی ،صوفیہ یوسف، افضل ضیا ،عتیق اللہ محمد اکرام قریشی ،وغیرہ نے ماحولیاتی ادبی تنقید کے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں۔ یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ماحول کا سماجی سیاسی انتشار (Socio. Political Enviorenment) معاشرہ میں Mental Disorder کو راہ دے رہا ہے۔ لہٰذا آج کی تاریخ میں ماحولیاتی ادب یا تنقید کی غرض و غایت کو محض ''شجر و اثمار'' کی اہمیت اقسام اور ،فوائد کی نشاندہی کافی نہیں، اس کے لئے ہندومت اور دین اسلام سمیت تمام مذاہب میں 'سورگ / جنت اور نرک / جہنم' کے حوالے سے اور یونیورسٹیوں کے شعبۂ نباتات کی نصابی کتابوں میں 'کتاب الاثمار' سے کہیں زیادہ معلومات ملتی ہیں۔ عتیق اللہ صاحب نے Eco.criticism کی اصطلاح کے اولین استعمال سے بحث کی ہے، اور 1866,1962,1972 کی تاریخوں کی نشاندہی کی ہے جس کی وجہ سے بقول ارتضیٰ کریم ''ادب کا طالب علم اس فلسفے کے آغاز سے متعلق اشکال کا شکار ہو جاتا ہے۔ دوئم یہ کہ اس کتاب کے بصیرت مندانہ ماحول میں اورنگ زیب نیازی کے چھ (6) ترجموں اور دو مضامین کی روشنی پھیلی ہے۔ عتیق اللہ، علی رفاد فتیحی اور محمد اسحٰق کی تحریریں اس روشنی کی کرنوں کی معنویت میں اضافہ بھی کرتی ہیں اور اردو میں فلسفہ ماحولیات کے لسانی، ادبی اور خصوصاً تنقیدی عمل کے امکانات کی نشاندہی بھی کرتی ہیں۔ آج 2025 میں ماحولیات اور ماحولیاتی ادبی تنقید کے معنی و مفہوم ،طریق کار اور اطلاقی حدود و امکانات کی توضیح و تعبیر کی غرض سے اکیسویں صدی میں اردو نظم و نثر کی شعریات (POETICS) میں 'ذات، زندگی، زمانہ، زبان کے برتاؤ میں مسلسل تغیرات کا ،ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ جاری ہے۔ یہ کتاب روایتی ادبی نظریات اور تنقیدی دبستانوں سے بہت آگے، ماحولیاتی تنقید Marxism,Feminism & Neo-colonialism کے روشن اور تاریک زاویوں اور گوشوں کو بھی نشان زد کر رہی ہے، اس کتاب میں شامل کئی مضامین میں اس ادبی ماحول کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ ارتضیٰ کریم کی اس کتاب میں ماحولیاتی تنقید کے لئے انگریزی کی اصطلاحیں Ecocriticism یا Language Ecology استعمال ہو رہی ہیں۔ برصغیر میں لسانی انتشار بھی ماحولیاتی ادبی تنقید سے توجہ کا تقاضہ کر رہی ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ''مذاہب ہوں یا زبانیں ایک دوسرے کی حریف نہیں بہنیں ہوتی ہیں۔ توقع ہی نہیں یقین ہے کہ ''اردو فکشن کی تنقید'' کی طرح یہ کتاب بھی موضوعی اعتبار سے ایک سنگِ میل ثابت ہوگی اس میں شک و شبہ کی گنجائش کم ہے۔ یوں بھی موضوع کے حوالے سے بہر حال اسے اولین کوشش تو کہا ہی جائے گا۔

اردو فکشن: تفہیم و تجزیہ (تنقیدی مضامین)

مصنف: ابراہیم افسر

صفحات: 240، قیمت: 399 روپے، اشاعت: 2025

ناشر: اصیلا آفسیٹ پرنٹرس، کلاں محل، دریا گنج، نئی دہلی-110002

مبصر: تنویر احمد، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اُردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی-110007

رشید شناسی کے حوالے سے ابراہیم افسر ایک خاص پہچان و اعتبار حاصل کر چکے ہیں اس بات کا اندازہ رشید حسن خاں کے حوالے سے ان کے تحقیقی و تنقیدی کارناموں سے لگایا جاسکتا ہے پیش نظر کتاب ''اردو فکشن: تفہیم و تجزیہ'' سے پہلے ابراہیم افسر کی تقریباً ایک درجن کتابیں منظر عام پر آ کر ادبی حلقوں میں داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

اردو اکادمی دہلی کے تعاون سے شائع ہوئی زیر تبصرہ کتاب اردو فکشن: تفہیم و تجزیہ، مطالعہ رشید سے ہٹ کر فکشن تنقید کے حوالے سے ابراہیم افسر کی پہلی کوشش ہے۔ کتاب کے آغاز میں ''فکشن تنقید کا نیا استعارہ'' کے عنوان سے ڈاکٹر محمد مستمر نے اور ''ابراہیم افسر کی فکشن شناسی'' کے عنوان سے توصیف بریلوی نے ابراہیم افسر کی تحقیق و تنقید پر عمدہ گفتگو کی ہے۔ پیش لفظ میں ابراہیم افسر نے فکشن کے ساتھ اپنی دلچسپی اور کتاب کے وجود میں آنے کے محرکات پر روشنی ڈالی ہے۔ کتاب میں فکشن تنقید کے حوالے سے الگ الگ عنوانات کے تحت مندرجہ ذیل بیس مضامین شامل ہیں۔ ارتضیٰ کریم کی تنقید فہمی 'عجائب القصص' کے تناظر میں، ناول 'غالب' کا تنقیدی تجزیہ، ناول 'دھنورا' کا تجزیاتی مطالعہ، سماجی رزمیہ: ناول 'لفظوں کا لہو'، ناول 'جے این یو کمرہ نمبر 259' کا تنقیدی جائزہ، ڈراما ضحاک کی عصری معنویت، ڈراما اس شکل سے گزری غالب کا تحقیقی و تنقیدی تجزیہ، اردو فکشن کا داستان گو: انتظار حسین، صادق کی فکشن تنقید کا جائزہ، ہیرا نند سوز کی افسانہ نگاری کا تنقیدی جائزہ، طارق جمیل کی افسانہ نگاری کا تنقیدی جائزہ، اردو فکشن کی عہد ساز ادیبہ: بانو آپا، ستیہ پال آنند کے منتخب افسانے کا تنقیدی مطالعہ، ''کہانی محل'' کا تنقیدی جائزہ اور چند معروضات، نفسیاتی تجسس کی ترجمان افسانہ نگار: شائستہ فاخری، نگار عظیم کے افسانوں میں عورت کا بدلتا روپ، احمد رشید (علیگ) کے افسانوں میں اساطیری بیانیہ، افرازی نظام اور جنسی نفسیات کا ترجمان: محمد مستمر، نسل نو کا نمائندہ افسانہ نگار: توصیف بریلوی اور ایک عورت کی نوٹ بک کا تنقیدی جائزہ۔

کتاب میں شامل مضامین نہ صرف تنقید کی فنی کسوٹی پر کھرا اترتے ہیں بلکہ مکمل تنقیدی شعور اور آگاہی کا بین ثبوت ہیں۔ یہ مضامین ابراہیم افسر کے مطالعے کی گہرائی اور گیرائی کی سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ ابراہیم افسر کے یہاں فکر و نظر کے ساتھ تنقیدی زبان بھی سلجھی ہوئی اور عام فہم ہے جس سے قاری کسی الجھن کا شکار نہیں ہوتا۔ کتاب میں شامل پہلے مضمون 'ارتضیٰ کریم کی تنقید فہمی عجائب القصص کے تناظر میں' میں ابراہیم افسر ارتضیٰ کریم کی تنقیدی بصیرت پر گفتگو کرتے ہیں۔ عجائب القصص کا تنقیدی جائزہ ارتضیٰ کریم نے اپنے ایم فل کے مقالے میں پیش کیا تھا۔ ابراہیم افسر اس مضمون میں ارتضیٰ کریم کے تحقیقی مطالعہ کی روشنی میں ایک خاص نقطے کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ اردو داستانوں میں عام فہم اور سادہ اسلوب کے حوالے سے باغ و بہار کے ساتھ ساتھ عجائب القصص بھی اپنی خاص اہمیت و افادیت رکھتی ہے۔ مضمون میں علامہ اقبال کی نظم غلام قادر روہیلہ کی یک طرفہ بیانی کو بھی اپنی گفتگو کا حصہ بنایا ہے۔

مضمون 'ڈراما ضحاک کی عصری معنویت' میں ابراہیم افسر محمد حسن کی ڈراما نگاری بالخصوص ڈرامہ ضحاک کے حوالے سے مدلل گفتگو کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ ڈراما ضحاک صرف ایمرجنسی کا المیہ نہیں ہے بلکہ ہر دور سے وابستہ کہانی ہے۔ ڈرامے میں محمد حسن نے اشتراکیت کی زبان اختیار کر کے جس طرح اشتراکیت کا پرچار کیا ہے اسے بھی زیر بحث لایا ہے، فریدوں کے جملے اس کی بین مثال ہیں۔ سب سے اہم بات موصوف نے ڈرامے کے پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے موجودہ حالات میں ڈرامے کی معنویت پر قابل تحسین گفتگو کی ہے۔ ''ڈراما 'اس شکل سے گزری غالب' کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ'' بھی نہایت عمدہ مضمون ہے۔ یہ مضمون نہ صرف صادق کی تحقیق و تلاش کا پتا دیتا ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ غالب کے سفر کلکتہ اور پنشن کے مقدمات کی روداد بیان کرتا ہے۔ مضمون میں غالب پر لکھے جانے والے ڈراموں کی فہرست کے ساتھ غالب کی ضد، خود داری اور مقاصد کے حصول میں ہمیشہ سرگرداں رہنے کا ذکر بھی ہے۔ صادق کی اردو، ہندی واقفیت پر بھی بات ہوئی ہے۔ غالب کے سفر کلکتہ اور پنشن کے مقدمات کے حوالے سے صادق کے اس ڈرامے کی روشنی میں ابراہیم افسر کا یہ مضمون نہایت معلوماتی ہے۔ جے این یو کمرہ نمبر 259 مضمون میں موصوف نے بڑے بے باک انداز میں ناول کے محاسن و معائب دونوں پر بحث کی ہے خاص کر ناول کے اسلوب میں انشائیہ نگاری کی جھلک اور صحافتی رنگ کی نشاندہی کرتے ہوئے اچھی خاصی تنقیدی گفتگو کی ہے۔

''سماجی رزمیہ ناول لفظوں کا لہو'' مختصر لیکن عمدہ مضمون ہے۔ سلمان عبدالصمد کی نفسیات شناسی یا مطالعہ نفسیات اور ''لفظوں کا لہو'' کے حوالے سے موصوف نے آسان عام فہم زبان میں اہم باتیں کی ہیں موصوف کا یہ جملہ توجہ طلب ہے ''یہ لکھوں کہ ناول نگار نے قاری کی نفسیات کو بھی اپنے قابو میں رکھا تو مبالغہ نہ ہوگا'' مضمون پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ناول نگار نے سماجی مسائل، زرد صحافت، عورتوں کے حقوق و آزادی کے ساتھ زندگی کے دیگر شعبوں کے مسائل پر بات کی ہے۔ ''اردو فکشن کا داستان گو: انتظار حسین'' مضمون میں موصوف نے نہایت سلیقے کے ساتھ انتظار حسین کی ادبی زندگی کو موضوع بحث بنایا ہے، انتظار حسین کے ادبی کارناموں کا ایک اجمالی جائزہ پیش کرتے ہوئے ان کے فکر و فن پر مدلل بحث کی ہے۔ انتظار حسین کی فکشن کے موضوعات، اسلوب و آہنگ اور فنی انفرادیت پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ انتظار حسین کے یہاں ہجرت کا کرب، تقسیم کا المیہ اور اسلوب میں داستانوی رنگ و آہنگ اور ناسٹلجیا کی منطق نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ موصوف نے ان سب اوصاف کے حوالے سے انتظار حسین کے اہم افسانوں: آخری آدمی، زرد کتا، کچھوے، شہر افسوس، دیوار، آخری موم بتی، خواب اور تقدیر اور سیڑھیاں وغیرہ پر عمدہ تجزیاتی گفتگو کی ہے۔ 'اردو فکشن کی عہد ساز ادیبہ: بانو آپا' بانو قدسیہ کی فکشن کے حوالے سے ابراہیم افسر کا یہ مضمون معلوماتی نوعیت کا ہے۔ موصوف نے بانو کی حیات و خدمات کا نقشہ کھینچتے ہوئے ان کے شاہکار ناول ''راجہ گدھ'' کے تنقیدی مطالعے کی روشنی میں ان کے فن پر بہترین گفتگو کی ہے۔ مضمون میں بانو کے ادبی سفر کے آغاز و ارتقا، افسانوی مجموعوں، ٹی وی و ریڈیائی ڈراموں اور ناولوں کا تعارف کراتے ہوئے، ان کے فنی اختصاص پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔

کتاب کی ورق گردانی کے بعد میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ اردو فکشن: تفہیم و تجزیہ جانبداری اور تنقیص کے غیر تنقیدی رویوں سے بہت دور صحت مند ادبی تنقید کا بہترین نمونہ ہے۔ موصوف نے تنقیدی بحث میں تجزیاتی و تاریخی طریقہ کار اختیار کرتے ہوئے بالکل عام فہم و سادہ تنقیدی اسلوب میں فکشن تنقید و تفہیم کی عمدہ مثال پیش کی ہے۔

اردو فکشن: تنقیدات و تفہیمات: ایک جائزہ

مصنف: شہاب ظفر اعظمی، ترتیب: ڈاکٹر محمد عارف حسین
صفحات: 320، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2024
ناشر: مرکزی پبلی کیشنز، نئی دہلی
مبصر: قمر الزماں چمپارنی، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

اردو فکشن کی تنقید میں اسلوبیاتی جہت کو نمایاں کرنے اور فکشن کے فنی و فکری پہلوؤں پر سنجیدہ مکالمہ قائم کرنے والوں میں ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی نئی کتاب اردو فکشن: تنقیدات و تفہیمات اس تسلسل کی تازہ کڑی ہے یہ کتاب صرف تنقیدی مضامین کا مجموعہ نہیں، بلکہ اردو فکشن کی تفہیم میں اہمیت کی حامل ہے۔

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نثر و نظم دونوں اصناف کی تنقید سے جڑے ہوئے ہیں مگر ان کا اصل میدان فکشن تنقید ہے، جہاں وہ اردو ناول کے اسالیب، متن و معنی اور فکشن کی مابعد الطبیعیاتی جہات پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ ان کی تنقید محض سطحی مشاہدہ نہیں بلکہ تخلیقی متون کی تہہ میں اترنے اور ان کے باطن سے معنی کشید کرنے کی ایک فکری و علمی کاوش ہے۔ وہ مخصوص مکتب فکر یا نظریے کے اسیر نہیں۔ ان کی تحریروں میں فکری توانائی اور علمی گہرائی کی جھلک صاف دیکھی جاسکتی ہے، جو ان کی فکشن فہمی اور متنی شعور کی پختگی کی دلیل ہے۔

کتاب کے مرتب ڈاکٹر محمد عارف حسین ہیں جن کی علمی بصیرت اور ترتیب و پیشکش نے کتاب کو نہ صرف حسن ترتیب بخشا ہے، بلکہ اس کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ کیا ہے۔ انھوں نے پی ایچ ڈی پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ سے کی ہے۔ ابھی وہ بحیثیت اسسٹنٹ ٹرانسلیٹر گھوسوری بلاک، پٹنہ میں مامور ہیں۔

کتاب کے مندرجات سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ اس میں اردو فکشن کے مختلف ادوار، اسالیب، اور رجحانات پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب میں کل سترہ مضامین شامل ہیں۔

سب سے پہلی تحریر عبدالصمد صاحب کی حرفے چند کے نام سے ہے، جس میں عبدالصمد صاحب اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ پچھلے دس بارہ برسوں میں اردو تنقید کے میدان میں جن چند لوگوں نے تیزی کے ساتھ اپنی پہچان بنائی ہے ان میں ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کا نام نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ اور آگے یہ بھی لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کا تنقیدی رویہ معروضی ہوتا ہے، ان کے سامنے تخلیق رہتی ہے، تخلیق کار نہیں۔ ان کی تحریریں ہر طرح کے تحفظات سے پاک وصاف ہوتی ہیں۔ ان کی تنقید میں جانبداری اور عصبیت کے عناصر نہیں ملتے ہیں۔ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے فکشن تنقید کی طرف مضبوطی سے قلم اٹھا کر ایک بڑی کمی کو دور کیا ہے۔ ان کی تنقید کے مطالعہ سے ہم عصر فکشن کا منظر نامہ واضح ہوجاتا ہے۔

اس میں دوسری تحریر حقانی القاسمی صاحب کی بعنوان 'شہاب ظفر اعظمی کی فکشن تنقید' ہے اس مضمون کو پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے یہ مقدمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس میں ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی صاحب کی تنقیدی روش اور اسلوب کا خوبصورت جائزہ لیا گیا ہے۔

ڈاکٹر محمد عارف حسین نے نہایت خوبصورت اور بامعنی انداز میں مقدمہ تحریر کیا ہے۔ مقدمہ پڑھنے کے بعد قاری کے سامنے کتاب کے مضامین، اسلوب اور مصنف کی فکری جہات پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہیں۔ اور اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ انھوں نے مصنف کو نہ صرف باریک بینی سے پڑھا بلکہ سمجھا بھی ہے۔

کتاب میں مصنف کا پہلا مضمون 'امداد امام اثر کا ناول فسانۂ ہمت: ایک مطالعہ' ہے پھر پریم چند کی ناول نگاری، بہار میں اردو ناول کل سے آج تک ہے۔ ان مضامین میں ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی صاحب نے اردو ناول کی ارتقائی تاریخ تہذیبی پس منظر اور فکری جہات کا گہرا مطالعہ پیش کیا ہے۔ 'اماوس میں خواب: معاصر ہندوستان کا استعارہ' مضمون بھی کافی عمدہ اور معلوماتی ہے۔ 'اماوس میں خواب' حسین الحق صاحب کا ناول ہے جس کی اشاعت 2017 عیسوی میں ہوئی تھی یہ ناول 338 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس ناول میں سماجی اور نفسیاتی عناصر کی موجودگی کا بھرپور تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی صاحب معروف ادیب غضنفر کی ناول نگاری، اکیسویں صدی میں ہندوستان کا اردو افسانہ اور معاصر اردو فکشن کی بدلتی سمتوں کا احاطہ کرتے ہیں اور فکشن میں علامت تجرید اور بیانیہ کی تبدیلیوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ پھر انھوں نے اردو فکشن پر بہار کے علاقائی تہذیبی اثرات کو بہت ہی خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ مضمون منفرد انداز سے اردو فکشن کو جغرافیائی اور تہذیبی سیاق وسباق میں پرکھتا ہے۔ عبدالصمد کرونا اور کشکول، پریم چند کی افسانہ نگاری، معاصر خواتین افسانہ نگاری کے احتجاجی اور باغیانہ رویے، شکیل الرحمٰن اور اردو فکشن تنقید کی جمالیات، اختر اورینوی کے چہار رنگ افسانے اور مشتاق احمد وانی کی افسانہ نگاری وغیرہ تمام مضامین اس کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتے ہیں۔

اگر ہم ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کے انداز بیان کی بات کریں تو ان کے مضامین میں تحقیقی گہرائی، بین المتونی مطالعہ اور ادبی سیاق وسباق کی آگاہی نمایاں ہے۔ وہ اردو فکشن کو محض بیانیہ یا قصے کے طور پر نہیں دیکھتے بلکہ اس کے تہذیبی سماجی اور نفسیاتی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح مرتب کی علمی پیشکش کو دیکھیے تو یہ اندازہ ہوگا کہ ڈاکٹر محمد عارف حسین صاحب نے اس کتاب کو نہایت سلیقے سے ترتیب دیا ہے۔ فہرست مضامین، صفحہ بندی اور موضوعات کی ترتیب ایسی ہے کہ قاری کے لیے مطالعہ آسان اور دلچسپ بن جاتا ہے۔

یہ کتاب فکشن اور متنوع فکشن نگاروں کے فن پاروں پر مشتمل تنقیدی و تفہیمی مضامین کا حسین امتزاج ہے۔ ہر مضمون میں مصنف نے نہایت باریک بینی سے فکشن کے فنی عناصر، اسلوبی جہات، تہذیبی شعور، اور سماجی حوالوں کو زیر بحث لایا ہے۔ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کا تنقیدی رویہ نہ تو محض مدح پر مبنی ہے، نہ ہی بے جا تنقیص پر وہ فن پارے کو اس کے سیاق وسباق، فکری حوالوں اور اسلوبی ساخت میں رکھ کر جانچنے کی شعوری کوشش کرتے ہیں، جو ان کے تحقیقی مزاج کی غمازی کرتی ہے۔

کتاب میں شامل مضامین میں جو بات سب سے نمایاں ہے وہ تفہیم کی باریک بینی ہے۔ وہ لفظ و معنی کے باہمی رشتے، جملوں کی ساخت، فضا سازی، کردار نگاری اور بین السطور کی معنویت کو سامنے لانے میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی تنقید محض معلوماتی یا تاثراتی نہیں بلکہ علمی و فکری سطح پر اپنا جواز رکھتی ہے۔

کتاب کا اسلوب سلیس، شائستہ اور بامحاورہ ہے، جو نہ صرف علمی حلقوں کے لیے قابل فہم ہے بلکہ عام فکشن قارئین کو بھی اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اردو فکشن: تنقیدات و تفہیمات میں ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے فکشن کی روایت، اس کے ارتقائی منازل، اور معاصر فکشن نگاری کے مسائل کو گہرائی سے سمجھنے کی سعی کی ہے۔ جہاں

ایک طرف کلاسیکی فکشن نگاروں کے فن کا تجزیہ ہے، وہیں نئی نسل کے ادیبوں کی تخلیقات کو بھی تنقیدی پرکھ کا حصہ بنایا گیا ہے۔ اس تنوع نے کتاب کو یک رخی ہونے سے بچایا ہے اور ایک علمی توازن فراہم کیا ہے۔

کتاب کو دیکھتے ہوئے یہ بات پوری شدت سے کہی جاسکتی ہے کہ یہ محض تنقیدی مضامین کا مجموعہ نہیں، بلکہ اردو فکشن کی تفہیم کے لیے ایک تحقیقی دستاویز ہے۔ اس میں موجود مضامین اردو فکشن کے مختلف چہروں کو بے نقاب کرتے ہیں اور قاری کو فکشن کے اندرونی منطقے کی سیر کراتے ہیں۔ یہ کتاب اردو ادب کے اس طالب علم کے لیے خاص طور پر اہم ہے جو تنقید کو صرف ایک طرز اظہار نہیں بلکہ فہم وادراک کا وسیلہ سمجھتا ہے۔

آخر میں اتنا کہنا چاہوں گا کہ یہ کتاب 'اردو فکشن: تنقیدات وتفہیمات' ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کی تنقیدی ریاضت، مطالعہ کی گہرائی، اور اسلوبیاتی شعور کا مظہر ہے۔ یہ کتاب فکشن فہمی کے حوالے سے ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اردو تنقید کو نئے زاویے، نیا لہجہ اور نئی بصیرت عطا کرنے والی اس تصنیف کا دائرہ وسیع ہے، یہ نہ صرف محققین کے لیے قابل استفادہ ہے بلکہ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں نصابی و تحقیقی حوالہ کے طور پر بھی استعمال کی جاسکتی ہے، خاص کر ریسرچ اسکالر اور ہم جیسے طالب علم اس کتاب سے کافی کچھ استفادہ کرسکتے ہیں۔

مثنوی دُرِ منظوم

مصنف: غلام جیلانی رفعت

نقد وتدوین/ ناشر: ڈاکٹر غزالہ بی

صفحات: 364، قیمت: 800 روپے، سنہ اشاعت: 2025

مبصر: عبدالرحمٰن شافی، ریسرچ اسکالر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

مثنوی، اپنی ہیئت اور موضوع دونوں اعتبار سے ایک ہمہ گیر صنفِ سخن ہے، جس میں رزمیہ، عشقیہ، مذہبی اور اخلاقی مضامین کو غیر معمولی وسعت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ رزمیہ مثنوی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جنگ وجدال، شجاعت، اور قومی یا تہذیبی فخر کے عناصر نمایاں ہوتے ہیں۔ فارسی ادب میں فردوسی کی ''شاہنامہ'' نے اس رزمیہ روایت کو وہ عظمت بخشی، جس کی گونج صدیوں تک سنائی دیتی رہی۔ بعد ازاں یہی روایت دکن اور شمالی ہند کے کلاسیکی شعرا کے ذریعے اردو میں منتقل ہوئی۔ ''کدم راؤ پدم راؤ''، ''سحرالبیان''، ''علی نامہ'' اور ''گلزارِ نسیم'' جیسی مثنویاں اس صنف کی اردو روایت میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان تخلیقات نے نہ صرف اردو زبان کو فکری گہرائی عطا کی بلکہ اس کے بیانیہ امکانات میں بھی غیر معمولی وسعت پیدا کی۔

ریاستِ رامپور کی مشہور ومعروف جنگ ''دوجوڑہ'' کے حالات وواقعات پر مبنی مولوی غلام جیلانی رفعت کی فارسی رزمیہ مثنوی ''دُرِ منظوم'' بھی تاریخی اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ مثنوی نہ صرف اپنے عہد کے سیاسی وعسکری پس منظر کو شعری پیکر میں ڈھالتی ہے بلکہ اُس زمانے کی تہذیبی فضا اور انسانی جذبات کی عکاس بھی ہے۔

مولوی رفعت، روہیل کھنڈ کے اُن نامور اہلِ علم وفضل میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے اٹھارویں صدی کے نصفِ آخر اور انیسویں صدی کے ربعِ اوّل میں فارسی زبان وادب کو ایک نئی رفعت عطا کی۔ وہ فنِ شاعری کے رموز سے بخوبی واقف، زبان کے دقائق کے شناسا، اور فطری شاعر تھے۔ فارسی پر انھیں ایسی قدرت حاصل تھی جو فقط زبان دانی نہیں بلکہ تہذیبی شعور اور فکری گہرائی کی آئینہ دار تھی۔ دہلی میں قیام کے دوران اہلِ علم وارباب سخن کی صحبت نے ان کی فکری وسعتوں کو جلا بخشی، اور فارسی زبان کے اسرار ورموز پر ان کی گرفت کو مزید قوت عطا کی۔ رفعت اردو اور فارسی دونوں میں بلاتکلف شعر کہتے تھے، اور یہی سہولتِ بیان انھیں اپنے عہد کے معتبر اور قادرالکلام شعرا میں ممتاز بناتی ہے۔

مثنوی ''درِ منظوم'' میں رفعت نے اپنے مخصوص اسلوبِ بیان کے ذریعے رزمیہ شاعری کے جوہر کو نئے رنگ میں پیش کیا ہے۔ تمثیلوں کی چمک، تشبیہوں کی نزاکت، اور استعارات کی تہہ داری ان کے کلام کو فکری وجمالیاتی وقار عطا کرتی ہے۔ ان کی مثنوی میں تحقیقی سنجیدگی، فکری تنوع، ادبی لطافت، اور بیان کی رواں دھار، سب ایک ساتھ جلوہ گر نظر آتے ہیں، یہی وہ عناصر ہیں جو کسی حقیقی رزمیہ تخلیق کو زندہ اور پُرتاثیر بناتے ہیں۔

انھوں نے حافظ، سعدی، رومی، جامی، فردوسی، نظامی، خاقانی، ظہیر فاریابی اور امیر خسرو جیسے فارسی ادب کے درخشاں ناموں کا نہایت عمیق مطالعہ کیا۔ ان کے کلام میں انھی کلاسیکی شعرا کے اسالیب، مضامین اور فکری رنگ اس انداز سے جلوہ گر ہیں کہ قاری بیک وقت کئی صدیوں کے شعری ورثے کی بازگشت محسوس کرتا ہے۔ رفعت کے یہاں نہ صرف زبان کی لطافت ہے بلکہ ایک تہذیبی روایت کی گونج بھی سنائی دیتی ہے، یہی ان کے کلام کا امتیاز ہے۔

مولانا غلام جیلانی رفعت کی مثنوی ''دُرِ منظوم'' دراصل ڈاکٹر غزالہ بی کا تحقیقی مقالہ ہے۔ یہ کتاب اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک منفرد اور قابلِ قدر علمی کاوش ہے۔ ڈاکٹر غزالہ بی نے اس تصنیف کو نہایت منظم انداز میں پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

بابِ اوّل میں ریاستِ رامپور کے تاریخی وسیاسی پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بابِ دوم میں رامپور کے علمی وادبی ماحول کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ بابِ سوم میں مولوی غلام جیلانی رفعت کی حیات وخدمات پر گفتگو کی گئی ہے، جبکہ بابِ چہارم میں ''جنگ نامہ دُرِ منظوم'' کی تدوین وتعارف شامل ہے۔ آخری اور بابِ پنجم میں مصنفہ نے مثنوی دُرِ منظوم کا تنقیدی وفنی جائزہ نہایت باریک بینی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اور یوں یہ کتاب نہ صرف رفعت کے فکر وفن کی تفہیم کے لیے ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ فارسی رزمیہ شاعری کی تاریخ میں بھی اپنی الگ شناخت قائم کرتی ہے۔

مثنوی دُرِ منظوم پر مبنی ڈاکٹر غزالہ بی کی یہ تصنیف محض ایک تحقیقی مطالعہ نہیں بلکہ فارسی رزمیہ شاعری کی تاریخی وفکری روایت کا زندہ استعارہ ہے۔ مصنفہ نے نہ صرف مولوی غلام جیلانی رفعت کی مثنوی کا تنقیدی وفنی تجزیہ کیا ہے بلکہ اس کے پس منظر میں برصغیر کی علمی وتہذیبی فضا کو بھی نمایاں طور پر روشن کیا ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مصنفہ نے کلاسیکی شاعر کی مثنوی کا تجزیہ محض ادبی ذوق کی بنیاد پر نہیں، بلکہ تحقیقی منہاج کے مطابق کیا ہے۔ اس کتاب میں شاعر کے اسلوب، موضوعاتی تنوع، کرداروں کی ساخت، اور رزمیہ فضا کے فکری مضمرات کو نہایت باریک بینی سے پرکھا گیا ہے۔

مجموعی طور پر ''مثنوی دُرِ منظوم'' پر مبنی ڈاکٹر غزالہ بی کی یہ تصنیف فارسی رزمیہ ادب کے مطالعے میں ایک قابلِ توجہ اضافہ ہے، جو آئندہ کے محققین کو تحقیق وتنقید کے نئے زاویے فراہم کرتی ہے۔ ڈاکٹر غزالہ بی کا یہ کارنامہ اردو وفارسی تحقیق میں ایک مضبوط کڑی کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے، ساتھ ہی یہ تصنیف اُن محققین، طلبہ اور ادب دوستوں کے لیے نہایت اہم ہے جو فارسی رزمیہ ادب، برصغیر کی فارسی روایت، یا مولوی غلام جیلانی رفعت جیسے قابلِ ذکر شعرا کے فن واسلوب کو نئے تناظر میں سمجھنا چاہتے ہیں۔

عصمت چغتائی کا افسانوی فن

مصنف: ڈاکٹر محمد دانش غنی

قیمت: 300/روپے صفحات: 224 اشاعت: 2025

مبصر: سید نکہت جبیں، شعبۂ اردو معین الدین برہان حارث کالج آف آرٹس، نالاسوپارہ ضلع تھانے (مہاراشٹر)

ڈاکٹر محمد دانش غنی ان اصحاب میں سے ہیں جنھیں اپنی ذات سے ایک انجمن کہا جا سکتا ہے۔ گوگٹے جوگلیکر کالج (خودمختار) رتناگری کا شعبۂ اردو کہ مہاراشٹر اور بیرونِ مہاراشٹر کے کالجوں کے شعبوں سے بازی لے گیا ہے، دانش صاحب کے خونِ جگر کا پروردہ ہے۔ شاگردوں کے علمی ذوق کو جلا بخشنے اور تخلیقی جوہر کو ابھارنے کا جیسا سلیقہ دانش صاحب کو حاصل ہے، خدا اردو کے تمام اساتذہ کو نصیب کرے۔

کئی سال تک ڈاکٹر محمد دانش غنی بحیثیت اسسٹنٹ لائبریرین نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور سے منسلک رہے، بعد میں وہ گوگٹے جوگلیکر کالج (خود مختار)، رتناگری سے بحیثیتِ صدر شعبۂ اردو منسلک ہوگئے۔ یہاں انھوں نے شعبہ کا مزاج بنانے کے ساتھ اسے باوقار بھی بنایا۔ درس و تدریس کے فرائض منصبی کی انجام دہی کی۔ تحقیق و تنقید اور تدوین و ترتیب سے بھی دانش صاحب کو بڑی دلچسپی رہی ہے۔ چناں چہ وہ ان کے ذریعے بھی اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان کی نگاہ دور رس ہے، تجربہ وسیع ہے، تحقیق و تنقید اور تلاش و جستجو کے رموز سے وہ باخبر ہیں۔ تخلیقات کی پرکھ کی صلاحیت بھی قدرت نے بڑی اچھی عطا کی ہے۔ اس لیے اپنی ناقدانہ بصیرت سے کام لے کر اردو کے تنقیدی خزانہ میں بھی قیمتی اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ ادھر چند برسوں سے وہ کوکن میں اردو سمت و رفتار، عصر حاضر میں بچوں کا ادب، مہاراشٹر میں اردو تحقیق و تنقید: ماضی، حال اور مستقبل، اردو کہاوتوں اور محاوروں کا ہندوستانی پس منظر، ساحر شیوی: ایک ہشت پہلو فنکار اور عصمت چغتائی کی فکشن نگاری جیسے موضوعات پر مختلف اوقات میں سمینار منعقد کرتے رہے ہیں جو نہایت مفید ثابت ہوئے ہیں۔ چناں چہ ان سمیناروں کا چرچا دور تک ہوتا رہا ہے۔ ڈاکٹر دانش نے ان سمیناروں میں پڑھے گئے مقالات کو کتابی صورت میں شایع کرنے کا سلسلہ شروع کر کے انھیں مفید تر بنا دیا ہے۔ یہ کہنا بجا ہے کہ اردو کتابوں کی طباعت کی دنیا میں ان کتابوں کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔

''عصمت چغتائی کا افسانوی فن'' ڈاکٹر محمد دانش غنی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری کو ذہن میں رکھ کر لکھے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مختلف ادبی اور تخلیقی تحریکوں کے تحت خواتین اردو کے نثری ادب میں اپنی حصہ داری کا عمل پہلے ہی شروع کر چکی تھیں لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو افسانے کو سماجی شعور، نفسیاتی بصیرت اور عصری آگہی سے آشنا کرنے والی پہلی خاتون عصمت چغتائی ہی تھیں۔ یہی نہیں اردو ادب میں تانیثیت کی بنیاد گزار خاتون کے طور پر بھی ان کا نام لیا جا سکتا ہے کیونکہ ان کا تخلیق کردہ تمام تر ادب ہندوستانی عورت کی انفرادیت، اہمیت اور علاحدہ شناخت کو ثابت کرنے کی مسلسل کوشش کے نام منسوب ہے۔ عصمت چغتائی کی تفہیم کے سلسلے میں ڈاکٹر محمد دانش غنی نے مجرد مباحث کے بجائے ان ابعاد تک پہنچنے کی کوشش کی ہے جن سے عصمت چغتائی کا فکر و فن تشکیل پاتا ہے۔ عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری ان کی تحقیق کا موضوع رہا ہے اور زیر نظر کتاب اس سلسلے کا ایک خوب صورت نمونہ ہے۔

اس کتاب کے ابتدائی تین مضامین ''عصمت چغتائی کے افسانوں کا مطالعہ: عہد بہ عہد''، ''عصمت چغتائی کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ'' اور ''عصمت چغتائی کے افسانوں میں عورت کی نفسیات'' میں عصمت چغتائی کی ذہنی کش مکش کو عہد بہ عہد بدلتے سیاسی و سماجی تناظرات اور انسانی نفسیات کے پیش نظر سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ عصمت چغتائی وہ پہلی خاتون افسانہ نگار تھیں جنھیں اس وجہ سے بھی اہمیت حاصل ہے کہ انہوں نے پہلے پہل اپنے افسانوں میں نسوانی کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ پیش کیا اور جنسی مسائل کو خود انہیں کے نقطہ نظر سے ظاہر کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ خصوصاً گھر کی چار دیواری کے اندر متوسط مسلم طبقے کی لڑکیوں کو جن جنسی الجھنوں اور نفسیاتی پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑتا تھا، اس کی تصویر کشی عصمت چغتائی نے نہایت فنکارانہ ڈھنگ سے کی ہے۔ ان نکات کو ڈاکٹر محمد دانش غنی نے بھی سمجھا ہے اور عصمت چغتائی کے فکر و فن پر دانشورانہ نظر ڈالی ہے۔

زیر نظر کتاب کے ایک مضمون ''عصمت چغتائی کے اہم معاصرین'' میں ڈاکٹر محمد دانش غنی نے سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی اور اوپندر ناتھ اشک کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

عصمت چغتائی کے ہم عصر افسانہ نگاروں میں سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی اور اوپندر ناتھ اشک کا ذکر خصوصیت سے کیا جاتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ان فنکاروں نے اپنے عہد کے افسانوی ادب پر انمٹ نقوش چھوڑے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان سب میں کوئی واضح قدر مشترک نہیں تھی۔ عصمت چغتائی کرشن چندر اور اوپندر ناتھ اشک ترقی پسند تحریک کے کٹر حامیوں میں سے تھے۔ اس گہری وابستگی نے انہیں نظریاتی طور پر ایک ہی صف میں لا کھڑا کر دیا تھا۔ تاہم ان کا فنی برتاؤ ایک دوسرے سے مختلف رہا۔ راجندر سنگھ بیدی اور احمد ندیم قاسمی بھی ترقی پسندوں کے ساتھ رہے لیکن ان دونوں نے زندگی سے اپنے فن کا رشتہ براہ راست استوار کیا اور اکثر ممنوعہ علاقوں تک بھی جا پہنچے۔ منٹو اپنی آزادانہ روی کے وجہ سے ایک مرحلہ پر بعض جید ترقی پسندوں کے عتاب کا نشانہ بنے لیکن انہوں نے اس کی پرواہ نہ کی اور اپنے ذہن و ضمیر کی رہنمائی میں اپنا سفر جاری رکھا۔ (عصمت چغتائی کا افسانوی سفر، صفحہ نمبر ۱۵۳)

اس مضمون میں عصمت چغتائی کا سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی اور اوپندر ناتھ اشک سے تقابلی موازنہ بھی کیا گیا ہے جس سے ایک گراں قدر پہلو ابھرتا ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری سے ان کے معاصرین بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔

زیر نظر کتاب میں عصمت کے افسانوں کے اہم موضوعات کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ پلاٹ، کردار وغیرہ کے ساتھ ساتھ کچھ منتخب افسانوں کے تجزیے بھی کیے گئے ہیں جو مصنف کی توجیہات کی معاونت کرتے ہیں۔ ان افسانوں کے تجزیے سے عصمت چغتائی کے مشاہدے کی وسعت کا پتا چلتا ہے اور زندگی کی سچائیوں سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ ملتا ہے۔ اس کے علاوہ عصمت کے افسانوی اسلوب پر کارآمد گفتگو ملتی ہے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی کے مطابق بعض مقامات پر کارآمد اور معنی خیز جملے رقم ہو گئے ہیں۔

''عصمت کا اسلوب فی نفسہ فطرت کا ایک فینومینا تھا۔ ایک عجوبہ جو دم دار ستارے کی مانند صدیوں میں کبھی کبھار نظر آتا ہے۔'' (عصمت چغتائی کا افسانوی سفر، صفحہ نمبر 12)

یا پھر

''اسلوب کی اس انفرادیت کے پیچھے دراصل ایک بہت ہی منفرد طاقت اور اخلاقی ذہن کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس ذہن کا بنیادی کام ہے عورت کے بھرم یعنی متھ (Myth) کی شکست وریخت۔'' (عصمت چغتائی کا افسانوی سفر، صفحہ نمبر ۱۲)

اس طرح کے اور بھی جملے ہیں جو اس کتاب میں جا بجا نظر آتے ہیں۔

مجموعی طور پر یہ کتاب عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری کے نئے گوشوں کو روشنی میں لاتی ہے۔ انداز بیان ایسا ہے کہ طلبہ وطالبات بھی اس سے خاطر خواہ مستفید ہو سکتے ہیں۔ ۲۲۴ رصفحات پر مشتمل معیاری سائز کی یہ کتاب اردو تحقیق وتنقید کی دنیا میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

ترتیب و تدوین

کشف شموئل

ترتیب: ڈاکٹر منصور خوشتر

صفحات: 672، قیمت: 700

ناشر: المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ، دربھنگہ

مبصر: صدر عالم گوہر 1138، نیو اسلام آباد نالا پار، بھیونڈی، تھانے۔ 421302

ادبی دنیا میں جب کسی ادیب، افسانہ نگار یا ناول نگار کے تخلیقی وجود کو خراج تحسین پیش کرنے کی غرض سے ایک مجموعہ ترتیب دیا جاتا ہے، تو وہ محض تعریفی کلمات یا ستائشی مضامین کا ذخیرہ نہیں ہوتا، بلکہ اس میں اس شخصیت کے ادبی جہات، فکری زاویے، اسلوبیاتی خدوخال اور فنی شعور کی گہری پرتوں کا انکشاف کیا جاتا ہے۔ ''کشفِ شموئل احمد'' ایک ایسی ہی خوبصورت اور معنویت سے لبریز کتاب ہے جسے ڈاکٹر منصور خوشتر نے بڑے اہتمام اور فنکارانہ بصیرت کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔

یہ کتاب شموئل احمد کے کثیر الجہات ادبی سفر کا احاطہ کرتی ہے۔ اس میں درج ذیل نمایاں عنوانات کے تحت مواد شامل ہے: 1۔ شموئل احمد: فرد وفن کار، 2۔ شموئل احمد بحیثیت ناول نگار، 3۔ شموئل احمد بحیثیت افسانہ نگار، 4۔ شموئل احمد کے حوالے سے چند اور مضامین، 5۔ گوشہ شموئل احمد، 6۔ خاکہ، 7۔ مکالمہ (انٹرویو)، 8۔ شموئل احمد کے منتخب مضامین، 9۔ شموئل احمد کے افسانے۔

1۔ شموئل احمد: فرد وفن کار۔ اس ابتدائی باب میں شموئل احمد کی شخصیت، ان کی فکری تربیت، زندگی کے نشیب وفراز اور ادبی رویّوں کا مختصر مگر گہرا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اس حصے میں انھیں ایک حساس، باشعور اور زمانہ شناس فنکار کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو اپنی تحریروں میں انسان اور اس کے گرد وپیش کے تعلق کو نئے زاویے سے دیکھتا ہے۔ اس عنوان کے تحت شموئل احمد کے ہم عصروں کے ذریعے تحریر کردہ مندرجہ ذیل مضامین ہیں۔ ایک بانکا تخلیق کار: شموئل احمد، آفتاب احمد آفاقی، شموئل احمد کی تحریر کا انوکھا پن۔ پروفیسر اسلم جمشید پوری، شموئل احمد، یادیں، باتیں اور فن۔ (پروفیسر) ابوبکر عباد، شموئل احمد ایک زندہ دل انسان۔ احمد صغیر۔

2۔ بحیثیت ناول نگار۔ شموئل احمد کی ناول نگاری کے فن پر جب بات کی جاتی ہے تو ان کے مشہور ناول جیسے نرک 'ماں' گرداب، مہاماری، ندی، چمراسر وغیرہ قارئین کے ذہن میں آتے ہیں۔ اس باب میں ان کے اسلوب، بیانیہ، کردار نگاری اور سماجی موضوعات کے تناظر میں ناولوں کا تنقیدی مطالعہ شامل ہے۔ اس عنوان کے تحت مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں۔ شموئل احمد کا گزرگاہ ''گرداب'' عتیق اللہ، شموئل احمد کا ناول گرداب سلیم انصاری، ناول مہا ماری، مختصر تعارف، نور الحسنین، شموئل احمد اور پلاٹ سازی کا فن، شبیر احمد، اے دل آوارہ: شموئل احمد کی عمر گذشتہ کی کتاب، صفدر امام قادری، شموئل احمد کے ناول ''ندی'' پر چند باتیں شعیب نظام، چمراسر، انتخاب حمید، شموئل احمد کا ناول چمراسر، ڈاکٹر سید احمد قادری، ''چمراسر'' ایک مطالعہ۔ وسیم احمد فدا، سنگھار دان، سائیکک پیرو نیا کا استعارہ۔ علی رفاد فتیحی، آئی کنفیس، فیاض احمد وجیہہ، شموئل احمد کا ناول ''مہاماری ایک تعارف۔ شاہ نواز عالم۔

3۔ بحیثیت افسانہ نگار۔ شموئل احمد کے افسانے اردو ادب میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ اس باب میں ان کے علامتی اور حقیقت پسند افسانوں کا گہرائی سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے تحت مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں۔ شموئل احمد کے افسانوں میں علم نجوم کی معنویت۔ پروفیسر شیخ عقیل احمد، شموئل احمد؛ ایک متنازعہ قصہ گو۔ ڈاکٹر سید احمد قادری، شموئل احمد کی افسانہ نگاری کے فنی امتیازات۔ ڈاکٹر پرویز شہریار، شموئل احمد کے افسانوں کا موضوعاتی حصار، ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری، شموئل احمد اور القمبوس کی گردن، اقبال حسن آزاد، شموئل احمد کی کہانیاں، سیفی سرونجی، شموئل احمد کی افسانہ نگاری، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، ایک نڈر افسانہ نگار شموئل احمد، عبدالحئی، شموئل احمد ایک مایہ ناز فکشن نگار، ڈاکٹر احسان عالم، شموئل احمد کے افسانوں کی عورتیں، ڈاکٹر عرش منیر، برف میں آگ کی نفسیاتی چنگاریاں، سلمان عبدالصمد۔

4۔ شموئل احمد کے حوالے سے دیگر مضامین۔ یہ حصہ تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے جن میں مختلف اہلِ قلم نے شموئل احمد کے فن اور فکر پر اپنے تاثرات، مشاہدات اور علمی تبصرے پیش کیے ہیں۔ اس حصے کی اہمیت اس میں ہے کہ اس کے ذریعے قاری کو مختلف زاویوں سے شموئل احمد کی شخصیت اور فن کی تفہیم ممکن ہوتی ہے۔ اس کے تحت جو مضامین شامل ہیں وہ یہ ہیں۔ بیباک، البیلا فکشن نگار: شموئل احمد۔ ڈاکٹر صالحہ صدیقی، میں منٹو نہیں بننا چاہتا ہوں: شموئل احمد، رخشندہ روحی مہدی، موت سے کس کو رستگاری ہے، محمد غالب نشتر، شموئل احمد، عظیم اللہ ہاشمی، شموئل احمد کی تخلیقیت: ایک تنقیدی نظر، شگفتہ ناز۔

5۔ گوشہ شموئل احمد، یہ ایک خالص ادبی خراج ہے، جس میں ان کے اعزاز میں لکھے گئے تاثراتی مضامین، منظوم عقیدت، تاثراتی نوٹ، اور شاذ و نادر اقتباسات شامل کیے گئے ہیں۔ جو مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوئے ہیں۔ وہ اس طرح ہیں۔ سہ ماہی دربھنگہ ٹائمز کا وقیع گوشہ، شموئل احمد۔ شکیل رشید، دربھنگہ ٹائمز کا گوشہ، شموئل احمد۔ خورشید حیات، سہ ماہی عالمی فلک کا شموئل احمد نمبر۔ اقبال حسن آزاد، سہ ماہی ثالث کا گوشہ، شموئل احمد۔ رویندر اجو گلیکر۔

6۔ خاکہ، خاکہ نگاری اردو ادب کی نہایت اہم اور زندہ صنف ہے۔ اس کتاب میں شامل شموئل احمد پر لکھا گیا خاکہ نہ صرف ان کی شخصیت کو طنز ومزاح، سنجیدگی و بردباری کے امتزاج کے ساتھ پیش کرتا ہے بلکہ ایک تخلیقی مطالعہ بھی فراہم کرتا ہے۔ اس عنوان کے تحت مندرجہ ذیل مضامین شامل کئے گئے ہیں۔ شموئل احمد۔ تیم دروں نیم بروں۔ مشتاق احمد نوری، شکیل احمد: مجموعہ کمالات۔ ڈاکٹر شاہد جمیل، شمول احمد، شوکت حیات اور میں، اقبال حسن آزاد۔

7۔ مکالمہ (انٹرویو)، یہ باب شموئل احمد کی اپنی آواز میں ان کے نظریات، زندگی، تخلیقی تجربات اور ادبی رجحانات کو پیش کرتا ہے۔ انٹرویو کا انداز سادہ، بے

تکلف اور فکری گہرائی لیے ہوئے ہے جو قاری کو مصنف کی داخلی دنیا سے روشناس کراتا ہے۔ یہ کشف شموئل کا ایک اہم حصہ ہے۔ کیوں کہ شموئل احمد نے بذات خود دوران گفتگو یہ باتیں کہی ہیں۔اس کے تحت جو مکالمے (انٹرویوز) شامل ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔اردو زبان قیامت تک زندہ رہے گی۔کامران غنی صبا،شموئل احمد سے مکالمہ۔ ڈاکٹر منصور خوشتر،شموئل احمد سے ملاقات ۔ڈاکٹر صالحہ صدیقی،''اردو میں60 کے بعد کوئی ناول نہیں لکھا گیا: شموئل احمد۔" صدر عالم گوہر

۸۔شموئل احمد کے مضامین۔اس باب میں شموئل احمد کے خود کے لکھے ہوئے تنقیدی وفکری مضامین شامل ہیں۔جس میں شموئل احمد کے دو مضامین شامل کتاب ہیں۔افسانہ سیندھ: تجزیہ۔شموئل احمد،اردو افسانے کی بے وفا عورتیں۔شموئل احمد

۹۔شموئل احمد کے افسانے۔کتاب کے اختتامی حصے میں ان کے منتخب افسانے شامل ہیں جو اس کتاب کو محض تحقیقی وتنقیدی نہیں بلکہ تخلیقی انداز سے بھی قاری سے جوڑتے ہیں۔جن میں ان کے مندرجہ ذیل افسانے شامل کتاب ہیں۔چاند کا داغ،گائے ہماری ماتا ہے،لو جہاد،احمق،چاند کا داغ،ظلمت کدے میں،دیش در وہی،برف میں آگ،گھر واپسی،کٹوا،مور کے آنسو،ریپ سنسکرتی،مصری کی ڈلی،نملوس کا گناہ،سنگھاردان،پروفیسر کا حرم۔

۱۰۔ناول۔اس عنوان کے تحت شموئل احمد کا ناول ''گرداب'' آخر میں شامل کیا گیا ہے۔جو کشف شموئل احمد کے قاری کو ایک تحفہ ہے۔

اور سب سے آخر میں ''شموئل احمد کی کہانی تصاویر کی زبانی '' کو کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔جس سے شموئل احمد کی یادیں تازہ ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر منصور خوشتر نے نہایت مہارت کے ساتھ مواد کو ترتیب دیا ہے۔ ہر باب منطقی ربط رکھتا ہے، اور کتاب کا مجموعی تاثر ایک مکمل ادبی خاکے کا ہے۔فہرست، ابواب کی تقسیم، اقتباسات کا انتخاب، اور زبان کی صفائی کتاب کو قابلِ مطالعہ اور قابلِ قدر بناتی ہے۔ڈاکٹر منصور خوشتر کی یہ کاوش بلاشبہ قابل تحسین ہے۔

شاعری

برگ نوا

شاعر:سلیم ساغر

سنہ اشاعت:۲۰۲۴

ناشر:عرشیہ پبلی کیشنز،دہلی

مبصر:ڈاکٹر محمد یاسین گنائی (کشمیر)

''برگِ نوا'' سلیم ساغر کی غزلیات کا مجموعہ ہے اور یہ ان کی چوتھی کتاب ہے۔ زیرِ نظر شعری مجموعہ کے اجمال کی بات کریں تو عرشیہ پبلی کیشنز دہلی نے خوبصورت کاغذ اور دیدہ زیب کاری کا کام انجام دیا ہے۔۱۹۰صفحات پر مشتمل کتاب میں کل ۷۱غزلیں شامل ہیں۔ پیشِ لفظ میں ساغر نے اپنی تساہل پسندی، خاموش روی اور کم گوئی کی وجوہات بیان کی ہیں:

''شعرگوئی وسخن طرازی اظہارِ ذات کا وسیلہ سہی مگر میرا طبعی میلان ابتدا ہی سے کم گوئی کی طرف رہا ہے،اس لیے میں تخلیقی عوامل سے دانستہ کاوشوں سے بے نیاز رہا۔ مقدار کی بجائے میعار ملحوظِ نظر رکھنے کی کوشش کرتا ہوں''۔(برگِ نوا،سلیم ساغر،ص:5)

اس شعری مجموعہ کے فنی وفکری پہلو کے پیشِ نظر ہمارے نوجوان شعرا کو ضرور مطالعہ کرنا چاہیے ۔ ہمارے نوجوان شعرا مفردات کی اہمیت سمجھتے ہیں لیکن مرکبات کی شعری پرکاریت سے ناآشنا نظر آتے ہیں۔اس مجموعہ میں عشق کا فکری پہلو بھی ہے اور تراکیب کا فنی پہلو بھی لیکن ساغر نے فنی پہلو کو کیسے فکری پہلو میں ضم کیا ہے وہ دیکھنے والی چیز ہے۔ ساغر کی غزلوں میں عشق فن بھی ہے اور فکر بھی، کیونکہ انھوں تراکیب کی مدد سے عشق کی متنوع حالتیں اور کیفیتیں بیان کی ہیں۔اس مجموعے میں چند عشقیہ تراکیب یوں ملتی ہیں''امکانِ عشق،ایوانِ عشق،احساسِ عشق، دیوانِ عشق،،عشقِ جنون،عشقِ سرکش وغیرہ۔عشق پر مشتمل ان تراکیب سے نہ صرف ساغر کی شاعری کا فنی بلکہ عشق کا فکری پہلو بھی واضح ہو جاتا ہے۔

کم دو جہاں ہیں سیر گاہِ عشق کے لیے
سمجھے گا کون حرمتِ آوارگانِ عشق
آتش فشانِ عشق نہاں چیزے دیگر است
دل کے الاو میں کوئی شعلہ جواں بھی ہے

اگر آسان طریقہ سے ان ۷۱غزلیات میں حروف تہجی کے اعتبار سے ترکیب کی نشاندہی کی جائے تو مختلف اقسام کی تراکیب بصری اور معنوں دلچسپی ودلکشی کا سامان مہیا کرتی ہیں۔ فارسی طرز کی چند تراکیب حروفِ تہجی کے اعتبار سے یوں ملتی ہیں''آوازِ پائے یار، اہلِ دل، بیانِ دل،،پیشِ نظر، تارِ عنکبوت، جہانِ ذات، چشمِ خوں فشار،حرف لوحِ ازل، خیالِ مرگ، دلِ فقیر، ذکرِ دشت، رہ گزارِ خیالِ من، زنجیرِ پائے شوق،سرِ کاخ وکو، شرارِ زیست،صرفِ تنگنائے سخن، طنابِ خیمہ، علاجِ گردشِ ابرِ رواں، غبارِ شہر، فصلِ ناامید،قرب وجوارِ دل، کنجِ ریگ زار،گمانِ خاکِ بدن، لطفِ بہارِ زیست، متاعِ خوف وہنر، نشانِ فصلِ گل، وسعتِ کون ومکاں، ہجومِ وصف دشتاں، یارِ خوش خصال''وغیرہ۔

''برگِ نوا'' کی تراکیب سے ایک اُستاد اپنے کلاس میں،ایک شاعر اپنے اشعار میں اور ایک قاری اپنی روز مرہ کی زندگی میں مختلف رنگ بھر سکتا ہے۔شاعر نے لگ بھگ تراکیب کی تمام اقسام کو بروئے کار لاتے ہوئے ان کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ مرکب اضافی اور اس کی اقسام پر درجنوں اشعار اور تراکیب وضع کی ہیں۔چند اشعار

کہاں کھلے کہ ہے صدق و صفا کہ جور و ستم
جو تم پہ رشتہ تیغ و گلو نہیں کھلتا
بازار و مے کدہ پہ برسنے لگی ہے خاک
خلقِ خدا کو کرتی ہے گوشہ نشین وبا
شیریں ہے، داستاں بھی ہے، فرہاد بھی مگر
اس شہرِ بے اماں میں کہیں بے ستوں تو ہو

مرکب اضافی کی ان اقسام کے حوالے سے''برگِ نوا'' کا بغور مطالعہ کیا جائے تو سینکڑوں اشعار اور ہزاروں تراکیب ملتی ہیں۔''برگِ نوا'' کی جمالیاتی شان کہیں یا ساغر کا حسنِ بیان، دونوں لحاظ سے بہترین تراکیب کو سمیٹا گیا ہے۔ان تراکیب پر ذرا غور کیجیے تو یہ شاعر کی شعری خلاقی کا پتہ دیتی ہے،اس کی محنت شاقہ وزبان دانی کا

سراغ ملتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ تراکیب کے عمدہ انتخاب وعمدہ استعمال سے کلام میں نہ صرف اختصار وجامعیت بلکہ یہ قطعیت اور حسنِ بلیغ کا سبب بھی بنتا ہے۔

''برگِ نوا'' میں کلاسیکی غزل گوشعرا سے مابعد جدید غزل گوشعرا تک تمام طرز کی تراکیب کا استعمال حسنِ کمال کے ساتھ ملتا ہے۔ یہاں عشقیہ تراکیب ہی نہیں بلکہ صوفی، تلمیحاتی، اشتراکی، تانیثی، جدید، مذہبی، سماجی غرض ہر قسم اور ہر نوع کی تراکیب ملتی ہیں۔ اب یہ قاری کے حسنِ انتخاب، صبرِ جمیل اور شوقِ مطالعہ منحصر ہے کہ وہ کس انداز سے ''برگِ نوا'' کی نواؤں یا پنکھڑیوں میں غوطہ زنی کرتا ہے۔ ان کے کلام میں ایسی بیش بہا تراکیب ملتی ہیں، جن سے عام وخاص کو روزمرہ زندگی میں فائدہ ہوسکتا ہے۔ تراکیب کا معاملہ ایسا ہے کہ کوئی بھی شاعر کسی بھی انداز میں ان کا استعمال کرسکتا ہے۔ یہاں اس معاملے میں سرقہ نگاری کا کوئی الزام نہیں لگایا سکتا ہے، البتہ نثر میں معاملہ کا ردروالا ہے کہ ایک بھی سطر ہو بہو کسی پیش رو سے ملے ،تو زمین وآسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں اس انداز سے اگر''برگِ نوا'' میں شامل تراکیب کے ازدہام کا تقابلی مطالعہ جموں وکشمیر اور عالمی شہرت یافتہ اردو شعرا کے کلام کے ساتھ کیا جائے تو یہاں درجنوں شعرا نے ان تراکیب کا اپنے مدعا ومقصد کے عین مطابق استعمال کیا ہے۔

سلیم ساغر کے شعری مجموعے میں پر اظہارِ خیال کرنے کا ایک ہی مقصد ہے کہ ترکیب سازی اور ان کا حسن وادا سے استعمال کرنا ایک اعلیٰ فن ہے اور اس فن کی بدولت اُردو زبان بلکہ کسی بھی زبان کا دامن نہ صرف وسیع ہوجاتا ہے۔ اس سے نئی نئی تراکیب اختراع کرنے کی صلاحیت بھی شاعر میں پیدا ہوجاتی ہے۔ ساغر کے زیرِ نظر شعری مجموعہ میں درجنوں تراکیب خصوصاً فارسی طرزِ عمل وطرزِ فکر ایسی ملتی ہیں جہاں میرؔ کی طرح تین تین چار چار بلکہ پانچ پانچ الفاظ کی تراکیب بھی ملتی ہیں۔ یوں اس مضمون کی مدد سے ایک طرف ''برگِ نوا'' کی فنی خوبی واضح ہوجاتی ہے اور دوسری طرف شاعری میں تراکیب کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ کہ اس کتاب کا مطالعہ ہر خاص وعام کے لیے مفید ثابت ہوگا۔

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

240 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر................................ بتاریخ...................................... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/240 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں: دستخط

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور شعبہ تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اشتراک سے چار روزہ ورکشاپ کا افتتاح

علی گڑھ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور شعبۂ تعلیم، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اشتراک سے سماجی علوم کے اردو میڈیم اساتذہ کے لیے چار روزہ ٹیچر ٹریننگ ورکشاپ کا افتتاح آج عمل میں آیا۔ افتتاحی پروگرام کی صدارت سابق کارگزار شیخ الجامعہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پروفیسر محمد گلریز نے کی۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر محمد گلریز نے ورکشاپ کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس نوعیت کی ورکشاپس اساتذہ کی پیشہ ورانہ تربیت اور ان کی تدریسی مہارتوں میں اضافہ کرتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ شعبۂ تعلیم، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں وقتاً فوقتاً ورکشاپس منعقد ہوتی رہتی ہیں، لیکن قومی اردو کونسل کے تعاون سے منعقد ہونے والی اس ورکشاپ کی نوعیت منفرد ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ قومی اردو کونسل اردو زبان و ادب کے فروغ میں نہایت اہم اور قابلِ قدر خدمات انجام دے رہی ہے۔

ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اے ڈی اکیڈمک، این سی پی یو ایل) نے کہا کہ قومی اردو کونسل کا بنیادی مقصد اردو زبان کے فروغ کے ساتھ ساتھ اسکول اور کالج کے طلبہ کو اردو کی طرف متوجہ کرنا اور ان کی علمی و تدریسی رہنمائی کرنا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اردو اساتذہ کی تدریسی صلاحیتوں کو نکھارنے اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے میں بھی کونسل سرگرم کردار ادا کر رہی ہے۔ مہمانِ اعزازی پروفیسر عبدالرحیم قدوائی نے کہا کہ جب سے قومی اردو کونسل کی ذمے داری ڈاکٹر شمس اقبال نے سنبھالی ہے، تب سے وہ اردو زبان کے فروغ اور اسے گھر گھر پہنچانے کے لیے مسلسل سرگرم ہیں، جو ان کی فعالیت اور تحرک کا واضح ثبوت ہے۔ انہوں نے کہا کہ اردو اساتذہ کی تربیت کے لیے یہ ورکشاپ نہایت مفید اور کارآمد ثابت ہوگی۔ اساتذہ کو مشورہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ وہ اس ورکشاپ سے بھرپور فائدہ اٹھائیں اور یہاں حاصل ہونے والے تجربات اور معلومات کو اپنے طلبہ تک منتقل کریں۔ انہوں نے تدریسی اسلوب، طریقۂ تدریس اور اساتذہ کے کردار پر بھی تفصیلی گفتگو کی۔

استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر نکہت نسرین (صدر شعبۂ تعلیم، اے

ایم یو، علی گڑھ) نے کہا کہ اساتذہ نسلوں کے معمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم سب اس ورکشاپ میں ایک دوسرے سے سیکھنے کے جذبے کے تحت جمع ہوئے ہیں، اور یہ ایک بہترین موقع ہے کہ ہم ایک دوسرے کے تجربات سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی تدریسی صلاحیتوں کو مزید بہتر بنائیں۔ انہوں نے موجودہ دور میں بچوں کی بہتر تربیت اور صحیح رہنمائی کے لیے سنجیدہ غور و فکر کی ضرورت پر بھی زور دیا۔

افتتاحی پروگرام کی نظامت پروفیسر ساجد جمال (شعبۂ تعلیم، اے ایم یو، علی گڑھ) نے انجام دی۔ پروگرام کے بعد تین علمی و تربیتی سیشن منعقد ہوئے، جن میں پروفیسر نکہت نسرین، پروفیسر نسرین اور ڈاکٹر آفتاب احمد انصاری نے تدریس سے متعلق اپنے قیمتی تجربات اور خیالات کا اظہار کیا۔ مقررین کی گفتگو شرکاء کے لیے نہایت معلوماتی اور مفید رہی، جبکہ شرکاء نے سیشنز میں بھرپور دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 20 جنوری 2026

آئین ہند سے واقفیت ہمیں ایک ذمہ دار شہری بناتی ہے: ڈاکٹر شمس اقبال

قومی اردو کونسل میں 77 ویں یوم جمہوریہ کے موقعے پر تقریب پرچم کشائی

نئی دہلی: آج 26 جنوری کے موقعے پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے پرچم کشائی کی اور اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آیئے ہم آئین اور جمہوریت کے مطالعے سے اپنی مشترکہ تہذیب کا جشن منائیں، جس سے باخبر شہری اور مضبوط قوم کی تشکیل ہوتی ہے۔ آئین ہند کا علم اور اس کی پاسداری ایک اچھا اور ذمہ دار شہری بننے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ یوم جمہوریہ کے اس موقعے پر ہمیں سیاسی وسماجی حقوق سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کا بھی احساس ہوتا ہے۔ اس دن ہمیں اپنا محاسبہ کرنا چاہیے اور قومی ذمہ داریوں پر بھی توجہ دینی چاہیے۔ انھوں نے مزید اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ دیگر زبانوں کی طرح اردو زبان وادب نے بھی جمہوریت کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے اور مختلف شعرا وادبا نے اس حوالے سے گراں قدر تخلیقات بھی پیش کی ہیں۔ قومی اردو کونسل اردو زبان کے فروغ کے ساتھ مختلف شعبوں میں اس کے کارہائے نمایاں کو منظر عام پر لانے کے لیے کوشاں رہی ہے۔ ملک کی تعمیر وترقی میں اردو کی خدمات سے عوام کو متعارف کرانا بھی کونسل کی اہم ذمہ داری ہے۔ پرچم کشائی کی اس تقریب میں ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک) اور دیگر افسران واراکین موجود رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 26 جنوری 2026

داستان گوئی ہمارا عظیم ادبی وتہذیبی سرمایہ: ڈاکٹر شمس اقبال

نئی دہلی: دہلی یونیورسٹی لٹریچر فیسٹیول 1.0 میں قومی اردو کونسل کے اشتراک سے ایک خاص پروگرام میوزیکل داستان گوئی ''کہت کبیر'' کا اہتمام کیا گیا جس میں معروف داستان گو سید ساحل آغا اور مقبول غزل سنگر ڈاکٹر نیتا پانڈے نیگی نے کبیر داس کے متعلق داستان اور دوہے پیش کیے۔ پروگرام سے قبل قومی کونسل برائے فروغ اردو

زبان نئی دہلی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ داستان محض ایک فن نہیں بلکہ ہماری روحانی اور تہذیبی وراثت کا اٹوٹ حصہ ہے۔ اس نے صدیوں کی تہذیب اور تاریخ کو اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے۔ داستان گوئی فنِ لطافت کی وہ معراج ہے جہاں ایک تنہا شخص اپنی آواز کے اتار چڑھاؤ، آنکھوں کی جنبش اور ہاتھوں کے اشاروں سے زمین پر بیٹھے بیٹھے آسمان میں قلعے اور پاتال کے جنات کی دنیا تعمیر کر دیتا ہے۔ اس فن کا آغاز تیرہویں صدی میں ہوا، جب اردو زبان انگڑائی لے رہی تھی۔ عرب وفارس سے آئے قصے جب ہندوستانی مٹی کی خوشبو میں رچے بسے تو داستان گوئی وجود میں آئی۔ اور جب ہم اس کی جڑوں کی بات کرتے ہیں تو حضرت امیر خسروؒ کا نام آفتاب کی مانند درخشاں نظر آتا ہے۔ خسروؒ نے اپنی غیر معمولی ذہانت اور صوفیانہ بصیرت سے داستان گوئی کو وہ روح عطا کی جس نے اسے محلاتی درباروں سے لے کر درگاہوں اور گلی کوچوں تک پہنچا دیا۔ انہوں نے ہمیں سکھایا کہ کہانی محض وقت گزاری نہیں بلکہ دلوں کو منور کرنے کا وسیلہ بھی ہے۔ داستان گوئی ہمیں اپنی جڑوں سے جوڑتی ہے۔ جب ایک داستان گو سفید انگرکھا زیب تن کیے، سر پر ٹوپی سجائے محفل میں جلوہ گر ہوتا ہے تو وہ محض ایک فرد نہیں رہتا بلکہ گزرے ہوئے زمانے کا سفیر بن جاتا ہے۔ یہ فن ہمیں صبر سکھاتا ہے، سننے کا ہنر عطا کرتا ہے، اور سب سے بڑھ کر اردو زبان اور ہندوستانی تہذیب کو زندہ رکھتا ہے۔ داستان گوئی کی دنیا میں طلسم ہوش ربا جیسی عظیم داستانوں کا ذکر نہ ہو تو گفتگو ادھوری رہتی ہے۔ ان داستانوں میں طلسم اور عیاری کے ایسے پیچیدہ اور حیرت انگیز واقعات ملتے ہیں کہ سامع خود کو فراموش کر بیٹھتا ہے۔ لیکن ان کا اصل حسن اردو زبان کی نزاکت، محاوروں کی چاشنی اور لفظوں کی جادوگری ہے، جو آج کی جدید فینٹسی فلموں میں بھی کم ہی دکھائی دیتی ہے۔ عہدِ جدید میں اس فن کے احیا میں سید ساحل آغا کا ایک اہم نام ہے۔ میوزیکل داستان گوئی ''کہت کبیر'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ موسیقی وہ زبان ہے جو براہ راست دل میں اترتی ہے۔ پروگرام ''کہت کبیر'' عصرِ حاضر کے لیے ایک روشن مثال ہے۔ صوفی سنت کبیر داس، جن کی پوری زندگی ایک پیغام ہے۔ ٹیکنالوجی اور انٹرنیٹ کے اس مصروف اور شور انگیز دور میں داستان گوئی کا فروغ نہایت اہم ہے، کیونکہ یہ ہماری زبان، تخیل اور تہذیب کو جلا بخشتی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ساحل آغا، ڈاکٹر نیتا پانڈے نیگی صاحبہ اور ان جیسے فنکار جو اس قدیم مشعل کو تھامے آگے بڑھ رہے ہیں جو لائق تحسین ہے۔ ہمیں کشادہ دلی سے ان کا ساتھ دینا چاہیے۔ این سی پی یو ایل ہمیشہ سے اس روایت کی سرپرستی کرتا آیا ہے۔ ڈاکٹر شمس اقبال نے اس اہم پروگرام کے انعقاد کے لیے دہلی یونیورسٹی اور بالخصوص پروفیسر یوگیش سنگھ (وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی)، پروفیسر رجنی ابی (ڈائریکٹر ساؤتھ کیمپس دہلی یونیورسٹی) پروفیسر انوپ لاتھر، پروفیسر نیرا اگنیمتر ا، پروفیسر روی ٹیک چندانی اور پروفیسر مشتاق عالم قادری کا شکریہ ادا کیا کہ جن کے تعاون سے یہ محفل سجائی گئی۔ اس موقع پر مذکورہ شخصیات کے علاوہ پروفیسر انوار عالم پاشا، پروفیسر عمران چودھری، پروفیسر متھن کمار، قومی اردو کونسل کا عملہ اور بڑی تعداد میں سامعین موجود رہے۔ پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 13 فروری 2026

زبان، ادب اور تعلیم سے متعلق خبریں

ماہنامہ اردو دنیا میں 'خبر نامہ' کے تحت علمی، ادبی، ثقافتی اور تعلیمی سرگرمیوں سے متعلق خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ ان خبروں سے ہماری ادبی و ثقافتی سرگرمیوں، جموع اور زبان و ادب کی سمت و رفتار کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ خبر نامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ کوشش کے باوجود بہت سی اہم خبریں ہم تک موصول ہونے سے رہ جاتی ہیں۔ اس لیے منتظمین سے گزارش ہے کہ وہ اہم علمی، ادبی و ثقافتی تقریبات اور وفیات سے متعلق خبریں درجہ ذیل ای میل urdudunyancpul@yahoo.co.in | editor@ncpul.in پر ارسال کرنے کی زحمت کریں۔ (ادارہ)

دھلی

'موبائل کھلونا نہیں' کی رسم اجرا

نئی دھلی: مسلم اتحاد کمیٹی دہلی کے زیر اہتمام اردو اکادمی دہلی کے تعاون سے بچوں کے ادب پر سیمینار منعقد ہوا جس کی صدارت پروفیسر عبدالحق نے کی۔

سیمینار کا عنوان ''اکیسویں صدی میں دہلی میں اردو ادب اطفال کا ارتقا'' تھا جس میں شریک مقالہ نگاروں نے اپنے جامع خیالات کا اظہار کیا اور بروقت پروگرام اپنے اختتام کو پہنچا۔ نظامت ادیب وصحافی عرفان راہی صیدپوری سنبھلی نے کی۔ اس موقع پر ماہر ادب اطفال ڈاکٹر حبیب سیفی کی 18 ویں تصنیف ''موبائل کھلونا نہیں'' اشاعت: سال 2025 قومی اردو کونسل وزارت تعلیم (حکومت ہند) کی رسم رونمائی بھی عمل میں آئی۔ سیمینار کا کلیدی خطبہ محمد تقی سیفی نائب صدر شاہ ولی اللہ لائبریری دہلی نے پیش کیا، اپنے خطبے میں اردو اکادمی دہلی کی ادب اطفال پر شائع مطبوعات کا جائزہ پیش کیا۔ سیمینار کا کلیدی خطبہ محمد تقی سیفی نائب صدر شاہ ولی اللہ لائبریری دہلی نے پیش کیا، اپنے خطبے میں اردو اکادمی کی ادب اطفال پر شائع مطبوعات کا جائزہ پیش کیا۔ سیمینار کے صدر پروفیسر عبدالحق نے اپنی تحریر میں علامہ اقبال کی نظموں میں بچوں کی تربیت کے عناصر سے مستفید ہونے کا موقع مرحمت فرمایا، ان کے مطابق حبیب سیفی مولانا رومی کے قلندر کی طرح شب تاریک میں ایک چراغ روشن کر رہے ہیں، جو شاید ہماری رہ گزر کو فروزاں کر سکے۔ انھوں نے تازہ تصنیف پر تہنیت پیش کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 19 جنوری 2026

شائقین کتب کا جم غفیر

نئی دھلی: بھارت منڈپم (پرگتی میدان) میں منعقد عالمی کتاب میلہ آج اختتام پذیر ہوگیا۔ اس میلے میں

ایک ہزار سے زائد پبلشرز اور 6000 سے زائد اسٹالز کا وسیع ذخیرہ سجایا گیا، جس میں بیرون ممالک کے پبلشرز کے بھی اسٹالز شامل تھے۔ این سی پی یو ایل، اردو اکادمی دہلی اور اردو اکادمی اتر پردیش کے اسٹال بھی میلے میں لگائے گئے تھے۔ این سی پی یو ایل کے اسٹال پر اردو زبان کے اہم ادبی پروگرام منعقد کیے گئے۔ میلے میں اردو ادب سے محبت کرنے والوں کے لیے متعدد سیشن ہوئے، جن میں اردو زبان اور نئی نسل اور اردو یونانی طب جیسے موضوعات پر گفتگو کی گئی۔ اردو اکادمی اتر پردیش نے بھی اپنے بہترین ادبی ذخیرے کے ساتھ موجودگی درج کرائی۔ دہلی میونسپل کارپوریشن نے پہلی مرتبہ عالمی کتاب میلے میں حصہ لیا۔ اس بار میلے میں قطر اور اسپین کو مہمانان کے زمرے میں شامل کیا گیا، جس میں قطر کو مہمان ملک اور اسپین کو فوکس کنٹری کا درجہ دیا گیا، جس سے بین الاقوامی ادبی تبادلہ ممکن ہوا۔ 9 روزہ عالمی کتاب میلے میں تقریباً 20 لاکھ افراد نے شرکت کی۔ میلے میں 35 سے زائد بیرون ممالک کے ایک ہزار سے زیادہ پبلشرز نے 3000 سے زائد اسٹالز لگائے۔

ہر سال کی طرح اس بار بھی کتاب میلے میں مختلف زبانوں کی ہزاروں کتابیں، ادبی مواد اور جدید مطبوعات پیش کی گئیں، جنھیں دیکھنے کے لیے ملک بھر سے طلبہ، ادیب، ناشر اور کتاب دوست پہنچے۔ میلے میں آنے والے لوگوں نے بتایا کہ وہ نہ صرف نئی کتابیں خریدنے آئے ہیں بلکہ ادبی محفلوں، ورکشاپس اور مصنفین سے ملاقات کا بھی بھرپور فائدہ اٹھایا۔ میلے کے آخری دن خصوصی طور پر کئی مصنفین اور شاعروں کی نشستیں بھی رکھی گئی تھیں، جن میں شائقین نے بڑی تعداد میں شرکت کی اور اپنی پسندیدہ، کتابوں پر دستخط کروائے۔ ناشرین نے بھی اس موقع پر بتایا کہ عالمی کتاب میلہ ملک کے مختلف حصوں کی ادبی اور ثقافتی ترقی کے لیے ایک بہترین پلیٹ فارم ہے۔ اس میلے میں موجود اسٹالز میں مقبول ادب، نصابی کتابیں، بچوں کے ادب اور جدید تحقیقاتی کتابوں کی بڑی تعداد پیش کی گئی، جس نے ہر عمر کے افراد کی دلچسپی کو برقرار رکھا۔ اس عالمی کتاب میلے نے ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ کتابیں نہ صرف علم کا ذریعہ ہیں بلکہ معاشرتی اور ثقافتی روابط کو مضبوط کرنے کا بھی اہم ذریعہ ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 جنوری 2026

آرٹ، کرافٹ اور سائنس نمائش

نئی دھلی: آریکل پبلک اسکول میں ونٹر ویکیشن کے دوران آرٹ کرافٹ اینڈ سائنس نمائش کا انعقاد کیا گیا۔ سیلم پور کے اسمبلی حلقہ چوہان بانگر میں واقع آریکل

پبلک اسکول میں پڑھائی کے ساتھ بچوں کو پریکٹیکل میں مضبوط بنانے کے لیے گذشتہ سردی کی چھٹیوں میں ایک پروجیکٹ ماڈل کی شکل میں دیا گیا تاکہ والدین اور بچوں کے درمیان رابطہ بہتر ہو سکے۔ آریکل اسکول کے ڈائرکٹر فہیم احمد نے بتایا کہ آجکل دیکھا جا رہا ہے کہ ایک طرف والدین موبائل دیکھتے رہتے ہیں تو دوسری طرف بچے

اورٹی وی کے ساتھ اپنا وقت گزارتے ہیں، ہم نے اس مرتبہ چھٹیوں کے دوران والدین کو بچوں کے ساتھ جوڑنے کے لیے ایک پروجیکٹ کی شکل میں بچوں کو ماڈل بنانے کے لیے کہا تا کہ بچوں میں تخلیقی صلاحیت پیدا ہو اور اس ماڈل کو بنانے کے لیے والدین بھی بچوں کو اپنے مشورے سے نوازیں۔ اسی آرٹ کرافٹ سائنس نمائش کا آج انعقاد کیا گیا ہے جس میں بچوں کے ساتھ ساتھ والدین نے بھی شرکت کی ہے۔ اسکول کی پرنسپل للیتا پانڈے نے بتایا کہ ہم نے سائنس کی جانکاری کے لیے بچوں کو پروجیکٹ بنانے کے لیے دیے جس میں سولر سسٹم، واٹر پیوری فائر جیسے جدید ٹوپک تھے اور اس پر بچوں نے بہت اچھے سے ماڈل تیار کیے ہیں اور آج اسکول میں نمائش کی شکل میں پہلی کلاس سے لے کر 5ویں کلاس کے بچوں نے اپنا ہنر دکھایا ہے۔ بچے جن چیزوں کو کتابوں میں پڑھتے ہیں ان کو آج پریکٹیکل شکل دی گئی ہے۔ اس نمائش کو کامیاب بنانے میں اسکول کے تمام اسٹاف نے اہم رول ادا کیا۔ اس دوران طلبا اور والدین گھر سے بھی اس پروجیکٹ کے تعلق سے اساتذہ سے رابطہ میں رہے اور اسکول اساتذہ نے سب کی بہتر طریقے سے رہنمائی کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 19 جنوری 2026

شمس الرحمٰن فاروقی پر سمپوزیم

نئی دھلی: ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام اردو کے ممتاز نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کی ادبی خدمات پر آج یک روزہ سمپوزیم کا انعقاد کیا گیا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر علی احمد فاطمی نے کی۔ انھوں نے کہا کہ شمس الرحمٰن فاروقی ہمہ صنف استاذ تھے۔ وہ کسی تحریک و تنظیم

سے وابستہ ہوئے بغیر خود ایک تحریک و عظیم بن گئے۔ خود ایک دبستان بنے جس نے پوری ایک نسل کی ذہن سازی کی اور ادب فہمی و شعر فہمی کے نئے ابعاد قائم کیے۔ چندر بھان خیال نے کہا کہ شمس الرحمٰن فاروقی اردو ادب کا ایک روشن باب ایک درخشاں ستارہ، جدیدیت کے علمبردار اور تنقید کے ساتھ ساتھ تخلیق کی بے پناہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ انھوں نے (شمس الرحمٰن) نے اپنے وسیع مطالعہ، تجزیاتی انداز فکر، فکری ارتقا اور اپنی دوربین نگاہ سے عالمی اردو ادب میں جو مقام حاصل کیا اس کا زمانہ معترف ہے۔ اس موقع پر کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے شمس الرحمٰن فاروقی کے حوالے سے بہت سی ذاتی باتیں بتاتے ہوئے ایسے اردو انگریزی مضامین کی ایک پوری فہرست کی نشان دہی کی جو نہ تو ان کی زندگی میں شائع ہوئے اور نہ ہی ان کے انتقال کے بعد زیور طباعت سے آراستہ ہو سکے۔ ساہتیہ اکادمی کے ایڈیٹر (ہندی) انوپم تیواری نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور شمس الرحمٰن فاروقی کے حوالے سے چند نکات پر روشنی ڈالی۔ پہلے تکنیکی اجلاس کی صدارت پروفیسر احمد محفوظ نے کی۔ اقبال حسین نے 'شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقیدی بصیرت: پس نو آبادیاتی مطالعہ' موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا جبکہ کرناٹک یونیورسٹی، دھارواڑ سے آئیں ڈاکٹر شکیلہ بانو گوری خان نے 'شمس الرحمٰن فاروقی کی افسانہ نگاری: تہذیب اور تاریخی فکشن کا بیانیہ' کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے پروفیسر سراج اجملی نے 'شمس الرحمٰن فاروقی میرے مربی اور استاذ' کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کی۔ انھوں نے کہا کہ فاروقی ادبی دیانت داری کے قائل تھے۔ ان سے اختلاف کرنے والے بھی ان کی علمیت کا معترف تھے۔ وہ بدلتے دور کے رجحانات اور رویے کے پیش نظر نئے تنقیدی رجحان کا آغاز کرتے ہیں۔ اس اجلاس میں دو مقالے پیش کیے گئے۔ پہلا مقالہ کانپور سے آئے ڈاکٹر جگدمبا دوبے نے 'شمس الرحمٰن فاروقی' کے عنوان سے پیش کیا جبکہ دوسرا اور پروگرام کا آخری مقالہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو کے صدر پروفیسر کوثر مظہری نے 'کیا نقاد کا وجود ضروری ہے: فاروقی بازدید' کے عنوان سے پیش کیا۔

روزنامہ انقلاب 23 جنوری 2026

نیتا جی سبھاش چندر بوس پر قومی سمینار

نئی دھلی: دی پین فاؤنڈیشن، ہنس راج کالج اور ماٹی ٹرسٹ کے اشتراک سے ہندستان کی جدوجہد آزادی

کے عظیم رہنما نیتا جی سبھاش چندر بوس پر قومی سمینار منعقد کیا گیا۔ سمینار میں ملک بھر سے اساتذہ، دانشوروں اور سینئر صحافیوں نے شرکت کی اور نیتا جی کی کثیر جہتی شخصیت، انقلابی فکر اور ادبی اثرات پر تحقیقی مقالے پیش کیے۔ سمینار کے افتتاحی اجلاس میں سابق مرکزی وزیر اور گاندھی درشن کے نائب صدر وجے گوئل مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے، جبکہ مہمانان اعزازی میں ایم ایل سی اور بی جے پی کے نیشنل میڈیا کو ہیڈ سنجے میوکھ شامل تھے۔ اجلاس کی صدارت سینئر آئی اے ایس افسر نیشور کمار نے کی۔

اس موقع پر وجے گوئل نے کہا کہ نیتا جی بے مثال جرأت، حوصلے اور قربانی کی علامت تھے، جن کی زندگی اور افکار آنے والی نسلوں کے لیے قوم کی خدمت اور فرض شناسی کا پیغام دیتے رہیں گے۔ نیشور کمار نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ نیتا جی ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کے لیے ہمیشہ تحریک کا سرچشمہ رہے ہیں، جن کی جدوجہد اور شخصیت پر مختلف زبانوں میں بے شمار ادبی تخلیقات وجود میں آئیں۔ سمینار کے محرک اور دی پین فاؤنڈیشن کے چیئرمین آصف اعظمی نے کہا کہ اس سمینار کا مقصد نیتا جی پر ہندی، بنگالی، اڑیہ، مراٹھی اور اردو میں دستیاب ادبی مواد کا جائزہ لینا اور اسے منظم شکل میں محفوظ کرنا ہے۔ ہندی اور اردو اکادمی، دہلی کے اشتراک سے منعقد اس قومی سمینار میں ملک کی ممتاز یونیورسٹیوں سے تعلق رکھنے والے پندرہ اساتذہ اور سینئر صحافیوں نے تحقیقی مقالے پیش کیے۔

روزنامہ انقلاب 24 جنوری 2026

دہلی یونیورسٹی میں فارسی سیریز کے تحت 45واں علمی لیکچر منعقد

نئی دھلی: دہلی یونیورسٹی میں پرشین لیکچر سیریز کے تحت 45واں لیکچر نہایت وقار اور علمی شان کے ساتھ منعقد ہوا۔ اس موقع پر ممتاز مورخ، ماہر مغلیہ تاریخ اور سابق صدر شعبہ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، پروفیسر گلفشاں خان نے بحیثیت خطیب ''شاہجہاں آباد کی تاریخ

اورتعمیرات: پادشاہ نامہ کے حوالے سے'' کے موضوع پر بصیرت افروز اور فکر انگیز خطاب فرمایا۔ اپنے لیکچر میں پروفیسر گلفشاں خان نے شہنشاہ شاہجہاں کی جمالیاتی حس پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ شاہجہاں کو فطرت، خصوصاً پھولوں سے گہری محبت تھی، جس کا عکس اس کے عہد کی تعمیرات میں جا بجا نظر آتا ہے۔ انھوں نے واضح کیا کہ مغل فنِ تعمیر میں پھولوں کے نفیس نقوش محض آرائش نہیں بلکہ ایک فکری اور جمالیاتی تصور کے مظہر ہیں۔ انھوں نے پادشاہ نامہ کے حوالے سے دریائے جمنا کے نقشے اور اس کی منظر نگاری کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اس عہد کے مورخین اور مصوروں نے قدرتی مناظر کو غیر معمولی حسن کے ساتھ محفوظ کیا ہے۔ خطاب کے دوران لال قلعہ، فتح پوری مسجد، اکبرآبادی مسجد اور مسجد جہاں نما (جو آج جامع مسجد کے نام سے معروف ہے) کی تعمیراتی خصوصیات، تاریخی اہمیت اور تہذیبی معنویت پر تفصیلی گفتگو کی گئی۔ مزید برآں، مقررہ نے مغل دور کی نایاب تصاویر اور پینٹنگز بھی پیش کیں، جو انھوں نے مختلف عالمی میوزیمز اور نادر کتب خانوں سے تحقیق کے دوران حاصل کی تھیں، جس سے لیکچر کی افادیت اور دلچسپی میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 29 جنوری 2026

ڈیجیٹل اور مخلوط تعلیم کے رجحانات پر تبادلہ خیال

نئی دہلی: دہلی یونیورسٹی کے اسکول آف اوپن لرننگ (ایس او ایل) اور کیمپس آف اوپن لرننگ کے

اشتراک سے 'نیشنل اسسمنٹ اینڈ ایکریڈیٹیشن کونسل اور برٹش کونسل کے تعاون سے پہلی بین الاقوامی کانفرنس سائنس بھون، نئی دہلی میں منعقد ہوئی۔ کانفرنس کا موضوع 'مفت، دور دراز، ڈیجیٹل اور مخلوط تعلیم میں ابھرتے رجحانات اور چیلنجز' تھا۔ افتتاح دہلی حکومت کے وزیر تعلیم آشیش سود نے کیا، جبکہ صدارت دہلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر یوگیش سنگھ نے کی۔ وزیر تعلیم نے کہا کہ نوجوانوں کو آن لائن، دور دراز، ڈیجیٹل اور مخلوط تعلیمی ذرائع کے ذریعے اعلیٰ تعلیم تک رسائی دینا قومی ترقی کے لیے ضروری ہے، جبکہ پروفیسر یوگیش سنگھ نے اوپن اسکول تعلیم میں یونیورسٹی کے قیادتی کردار کو اجاگر کیا۔ کیمپس آف اوپن لرننگ کی ڈائرکٹر پروفیسر پائل ماگو اور ایس او ایل کے پرنسپل پروفیسر اجے جیسوال نے اوپن اسکول تعلیم میں اختراع، معیار کی یقین دہانی، طلبہ کی معاونت اور اساتذہ کی تربیت کی اہمیت پر زور دیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 جنوری 2026

جی۔ ڈی چندن کی کہانیوں کا ہندی ترجمہ

نئی دہلی: غالب اکیڈمی کی ماہانہ نثری نشست میں گزشتہ روز جی ڈی چندن کی کہانیوں کے ہندی ترجمے کے ہندی ایڈیشن کا اجرا عمل میں آیا۔ مشہور صحافی گربچن

داس چندن کی کہانیوں کو مشہور افسانہ نگار مرحوم انجم عثمانی نے ترتیب دیا تھا جسے غالب اکیڈمی نے 2017 میں شائع کیا تھا۔ اسی مجموعے کو ڈاکٹر رخشندہ روحی نے ہندی میں ترجمہ کیا، اسے غالب اکیڈمی نے جنوری 2026 میں شائع کیا۔ جس کا اجرا غالب اکیڈمی کی ماہانہ نشست میں ہوا۔ نشست کی صدارت ڈاکٹر جی آر کنول نے کی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ چندن صاحب کی کہانیوں کا ترجمہ رخشندہ روحی نے ہندی میں کیا ہے بہت اچھا ترجمہ ہے۔ کہانی وہ ہوتی ہے جو حیرت میں ڈال دے کچھ کہانیاں عمر بھر یاد رہتی ہیں۔ پہلے ہندی کی کتابیں اردو میں اسی مقصد سے چھاپی جاتی تھیں کیونکہ اردو سب جانتے تھے۔ ہندو اور سکھ مذہب کی کتابیں بھی اردو میں زیادہ پڑھی جاتی تھیں۔ اس موقع پر اردو کے مشہور افسانہ نگار خورشید حیات نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ رخشندہ روحی لسانی اتحاد پسند ہیں۔ آج کی نشست میں پڑھی گئی کہانیاں بہت متاثر کرنے والی ہیں۔ اس موقع پر رخشندہ روحی نے چندن صاحب کی کہانی جسونت سنگھ پڑھ کر سنائی۔ کہانی اور ترجمے کو پسند کیا گیا۔ تقریب میں سہیل انجم، پروفیسر ابوبکر عباد، قاضی راغب، پروین ویاس، ڈاکٹر نعیمہ جعفری نے بھی اظہار خیال کیا۔ اس موقع پر ہندی کے مشہور افسانہ نگار کویشور نے 'جیت اور جسی میں ایک فوجی'، سیما کوشک نے 'سب کا بھلا کرنے والا' اور سنجیو دوانے 'بائیں ہاتھ کو معلوم نہ ہو' کہانیاں پیش کیں۔ اس موقع پر چشمہ فاروقی نے آج کا نوجوان بااختیار ہے یا دباؤ کا شکار کے عنوان سے ایک مضمون پڑھا۔ اس موقع پر ڈاکٹر شمع افروز زیدی، نرگس سلطانہ، جاوید حسن، شری کانت کوہلی، پون کمار تومر اور دیگر معزز حضرات نے نشست میں شرکت کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 3 فروری 2026

اردو اساتذہ کا جشن

نئی دہلی: دہلی حکومت کی وزارت فن، ثقافت والسنہ کے تحت اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام 'اردو اساتذہ

کا جشن' اتوار کو سینٹرل پارک، کناٹ پلیس میں منعقد ہوا۔ اس ادبی و ثقافتی جشن میں دہلی کے مختلف اسکولوں سے وابستہ اردو اساتذہ، طلبہ، ادبا اور ادب دوست حلقوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ تقریب کا آغاز استقبالیہ کلمات سے ہوا، جن میں اردو زبان کی تدریسی خدمات اور اساتذہ کے تعلیمی و فکری کردار کو سراہا گیا۔ پروگرام کے مہمان خصوصی کے مہیش سکریٹری محکمہ فن، ثقافت والسنہ، حکومت دہلی تھے۔ انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ دہلی حکومت راجدھانی کو ایک فعال ثقافتی مرکز (کلچرل ہب) کے طور پر فروغ دینے کے لیے سنجیدہ کوششیں کر رہی ہے۔ اردو اکادمی کے ساتھ میتھلی، پنجابی، ہندی اور سندھی اکادمیوں کے ذریعے بھی ادبی و ثقافتی سرگرمیاں جاری ہیں، جن میں تمام زبانوں سے وابستہ شائقین کو شرکت کرنی چاہیے۔ پروگرام کی نظامت ریشما فاروقی اور سفیر صدیقی نے کی۔ جشن کا آغاز تقریری مقابلے سے ہوا، جو دو زمروں میں تقسیم تھا۔ پہلے زمرے میں ٹی جی ٹی اساتذہ کے مابین 'ڈیجیٹل دور میں کلاس

روم کی اہمیت' کے موضوع پر تقریری مقابلہ ہوا۔ ججوں کی حیثیت سے شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی کے ڈاکٹر ارشاد نیازی اور دہلی حج کمیٹی کے ایگزیکٹو آفیسر اشفاق عارفی شریک رہے۔ 7 اساتذہ نے مقابلے میں حصہ لیا۔ ججوں کے فیصلے کے مطابق صائمہ ناز نے پہلی، کلثوم فاطمہ نے دوسری اور محمد دانش نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔ دوسرے زمرے میں پی جی ٹی اساتذہ کے لیے 'اردو ادب کے فروغ میں اساتذہ کا فکری اور عملی کردار' کے موضوع پر تقریری مقابلہ منعقد ہوا، جس میں 6 اساتذہ نے شرکت کی۔ مقابلے میں پہلی پوزیشن فرحان بیگ، دوسری ڈاکٹر شہلا نواب اور تیسری ڈاکٹر عبدالرزاق زیادی کے حصے میں آئی۔ کامیاب شرکا کو نقد انعام دیے گئے۔ مقابلے کے اختتام پر ڈاکٹر ارشاد نیازی نے کہا کہ موجودہ دور میں اساتذہ کو تدریس کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا ہوگا۔

اشفاق عارفی نے موضوع کے عمیق مطالعے اور تحقیق کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اساتذہ طلبہ کے فکری معمار ہوتے ہیں، اس لیے ان کی ذمہ داریاں دوچند ہو جاتی ہیں۔ اکادمی کے زیر انتظام اردو خواندگی مراکز کے طلبہ کو کورس کی تکمیل پر اسناد سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 3 فروری 2026

بکرم نندا یادگاری خطبہ

نئی دھلی: شعبہ سماجیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے پانچواں بکرم نندا یادگاری خطبہ منعقد کیا۔ یہ یادگاری خطبہ ممتاز اسکالر، مرحوم پروفیسر بکرم نندا کی یاد میں منعقد کیا گیا تھا

جن کی فکری وراثت طلبہ اور اسکالرس کی یکساں طور پر رہنمائی کرتی رہی ہے۔ پروگرام کا انعقاد شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر مظہر آصف، پروفیسر محمد مہتاب عالم رضوی، مسجل جامعہ ملیہ اسلامیہ اور پروفیسر زبیر مینائی، ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز کی سرپرستی میں ہوا۔ پروگروم میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے فیکلٹی اراکین، ریسرچ اسکالرس اور طلبہ نیز یونیورسٹی کے باہر کے شرکا انتہائی جوش وخروش کے ساتھ شریک ہوئے۔

انڈین کونسل آف سوشل سائنس ریسرچ (آئی سی ایس ایس آر) کے ممبر سکریٹری اور سابق چیئرپرسن، سینٹر فار انگلش اسٹڈیز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی پروفیسر دھنجے سنگھ نے 'پائیدار ترقی کے لیے پائیدار تحقیق' کے موضوع پر کلیدی خطبہ دیا۔ اپنی تقریر میں پروفیسر سنگھ نے معاصر ماحولیاتی تشویش پر جامع اور تنقیدی نقطہ نظر سے اظہار خیال کیا اور ماحولیاتی بحران سے نمٹنے میں سوشل سائنس کی مرکزیت کو نشان زد کیا۔ انھوں نے دیہات اور پسماندہ طبقات کے ساتھ رابطے کو مضبوط ومستحکم کرنے، ہندوستانی علوم نظام کو شامل کرنے اور اس بات کو یقینی بنانے کے لیے پائیداری کی بحث ہندوستان میں سماجی انصاف اور صنفی مساوات کے مسائل پر مبنی رہے، کی اہمیت اجاگر کی۔ انھوں نے آئی سی ایس ایس آر کے مختلف اقدامات، خاص طور پر طلبہ اور نئے محققین کو مختصر مدتی تحقیقی پروجیکٹ کے لیے درخواست دینے کے لیے رغبت دلانا جس سے کہ سماجی لحاظ سے متعلقہ، شمولیتی اور پالیسی پر مبنی مضبوط تحقیقی فضا کا فروغ ہو سکے، پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ پروفیسر سنگھ نے ہندوستانی تناظر میں پائیدار ترقی اہداف کے ساتھ علمی معاملہ، اخلاقی تحقیقی عمل اور بین علومی اپروچ کی ضرورت پر زور دیا۔ صدر شعبہ پروفیسر عذرا عابدی کی خیر مقدمی تقریر اور تعارف سے پروگرام کا آغاز ہوا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 7 فروری 2026

اردو اکادمی کے زیر اہتمام سہ روزہ قومی سمینار

نئی دھلی: اردو اکادمی، دہلی کے زیر اہتمام سہ روزہ قومی سمینار 'اکیسویں صدی میں ادبی رجحانات: تجزیہ اور امکانات' کا افتتاحی اجلاس سنیچر کو منعقد ہوا۔ افتتاحی

اجلاس کی صدارت نامور محقق ونقاد پروفیسر عبدالحق نے کی، جبکہ کلیدی خطبہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے شعبہ اردو کے ریٹائرڈ پروفیسر قاضی جمال حسین نے پیش کیا۔ فیکلٹی آف آرٹس، اے ایم یو کے سابق ڈین اور معروف ادیب وودانشور پروفیسر قاضی افضال حسین مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ اجلاس کی نظامت ڈاکٹر شفیع ایوب نے انجام دی۔ سمینار کے کنوینر پروفیسر ابوبکر عباد نے سمینار کا خاکہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ٹیکنالوجی، عالمگیریت، سماجی تغیرات اور شناخت سے متعلق نئے مباحث نے ادب کے مزاج، موضوعات اور اسالیب کو گہرے طور پر متاثر کیا ہے۔ دیگر زبانوں کی طرح اردو ادب میں بھی یہ رجحانات تیزی سے داخل ہو رہے ہیں جبکہ مصنوعی ذہانت سے حاصل شدہ وسائل تحقیق کے میدان میں نئی جہات اور امکانات پیدا کر رہے ہیں۔ اپنے کلیدی خطاب میں پروفیسر قاضی جمال حسین نے کہا کہ کسی بھی ادبی نظریے یا رویے کو ادعائیت کے ساتھ قبول کرنا مناسب نہیں، کیونکہ ادبی نظریات کوئی جامد عقیدہ نہیں ہوتے بلکہ وقت، حالات اور انسانی تصورات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ پروفیسر قاضی افضال حسین نے مغربی تنقیدی تصورات پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردو میں بیسویں صدی کی بیشتر ادبی تحریکات مغرب سے مستعار نظریات پر مبنی تھیں، جس کے نتیجے میں ہم کسی نہ کسی نظریے کے سہارے لکھنے کے عادی ہو گئے۔ اپنے صدارتی خطاب میں پروفیسر عبدالحق نے ترقی پسند تحریک اور دیگر مغربی تصورات کو ادب کے لیے نقصان دہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ ہر دور میں مختلف تحریکات ابھرتی ہیں، مگر وقت گزرنے کے ساتھ ان میں سے اکثر اپنی معنویت کھو بیٹھتی ہیں۔ سمینار کے دوسرے دن پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر قاضی افضال حسین، پروفیسر قاضی جمال حسین اور پروفیسر صفدر امام قادری نے مشترکہ طور پر کی جبکہ نظامت ڈاکٹر سلمان فیصل نے انجام دی۔ اس اجلاس میں پروفیسر شہناز نبی، پروفیسر مشتاق احمد، پروفیسر ندیم احمد، سید ابوذر ہاشمی، ڈاکٹر ارشاد نیازی اور ڈاکٹر شہناز رحمن نے مجوزہ عناوین پر مقالات پیش کیے، جن پر سنجیدہ اور بامعنی گفتگو ہوئی۔ مقالات کے بعد اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر صفدر امام قادری نے کہا کہ سمینار کے مرکزی موضوع سے ہم آہنگ کئی اہم ذیلی عناوین نظر انداز ہو گئے، حالانکہ ان کے ذریعے اکیسویں صدی کے ادبی رجحانات پر زیادہ جامع گفتگو ممکن تھی۔ پروفیسر قاضی جمال حسین نے کہا کہ سمینار کا موضوع بظاہر سادہ دکھائی دیتا ہے، مگر اپنے باطن میں گہری فکری معنویت رکھتا ہے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر شہزاد انجم، پروفیسر

کوثر مظہری اور پروفیسر شیخ عقیل احمد نے کی، جبکہ نظامت ڈاکٹر افسانہ حیات نے انجام دی۔ اس اجلاس میں احمد صغیر، ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی اور ڈاکٹر سنجے کمار نے مجوزہ عناوین پر مقالات پیش کیے۔ اس موقع پر محکمہ فن، ثقافت والسنہ حکومت دہلی کے ایڈیشنل سکریٹری اور اردو اکادمی کے سکریٹری لیکھ راج نے کہا کہ کسی بھی زبان کے فروغ کے لیے اس کے وابستگان کا وقت دینا نہایت ضروری ہے۔ سمینار میں ادبی وعلمی حلقوں سے تعلق رکھنے والی متعدد ممتاز شخصیات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 9 فروری 2026

ڈاکٹر ذاکر حسین کی خدمات ناقابل فراموش

نئی دھلی: جامعہ نیشنل فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام آج جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تعاون سے عظیم مفکر، ماہر تعلیم، محب وطن، تیسرے صدر جمہوریہ ہند اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے

بانیوں میں سے ایک ڈاکٹر ذاکر حسین کو ان کے 129 ویں یوم پیدائش پر خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ انجینئرنگ ٹیکنالوجی کے آڈیٹوریم میں منعقد اس تقریب میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر مظہر آصف نے بحیثیت مہمان خصوصی، سابق مرکزی وزیر اور انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے چیئرمین سلمان خورشید بحیثیت مہمان ذی وقار، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے رجسٹرار پروفیسر محمد مہتاب عالم رضوی بحیثیت مہمان ذی وقار اور ڈاکٹر سید فاروق سرپرست جامعہ فاؤنڈیشن نے شرکت کی۔ اس موقع پر ڈاکٹر ذاکر حسین سے متعلق ڈاکومینٹری فلم کی نمائش کی گئی۔ اور ان کی مشہور کہانی 'ابو خان کی بکری' کو ڈرامہ کی شکل میں پیش کیا گیا۔ تعلیمی مقابلوں میں کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ کو ایوارڈ پیش کیے گئے۔ اس موقع پر جامعہ فاؤنڈیشن نے اعلان کیا کہ ہر سال 100 طلبہ کی فیس کی کفالت کریں گے۔ مہمان اعزازی سابق مرکزی وزیر سلمان خورشید نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ میری تعلیم کا آغاز جامعہ کی نرسری سے ہوا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین تعلیم کو ملازمت کے لیے نہیں بلکہ انسانی خدمات کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ جامعہ نے جنگ آزادی میں اہم کردار ادا کیا اور آج بھی جامعہ تعلیم کے میدان میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ اس موقع پر تسمیہ ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر سید فاروق نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے تعلیم کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے۔ یہ انھیں کا شیوہ ہے۔ ایسے قائد کو یاد کرنا ہم سب کا فریضہ ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر مظہر آصف نے بھی نشست سے خطاب کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 فروری 2026

سائبر جرائم اور 'ڈیجیٹل اریسٹ'

نئی دھلی: دہلی ساہتیہ فیسٹیول کے 14 ویں ایڈیشن میں بڑھتے ہوئے سائبر جرائم کے خطرات پر ایک خصوصی سیشن منعقد کیا گیا، جس میں ہندوستان کے

تیزی سے ڈیجیٹل ہوتے ماحول میں 'ڈیجیٹل اریسٹ' گھپلوں اور مالی دھوکہ دہی پر خاص توجہ دی گئی۔ ہندستان سائبر کرائم کوآرڈینیشن سینٹر (14) سی کے ڈائرکٹر نیشانت کمار نے بتایا کہ جعلساز تیزی سے پولیس افسران یا تحقیقاتی ایجنسیوں کے اہلکاروں کا روپ دھارتے ہیں اور جھوٹا دعویٰ کرتے ہیں کہ کوئی شخص تحقیقات کے دائرے میں ہے۔ پھر انھیں ڈرا دھمکا کر 'ڈیجیٹل اریسٹ' کر لیا جاتا ہے اور دباؤ ڈال کر پیسوں کی منتقلی پر مجبور کیا جاتا ہے، کبھی قانونی تصدیق کے بہانے کبھی معاملے کے تصفیے یا اکاؤنٹ سے رقم نکالنے کے نام پر۔ انھوں نے واضح کیا کہ ''اگر کوئی فون پر یہ دعویٰ کرے کہ آپ کو ڈیجیٹل اریسٹ کر لیا گیا ہے یا کسی معاملے کو نمٹانے کے لیے پیسے مانگے، تو فوراً سمجھ جائیں کہ یہ دھوکہ دہی ہے۔ کوئی بھی پولیس ایجنسی اس طرح کام نہیں کرتی۔'' انھوں نے کہا کہ ''دھوکہ دہی کرنے والے لوگ فوری کارروائی کا ماحول بناتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ فوراً عمل کرو ورنہ گرفتاری ہوگی یا تمھارے اکاؤنٹ منجمد کر دیے جائیں گے۔ یہ خوف ان پر غالب آجاتا ہے اور مجرم اسی کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔'' ہندستان کے ڈیجیٹل انڈیا وژن بڑی حد تک کامیاب رہا ہے، لیکن عوامی آگاہی تکنیکی ترقی کے ساتھ قدم نہیں ملا پائی۔ انھوں نے مزید کہا کہ ''ڈیجیٹل انڈیا ہمارے لیے فخر کی بات ہے''۔ لیکن تیز رفتار ڈیجیٹلائزیشن کے ساتھ ساتھ آگاہی بھی اتنی ہی تیزی سے بڑھنی چاہیے۔ انھوں نے وزارت داخلہ کے تحت 2019 میں قائم انڈین سائبر کرائم کوآرڈینیشن سینٹ (14) سی کے کردار پر بھی روشنی ڈالی اور کہا کہ پولیسنگ آئینی طور پر ریاست کا موضوع ہے، لیکن سائبر جرائم ریاستی اور قومی حدود کو پار کر جاتا ہے۔ موثر ردعمل کے لیے ریاستوں کے درمیان ہم آہنگی اور بینکنگ، فن ٹیک اور ٹیلی کام جیسے شعبوں کے ساتھ تعاون ضروری ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 10 فروری 2026

معاصر اردو افسانہ

نئی دھلی: جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں 'معاصر اردو افسانہ' کے موضوع پر ایک خصوصی لیکچر کا انعقاد کیا گیا جس میں معروف نقاد اور دانشور پروفیسر قدوس جاوید، سابق صدر شعبہ اردو، یونیورسٹی آف کشمیر نے طلبہ وطالبات

سے خطاب کیا۔ انھوں نے اپنے لیکچر میں کہا کہ عصر حاضر میں انفارمیشن ٹیکنالوجی، کنزیومرزم (گلوبلائزیشن) اور مصنوعی ذہانت کے زیر اثر پیدا ہونے والے نئے ڈسکورسز اور آئیڈیالوجیز نیز ان کے ردعمل میں سامنے آنے والے جوابی بیانات کی کثرت نے صحیح اور غلط جیسے تصورات کو بھی مشتبہ بنا دیا ہے۔ ایسے عہد میں ادب، بالخصوص افسانہ، محض تخلیقی اظہار نہیں رہتا بلکہ فکری رہنمائی کا اہم ذریعہ بن جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ معاصر افسانہ کسی ایک سطحی سچ یا محض تخیل پر مبنی نہیں ہوتا، بلکہ ایسی صداقت کا اظہار کرتا ہے جو خود اپنی معنویت آشکار کرتی ہے اور اسی سے معاصر افسانے کی شعریات تشکیل پاتی

ہے۔ اس موقع پر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ معاصر اردو افسانہ اپنے عہد کی فکری، سماجی اور تہذیبی پیچیدگیوں کا بامعنی اظہار ہے۔ پروگرام کی صدارت شعبہ کی چیئرپرسن پروفیسر بندنا جھانے کی، جبکہ اظہار تشکر ڈاکٹر نصیب علی نے کیا۔ پروگرام کی نظامت جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے طالب علم اسلم رحمانی نے کی۔ اس موقع پر اسکالرز، طلبہ اور طالبات موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 فروری 2026

امیر خسرو پر خصوصی لیکچر

نئی دھلی: ذاکر حسین دہلی کالج (دہلی یونیورسٹی) کے شعبہ فارسی کی جانب سے آج کالج کے سمینار ہال میں امیر خسرو کی یاد اور ان کی ہمہ جہت وراثت کے حوالے

سے ایک خصوصی علمی و ثقافتی پروگرام منعقد کیا گیا۔ یہ پروگرام داخلی معیار یقین دہانی سیل اور 'وکست بھارت 2047' کے تصور کے تحت منعقد ہوا، جس میں اساتذہ، محققین اور طلبہ کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ اس پروگرام کا مرکزی موضوع ''امیر خسرو کی وراثت اور ہند۔فارسی ادب وثقافت'' رہا۔ مذاکرے کے دوران امیر خسرو کی صوفیانہ فکر، موسیقی کی روایت اور ہندستانی کثیر لسانی ادب میں ان کی بے مثال خدمات پر تفصیلی گفتگو کی گئی۔ مقررین نے اس بات پر زور دیا کہ امیر خسرو کی تخلیقات آج بھی ہندستان کی گنگا۔جمنی تہذیب اور ثقافتی ہم آہنگی کی زندہ مثال ہیں۔ پروگرام کے مہمان خصوصی اور کلیدی مقرر، جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے مرکز فارسی و وسطی ایشائی مطالعات کے صدر پروفیسر اخلاق احمد 'آہن' نے اپنے فکر انگیز خطاب میں امیر خسرو کو محض ایک عظیم شاعر نہیں بلکہ ہندستان اور فارس کی تہذیبوں کو جوڑنے والا ایک مضبوط ثقافتی پل قرار دیا۔ انھوں نے صوفی فلسفہ، موسیقی، فارسی۔ ہندوی شاعری اور عوامی روایتوں میں خسرو کی دائمی موجودگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ان کی وراثت آج کے دور میں باہمی اخوت اور ثقافتی مکالمے کی رہنمائی کرتی ہے۔ اس پروگرام کی صدارت پروفیسر شمیم الحق صدیقی نے کی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر راجندر کمار، سابق صدر شعبہ فارسی، دہلی یونیورسٹی شریک رہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 11 فروری 2026

نظام خطبہ

نئی دھلی: شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام آج سالانہ نظام اردو خطبہ کا انعقاد خواجہ احمد فاروقی

لائبریری، شعبہ اردو میں کیا گیا۔ اس سال خطبے کا موضوع 'ہندوستان میں افریقی ادب کے مطالعات' رکھا گیا تھا، جس میں اساتذہ، محققین اور طلبہ کی کثیر تعداد نے شرکت کی، تقریب کے کلیدی مقرر ادیب ونقاد، پروفیسر ہریش نارنگ تھے۔ جنھوں نے اپنے خطبے میں افریقی ادب کی تاریخی بنیادوں، نوآبادیاتی پس منظر، مزاحمتی شعور اور تہذیبی شناخت کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ افریقی ادب اپنے سماجی اور سیاسی تناظر میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے اور ہندوستانی جامعات میں اس کے مطالعات کو فروغ دینے کی اشد ضرورت ہے۔ انھوں نے ہندستان اور افریقہ کے درمیان ادبی وثقافتی روابط کو مزید مستحکم کرنے پر زور دیتے ہوئے طلبہ ومحققین کو اس میدان میں نئے تحقیقی امکانات تلاش کرنے کی تلقین کی۔ تقریب کی صدارت پروفیسر بلرام پانی نے کی۔ انھوں نے کہا کہ اس نوعیت کے علمی خطبات طلبہ میں بین الاقوامی ادب کے مطالعے کا ذوق بیدار کرتے ہیں اور فکری وسعت کا سبب بنتے ہیں۔ انھوں نے شعبہ اردو کی علمی وتحقیقی سرگرمیوں کو سراہا۔ مہمان خصوصی پروفیسر بندیہ واسنی پانڈے نے کہا کہ افریقی اور ایشیائی ادب میں مشترکہ نوآبادیاتی تجربات پائے جاتے ہیں، جن کا تقابلی مطالعہ عصر حاضر میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ مہمان اعزازی پروفیسر آئی این سنگھ نے بھی اپنے تاثرات میں موضوع کے انتخاب کو بروقت اور معنویت سے بھرپور قرار دیا۔ صدر شعبہ اردو پروفیسر ابوبکر عباد نے مہمانان کرام کا خیر مقدم کرتے ہوئے نظام اردو خطبات کی روایت اور موضوع کی اہمیت پر روشنی ڈالی، جبکہ پروگرام کے کنوینر پروفیسر متھن کمار نے مقررین، مہمانان اکرام اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر مختلف شعبوں کے اساتذہ، بالخصوص شعبہ ہندی کی صدر پروفیسر سدھا سنگھ، شعبہ عربی کے صدر پروفیسر حسنین اختر اور شعبہ فارسی کے صدر پروفیسر علیم اشرف خاں کے علاوہ ریسرچ اسکالرز اور طلبہ کی کثیر تعداد موجود رہی۔ اساتذہ میں پروفیسر ارجمند آرا، پروفیسر مشتاق عالم قادری، پروفیسر احمد امتیاز اور ڈاکٹر ارشاد نیازی شامل تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 فروری 2026

اتر پردیش

ڈراما آرٹسٹ سریندر شرما کو خراج عقیدت

میرٹھ: سریندر شرما اب ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن اپنے چاہنے والوں میں وہ سما چکے ہیں۔ وہ شعبہ اردو برابر آتے رہتے تھے۔ ایسی اہم شخصیت کے لیے ہمیں

تعزیتی جلسہ کرنا پڑ رہا ہے۔ ان کے لیے ہمارا دل بہت غم زدہ ہے۔ ان پر ایک ڈاکیومنٹری بننا چاہیے۔ یہ الفاظ تھے صدر شعبہ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری کے جو یونائیٹڈ پروگریسیو تھیٹر ایسوسی ایشن اور شعبہ اردو کے اشتراک سے منعقد میرٹھ کے معروف رنگ کرمی سریندر شرما کی یاد میں منعقد خراج عقیدت پروگرام میں ادا کر رہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اب ہماری ذمہ داری ہے کہ ان کی یاد میں ان کے لیے کچھ کریں۔ ان کے نام سے ایک ایوارڈ ہر سال دیا جانا چاہیے۔ پروگرام کی صدارت معروف ادیب ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی اور نظامت کے فرائض معروف رنگ کرمی ونود کمار بے چین نے انجام دیے۔ اس موقع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے معروف ڈراما اداکار وہدایت کار بھارت بھوشن شرما نے کہا کہ کبھی کبھی وقت ایسے لمحے لے کر آتا ہے جس میں کچھ کہنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ سریندر شرما ہمیں چھوڑ کر چلے گئے اور اب ان کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہو رہا ہے۔ سریندر شرما نے ہمیشہ پوری ایمانداری اور لگن کے ساتھ رنگ منچ کو

آگے بڑھایا۔ میرے تمام مقبول اور مشہور ڈراموں میں سریندر شرما میرے ساتھ رہے۔ انھوں نے میرٹھ کا نام پورے ہندستان تک پہنچایا۔ ان کے لیے رنگ منچ صرف رنگ منچ نہیں بلکہ ایک عبادت اور ایک آئینہ کی مانند تھا۔ ہم انھیں دل کی گہرائیوں سے خراج عقیدت پیش کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ خدا انہیں شانتی دے۔

انل شرما نے کہا کہ میں نے ان کے ساتھ بہت سے ڈرامے اسٹیج کیے، وہ ہمیشہ سب کی مدد کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ فن کار کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور اپنا کردار بھی دل سے ادا کرتے تھے۔ لودھی راجپوت نے کہا کہ میں نے ان کے ساتھ بہت کام کیا۔ میں نے بڑے بڑے فن کار دیکھے مگر ان جیسا رنگ کرمی کبھی نہیں دیکھا۔ انھوں نے بڑوں کے ساتھ ساتھ اپنے جونیروں کو بھی بہت کچھ سکھایا۔ اسٹیج پر بڑے بڑے مکالمے بولنے میں وہ مہارت رکھتے تھے۔ نہایت خوش مزاج، خوش ذوق اور سادہ دل انسان تھے۔ ایسے انسان خال خال ہی نظر آتے ہیں۔

روزنامہ ہمارا سماج 17 جنوری 2026

بزم 'ادبی کینوس' کی تشکیل

بارہ بنکی: بارہ بنکی میں اردو زبان وادب کے فروغ کے مقصد سے ''ادبی کینوس'' کے نام سے ایک نئی ادبی بزم تشکیل دی گئی ہے، جس کے تحت ماہانہ طرحی نشستیں،

ادبی محفلوں اور مشاعرے منعقد کیے جائیں گے۔ اسی سلسلے میں اتوار کو معروف شاعر آدرش بارہ بنکوی کی رہائش گاہ پر ایک اہم اجلاس منعقد ہوا، جس میں بزم کی تشکیل کے ساتھ ساتھ عہدیداران کا متفقہ طور پر انتخاب کیا گیا۔ اجلاس میں ڈاکٹر فدا حسین کو بزم کا سرپرست اعلیٰ مقرر کیا گیا، جبکہ وقار بارہ بنکوی کو سرپرست نامزد کیا گیا۔ بزم کی صدارت کے لیے ضیاء الدین احمد (ماڈرن شوز) کا انتخاب عمل میں آیا جبکہ ذکی طارق بارہ بنکوی، کیفی رودولوی اور شمیم انصاری کو نائب صدور مقرر کیا گیا۔ ڈاکٹر ریحان علوی کو جنرل سکریٹری اور آدرش بارہ بنکوی کو سکریٹری کی ذمہ داری سونپی گئی۔ سینئر کوی اشوک کمار سونی کو خزانچی اور سلیم ہمدم ردولوی کو پبلسٹی سکریٹری مقرر کیا گیا۔ اجلاس میں اس بات پر بھی اتفاق کیا گیا کہ بزم کی سرگرمیوں کو مزید موثر بنانے کے لیے آئندہ دنوں میں کمیٹی میں اضافی عہدیداران کی تعیناتی کی جائے گی۔

روزنامہ صحافت، 20 جنوری 2026

اودھی ریسرچ چیئر

لکھنؤ: خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی میں اودھی ریسرچ چیئر کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس کا

بنیادی مقصد اودھی زبان، اس کے ادب اور لوک ثقافت کے تحفظ، فروغ اور تعلیمی ارتقا کو ایک منظم اور موثر سمت دینا تھا۔ میٹنگ کی صدارت یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر اجے تیجا نے کی۔ اس موقع پر انھوں نے اودھی زبان کی تاریخی، ثقافتی اور سماجی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اودھی ہماری تہذیبی وراثت کی ایک طاقتور اور زندہ علامت ہے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ یونیورسٹی جلد ہی اودھی زبان کو ایک مستقل اور باقاعدہ مضمون کے طور پر نصاب میں شامل کرے گی، تاکہ طلبہ وطالبات کو اپنی لوک زبان میں تعلیم اور تحقیق کے بہتر مواقع حاصل ہوسکیں۔ وائس چانسلر نے مزید کہا کہ اودھی زبان کے ذریعے لوک ثقافت، ادب اور سماج کے درمیان گہرے اور مضبوط رشتے کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔ اسی مقصد کے تحت یونیورسٹی اودھی سے متعلق تحقیقی منصوبوں، سمیناروں، ورکشاپس اور دیگر علمی وادبی سرگرمیوں کو خصوصی ترجیح دے گی۔ اجلاس میں اودھی ریسرچ چیئر کے اراکین، پروفیسر سوریہ پرتاپ دکشت، پروفیسر ودیا بندھو سنگھ، ڈاکٹر رام بہادر مشرا اور ڈاکٹر سرویش استھانا نے شرکت کی۔ تمام اراکین نے اودھی زبان کے تحفظ اس کی دستاویز سازی، ادبی تحقیق اور نئی نسل تک اس کے فروغ کے حوالے سے قیمتی تجاویز پیش کیں اور اودھی ادب کو علمی وتحقیقی سطح پر مستحکم کرنے کے لے ٹھوس حکمت عملی وضع کرنے پر زور دیا۔ اس موقع پر اودھی ریسرچ چیئر کے کنوینر ڈاکٹر نیرج شکلا کے ساتھ ڈاکٹر یوگیندر سنگھ، ڈاکٹر آرادھنا استھانا اور ڈاکٹر ہمانشو گنگوار بطور معاون کنوینر موجود رہے۔ اجلاس میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ اودھی زبان اور ثقافت سے متعلق خصوصی کورسز، سرٹیفکیٹ پروگرام، تحقیقی منصوبے اور ثقافتی تقاریب منعقد کی جائیں گی تاکہ طلبہ کو تعلیمی کے ساتھ ساتھ عملی سطح پر بھی فائدہ پہنچایا جاسکے۔

روزنامہ صحافت 20 جنوری 2026

اردو تعلیم کو گھر گھر پہنچانا وقت کی ضرورت

مظفرنگر: مظفرنگر کے گاؤں کلیان پور میں اردو طلبا اور طالبات کا ایک تحریری مقابلہ منعقد ہوا، جس میں دس بہترین طلبا اور طالبات کو قیمتی انعامات سے سرفراز کیا

گیا۔ عالمی یوم اردو منتظمہ کمیٹی، نئی دہلی اور القاضی اردو اکیڈمی کی جانب سے منعقدہ اس تقریب میں مہمان خصوصی کے طور پر سینئر صحافی معصوم مرادآبادی، مہمان ذی وقار کے طور پر ڈاکٹر الیاس مظہر اور سوشل میڈیا کی معروف شخصیت سہیل نمبردار نے شرکت کی۔ تقریب کی صدارت ڈاکٹر سید احمد خاں نے کی۔ انھوں نے کہا کہ 'ہمارا مقصد اردو تعلیم کو عام کرنا ہے اور جو نئی نسل اس سے دور ہوتی جارہی ہے، اس کو اردو تعلیم وتدریس کی اہمیت سے روشناس کرانا ہے۔ ڈاکٹر سید احمد خاں نے مزید کہا کہ مقابلے میں بچیوں نے بڑی کامیابی حاصل کی، یہ خوش آئند ہے۔ اس سے مادری زبان اردو کے فروغ میں بہت مدد ملے گی۔ اس موقع پر معصوم مرادآبادی نے ہونہار اردو طلبا کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا کہ 'جو بچے اردو تعلیم سے آراستہ ہوتے ہیں، ان کے لب ولہجے اور گفتگو میں شائستگی پیدا ہوجاتی ہے اور وہ اپنی تاریخ اور تہذیب سے بھی واقف ہوجاتے ہیں، اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو تعلیم کو گھر گھر پہنچایا جائے اور جو طلبا اور طالبات بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کریں ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔' القاضی اردو اکیڈمی کی چیئر پرسن ایڈوکیٹ شاہ جبیں قاضی نے

اس موقع پر ہونہار طلبا اور طالبات کے لیے بہترین تحفے اور شیلڈ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا بنیادی مقصد اردو پڑھنے والے طلبا اور طالبات کی حوصلہ افزائی کرنا ہے تا کہ اس سے دیگر طلبا بھی تحریک حاصل کریں۔ اس کام کے لیے ان دور دراز قصبوں اور گاؤں کا انتخاب کیا گیا ہے جہاں عام طور پر فلاحی تنظیمیں نہیں پہنچ پاتیں۔

روزنامہ، ہمارا سماج 20 جنوری 2026

ادب میں بسنت

میرٹھ: آج ادب نما کا دوسواں اپی سوڈ ہے۔ یہ موقع کی مناسبت سے بہت ہی عمدہ موضوع ہے۔ آج کے

شرکا کو سن کر پورا لکھنؤ آنکھوں میں گھوم گیا۔ واقعی بسنت میں ہر طرف محبت، پیار اور عقیدت نظر آتی ہے۔ بسنت کا موسم ہمیں ترغیب دیتا ہے کہ خوش رہیے۔ یہ الفاظ تھے معروف محقق و ناقد اور سابق صدر شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی پروفیسر زماں آزردہ کے جو شعبہ اردو اور ایوسا کے مشترکہ اہتمام میں منعقد ’’ ادب میں بسنت‘‘ موضوع پر اپنی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو کی بیشتر اصناف کے ساتھ ساتھ قصائد اور مراثی میں بسنت کا خوب ذکر ملتا ہے۔ بسنت بچوں، جوان لڑکے لڑکیوں کے کھیلنے کا موسم ہوتا ہے۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ناقد و افسانہ نگار اور صدر شعبہ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری، معروف ادیب و ناقد پروفیسر صغیر افراہیم نے فرمائی اور صدارت پروفیسر زماں آزردہ نے کی جبکہ نظامت کے فرائض شعبے کی استاد ڈاکٹر الکا وششٹھ نے انجام دیے۔ اس موقع پر اظہار خیال کرتے ہوئے معروف ادیب و ناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ آج بہت ہی خوشی کا دن ہے۔ آج ادب نما کے دوسواں اپی سوڈ پورے ہو رہے ہیں، جو ہم نے چھوٹا سا پودا لگایا تھا آج وہ تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ آج کا موضوع انوکھا ہے۔ یہ موضوع سماج سے جوڑنے کا کام کرتا ہے۔ بسنت میں ہر چیز کھلنے لگتی ہے۔ اسے نہ صرف ہندی بلکہ اردو ادب میں بھی بڑی خوبصورتی اور دلکشی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ بسنت میں ہماری خوشی دوبالا ہو جاتی ہے۔ اردو شاعری نے نسل در نسل بسنت کو خوب شدت کے ساتھ پیش کیا ہے اور بسنت کا رشتہ صوفی روایات سے بھی ملتا ہے۔ امیر خسرو کے یہاں یہ بسنتی رنگ خوب زور و شور سے ملتا ہے۔

روزنامہ ہمارا سماج 23 جنوری 2026

تاریخ نویسی پر بین الاقوامی سمینار

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ نے ’’تاریخ نویسی: طریق ہائے کار، نقطہ ہائے نظر اور عصر

حاضر کے مباحث‘‘ موضوع پر بین الاقوامی سمینار کا اہتمام کیا، جس میں مورخین و محققین نے تاریخ نویسی کے بدلتے ہوئے طریقوں اور اہم تنقیدی مسائل پر غور و خوض کیا۔ افتتاحی اجلاس میں شرکا کا خیر مقدم کرتے ہوئے شعبہ تاریخ کے چیئرپرسن پروفیسر حسن امام نے فاؤنڈرز ڈے تقاریب کے تناظر میں سمینار کے موضوع کی اہمیت کو اجاگر کیا اور نوآبادیاتی دور سے لے کر اب تک ہندوستان میں تاریخ نویسی کے ارتقا کا ایک جائزہ پیش کیا۔ مہمان اعزازی پروفیسر حامد نسیم رفیع آبادی نے مارکسی تاریخ نویسی پر کلیدی خطبہ دیتے ہوئے اس کے فلسفیانہ پس منظر اور بنیادی تصورات جیسے طبقاتی جدوجہد اور تصادم پر گفتگو کی۔ انھوں نے ہیگل اور مارکس کے افکار میں مماثلت اور فرق کا تجزیہ کیا اور مغربی و اسلامی فکری روایت میں مارکسزم پر ہونے والی تنقیدوں پر بھی روشنی ڈالی۔ کلیدی مقرر پروفیسر ایس ایم عزیز الدین حسین نے عہد وسطیٰ کے ہندوستان کے مطالعے میں شعبہ تاریخ کی نمایاں خدمات کو سراہا۔ انھوں نے اے ایم یو کے مورخین کی جانب سے تاریخی بیانیوں کو ان کی اصل صورت میں محفوظ رکھنے کی کاوشوں کی تعریف کی، برطانوی تاریخ نگاری کے طریقوں اور ہندوستانی عہد وسطیٰ کی تاریخ پر ان کے اثرات کا تنقیدی جائزہ لیا اور اس موضوع پر اہم غیر ملکی علمی کاموں کا حوالہ دیا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر علی اطہر نے معاصر تاریخ نگاری کے مباحث مثلاً ٹرانس نیشنل ہسٹری، ڈیٹا جمع کرنے کے نئے رجحانات، محرکات پر مبنی تاریخ نویسی اور ڈیجیٹل تاریخ نویسی کی بڑھتی ہوئی اہمیت پر گفتگو کی۔ انھوں نے ’’ایلینز‘‘ کے تصور اور سرسوتی تہذیب جیسے موضوعات پر بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ اس موقع پر علی گڑھ یونیورسٹی ہسٹری کلب کے مجلّہ ’’تاریخ نامہ‘‘ کی رسم اجرا بھی عمل میں آئی۔ کلب کے جنرل سکریٹری نے چیئرپرسن اور ادارتی ٹیم کا شکریہ ادا کیا۔ آخر میں سمینار کنوینر ڈاکٹر انیسہ اقبال صابر نے شکریہ کے کلمات ادا کیے۔

روزنامہ ’ہمارا سماج‘ دہلی، 4 فروری 2026

ترقی پسند تحریک پر گفتگو

میرٹھ: 1932 میں ’’انگارے‘‘ کی اشاعت کے بعد سے ترقی پسند تحریک کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس تحریک کے

روح رواں سجاد ظہیر اور ان کے ساتھی تھے۔ 1936 کے اجلاس میں پریم چند نے بھی شرکت کی تھی۔ آج آپ ڈیجیٹل دور میں لکھ رہے ہیں اور مقصد بنا کر لکھ رہے ہیں تو آپ بامقصد اور سماج کی بہتری کے لیے لکھ رہے ہیں تو آپ ترقی پسند مانے جائیں گے۔ یہ الفاظ تھے معروف ناقد و شاعر امیر مہدی (انگلینڈ) کے جو آیوسا اور شعبہ اردو کے زیر اہتمام منعقد ’ترقی پسند تحریک پر ایک گفتگو‘ موضوع پر اپنی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ اس دوران مختلف سوالوں کے جواب میں انھوں نے کہا کہ

اگر آپ ترقی پسند مانے جائیں گے۔ یہ تحریک اشتراکیت سے جڑی یہ سچ ہے۔ جب تک یہ دنیا رہے گی ترقی پسندی برقرار رہے گی۔ ترقی پسند تحریک کا مقصد یہ تھا کہ کوئی کسی کا غلام نہ رہے اور کسی کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔ دوسرے ادب اور تحریک میں وہ اثر نہیں ہے جو ترقی پسند تحریک میں ہے۔ جو چیزیں ترقی کے لیے لکھی جائیں گی وہ رہ جائیں گی لیکن جن کا تعلق ترقی پسندی سے نہیں ہوگا وہ ختم ہو جائیں گی۔ ہمارے معاشرے پر جتنا اثر ترقی پسند تحریک نے ڈالا اتنا کسی اور تحریک نے نہیں ڈالا۔ اگر ہمارے کاموں میں حسن نہیں ہے اور ہم اپنے مقصد کو سامنے رکھ کر کام نہیں کر رہے ہیں تو ہم ترقی پسند نہیں ہو سکتے مگر جو وقت کی ضرورت کے مطابق کام کر رہے ہیں اور ترقی کر رہے ہیں، ضرورت کے مطابق کام کر رہے ہیں اور ترقی کر رہے ہیں، ضرورتوں کو پورا کر رہے ہیں تو ہم ترقی پسندوں میں شامل ہوں گے۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ناقد وافسانہ نگار اور صدر شعبہ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی اور صدارت معروف ادیب وناقد پروفیسر صغیر افراہیم نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر معروف ناقد وشاعر امیر مہدی (انگلینڈ) نے شرکت فرمائی۔ لکھنؤ سے ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین موجود رہیں۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے انجام دیے۔

روزنامہ ہمارا سماج، دہلی، 3 فروری 2026

تمل فکشن پر ادبی مذاکرہ

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ جدید ہندستانی السنہ کے تمل سیکشن نے ساہتیہ اکادمی کے

تعاون سے ''تمل فکشن: سرحدوں سے ماورا'' کے عنوان پر ایک ادبی مذاکرے کا اہتمام کیا۔ پروگرام کا آغاز اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر آر تمل سیلون کے استقبالیہ خطاب سے ہوا، جنھوں نے بین ثقافتی ادبی مکالمے کو فروغ دینے میں ترجمے کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ اس موقع پر تمل کے افسانوی ادب کے ان تراجم پر تفصیلی گفتگو ہوئی جو چینی، مراٹھی، ہندی اور پنجابی میں کیے گئے ہیں، نیز ان زبانوں کے اہم افسانوی ادب کے تمل میں ہونے والے تراجم پر بھی روشنی ڈالی گئی۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر زویتری سیلوی اے اور ایلا کیہ وی آر، اور اے ایم یو کے ورون کمار جی اور شیہار یتھا ایم نے لیکچرز دیے۔ تمل سے دیگر زبانوں میں ہونے والے تراجم کے سالانہ شماریاتی تجزیے پیش کیے۔ ترجمے کے طریقہ کار کا جائزہ لیا، مترجمین کے کردار پر بحث کی اور تمل فکشن کے ان اہم ادبی تخلیقات کی نشاندہی کی جو ترجمے کی مستحق ہیں۔ اپنے صدارتی خطاب میں شعبہ جدید ہندوستانی السنہ کے چیئرپرسن پروفیسر نجم اے نے کہا کہ کثیر لسانی ملک ہندوستان میں ترجمہ نہایت اہم ہے اور اسے فروغ دیا جانا چاہیے۔ انھوں نے تمل فکشن میں بڑھتی ہوئی عالمی دلچسپی کا ذکر کرتے ہوئے ساہتیہ اکادمی کے ساتھ تمل سیکشن کے اشتراک کو سراہا اور کہا کہ اس طرح کی سرگرمیاں ترجمہ جاتی مطالعات کو نئی بلندیوں تک لے جائیں گی۔ تمل سیکشن کے انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ طلبہ کے علاوہ بنگالی، ملیالم، مراٹھی، پنجابی اور تمل پس منظر سے تعلق رکھنے والے پی ایچ ڈی اسکالرز نے پروگرام میں شرکت کی۔ آخر میں تمل کے ریسرچ اسکالر وگنیش ایس نے کلمات تشکر ادا کیے۔

روزنامہ ہمارا سماج، دہلی، 3 فروری 2026

ساحر لدھیانوی

میرٹھ: ساحر لدھیانوی کی شاعری کو مختلف رسائل نے ساحر نمبر کے نام سے پیش کیا۔ تخلیق کار کو خانوں میں قید نہیں کرنا چاہیے۔ ساحر نے شاعری کو عزت و وقعت دی ہے۔ فلم انڈسٹری کو بھی انھوں نے وقار عطا کیا ہے۔

دیگر ترقی پسند شعرا کی بہ نسبت ساحر نے شاعری اس طور پیش کی جس میں عورت، مرد، سماج، فلم سیاست، تاریخ وغیرہ موضوعات پر بہترین شاعری ملتی ہے۔ یہ الفاظ تھے معروف محقق وناقد ڈاکٹر تقی عابدی کے جو آیوسا اور شعبہ اردو کے زیر اہتمام منعقد ''ساحر لدھیانوی کی شاعری'' موضوع پر اپنی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ساحر لدھیانوی امید کا شاعر ہے۔ پروگرام کی سرپرستی معروف ناقد وافسانہ نگار اور صدر شعبہ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری اور بین الاقوامی شہرت یافتہ محقق وناقد ڈاکٹر تقی عابدی نے فرمائی اور صدارت پروفیسر فاروق بخشی، وسیم فرحت علیگ نے کی۔ مقالہ نگار کے بطور لکھنؤ یونیورسٹی سے محمد سہیل شریک ہوئے جبکہ مقرر کے بطور لکھنؤ سے ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین موجود رہیں۔ نظامت کے فرائض شعبے کی ریسرچ اسکالر سرتاج جہاں اور شکریے کی رسم ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے انجام دی۔ اس موقع پر معروف ادیب وناقد پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ ساحر لدھیانوی نے اپنی نظموں اور غزلوں کے ذریعے بہت سی ایسی چیزیں پیش کیں جو ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔ ساحر لدھیانوی نے اپنی شاعری کا معیار دوسروں سے مختلف رکھا۔ فلموں میں بھی انھوں نے خاصی مقبولیت پائی۔ آج کے دور میں بھی ان کی شاعری دیگر شعرا سے منفرد نظر آتی ہے۔ پروفیسر سید محمود کاظمی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں نے ساحر لدھیانوی کو دیکھا ہے۔ ساحر پر بہت سے سمینار بھی ہوئے جو کامیاب رہے۔ ان کی نظم ''تاج محل'' بڑی اہم ہے جو کافی مقبول ہوئی۔ ساحر کی شاعری کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم فلسفہ جمال سے بھی واقف ہوں۔ نظم تاج محل ہر لحاظ سے فنی جوہر کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ پروفیسر فاروق بخشی نے کہا کہ 1980 کے بعد جو نسل زبان وادب کے راستے پر چلی وہ دو راستوں پر چلی۔ ایک ترقی پسندی کی راہ اور دوسری جدیدیت کی طرف مگر ساحر لدھیانوی ایسا شاعر ہے جس کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ان کی کتابوں کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ تاج محل کے نام سے کئی نظمیں لکھی گئیں مگر ساحر کی نظم سب سے الگ ہے۔ وسیم فرحت علیگ نے کہا کہ سنیما کی شاعری ہو یا سماجی شاعری ہو ساحر لدھیانوی نے دونوں طرح کی شاعری کی ہے۔ تاج محل پر جب ساحر نے نظم لکھی وہ تاج محل کو دیکھے بغیر لکھی۔ ساحر نے اپنی نظموں اور غزلوں سے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ آج بھی ان کی شاعری کو عوام میں مقبولیت حاصل ہے۔ اپنے صدارتی خطبے

میں پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ ساحر لدھیانوی نے اپنی نظم "تاج محل" کے ذریعے ایک نیا رجحان ایک نیا طریقہ دیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 5 فروری 2026

تلنگانہ

علامہ شبلی نعمانی، مہاراجہ سرکشن پرشاد، ڈاکٹر محمد حمید اللہ

حیدرآباد: شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ اور شعبۂ اردو گورنمنٹ سٹی ڈگری کالج حیدرآباد کے زیر اہتمام دوروزہ عالمی سمینار بعنوان 'علامہ شبلی نعمانی، مہاراجہ

سرکشن پرشاد، ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی فکری جہات'' منعقد ہوا۔ جس کی صدارت ڈاکٹر شانتی نے کی اور بحیثیت سرپرست پروفیسر مظفر علی شہ میری شامل ہوئے۔ پروفیسر مظفر علی شہ میری نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہ سمینار عالم اسلام کی مستند شخصیت ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی ان فکروں کو وا کرے گا جو اسلامی تحقیق کے باب میں اہمیت کے حامل ہیں۔ پروفیسر محمد محمود صدیقی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ علامہ شبلی نے صرف 57 برسوں میں وہ علمی اور ادبی کارنامے انجام دیے جو ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ جامع الصفات تھے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد علم دوست اور رواداری کے علمبردار رہے۔ مہمان خصوصی پروفیسر سید عین الحسن نے اپنے خطاب میں کہا کہ شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ کو میں گلوبل ٹرسٹ دیکھنا چاہتا ہوں۔ اب تک شبلی ٹرسٹ کی خدمات لائق تحسین ہیں۔ سٹی کالج حیدرآباد اردو کا علمی اور ادبی اثاثہ ہے جس نے بہت سے علما، مفکرین اور دانشوران پیدا کیے جن کے نقوش ملک اور بیرون ملک میں پائے جاتے ہیں۔ پروفیسر محمد محمود صدیقی، پروفیسر سید راشد ندیم ندوی اور مولانا غیاث احمد رشادی کو ان کی علمی، ادبی اور سماجی خدمات پر شبلی ایوارڈ 2026 ٹرسٹ کی جانب سے پیش کیا گیا۔ سمینار کے ڈائرکٹر مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی نے نظامت کی۔ کنوینر صدر شعبۂ اردو سٹی کالج ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ 20 جنوری کو گوگل میٹ پر آن لائن اکیڈمک سیشن منعقد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر عبدالقدوس نے انجام دیے۔ اس سیشن میں ملک و بیرون ملک کے ماہرین نے شرکت کی۔ 21 جنوری کو مقالے کے سیشن کا آغاز ہوا، جس کی سرپرستی پروفیسر مظفر علی شہ میری نے کی اور صدارت ڈاکٹر محمد ناظم علی نے۔ نظامت ڈاکٹر سمیہ تمکین نے کی اور اظہار تشکر ڈاکٹر بشیر النساء نے پیش کیا۔ اس میں 20 مقالات پیش کیے گئے۔ تیسرے سیشن کی صدارت پروفیسر مظفر علی شہ میری نے کی۔ اس سیشن میں 16 مقالہ نگاروں نے شرکت کی۔ اخیر میں سمینار کمیٹی نے یہ طے کیا کہ تمام مقالے فکری جہات کے نام سے کتابی شکل میں پیش کیے جائیں۔ سمینار کمیٹی نے تمام معاونین، حاضرین، کارکنان، سٹی کالج کے اساتذہ، طلبا و طالبات اور عملہ کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 30 جنوری 2026

دوروزہ قومی سمینار

حیدرآباد: اچھے اور ذمہ دار شہری بنانے میں ادیب اطفال نمایاں کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اکیسویں صدی کے بدلتے ہوئے سماجی اور تکنیکی حالات نے بچوں کے ادب کے سامنے نئے مسائل اور امکانات پیدا کیے ہیں جن پر سنجیدہ غور و فکر کی ضرورت ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر سید عین الحسن، وائس چانسلر نے کیا۔ وہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبہ اردو اور مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم اور ثقافتی سرگرمی مرکز کے اشتراک سے دوروزہ قومی سمینار سے صدارتی خطاب کر رہے تھے۔ سمینار کا عنوان 'اکیسویں صدی میں بچوں کا ادب: مسائل و امکانات' تھا۔ پروفیسر عین الحسن نے اردو میں بچوں کے ادب کے شاندار ماضی کے ساتھ ساتھ موجودہ صورتحال سے بھی واقف کرایا۔ انھوں نے کہا کہ آج کا بچہ پرانی نسل سے زیادہ ذہین ہے اور اس کے لیے لکھتے وقت تخلیق کار کو بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ آج کے ڈیجیٹل دور میں بچوں کی پسند و ناپسند کا خیال رکھتے ہوئے اس انداز میں لکھنے کی ضرورت ہے کہ بچے موبائل اور دیگر جدید آلات کے بجائے مطالعہ کتب کی طرف راغب ہو سکیں۔ مہمان خصوصی معروف شاعر اور ادیب اطفال جناب حافظ کرناٹکی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ بچوں کا ادب تخلیق کرنا شوق نہیں ذمہ داری ہے۔ انھوں نے بچوں کے ادب کو محض تفریح کے بجائے کردار سازی اور فکری تربیت کا موثر ذریعہ قرار دیا۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے ممتاز فکشن نگار محترمہ ذکیہ مشہدی نے ادب اطفال کی تخلیق کے دوران بچوں کی نفسیات اور ان کی عمر و ذہنی سطح کا لحاظ رکھنے کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ بچوں کا ادب نئی نسل کی فکری، اخلاقی اور تہذیبی تربیت میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ استقبالیہ کلمات پروفیسر گلفشاں حبیب ڈین اسکول برائے السنہ لسانیات و ہندوستانیات نے ادا کیے اور موضوع کا تعارف صدر شعبہ اردو پروفیسر مسرت جہاں نے پیش کیا۔ پروگرام کی نظامت پروفیسر فیروز عالم شعبہ اردو نے انجام دی جبکہ اختتامی کلمات پروفیسر محمد رضاء اللہ خان ڈائرکٹر سی ڈی او ای مانو نے پیش کیے۔

افتتاحی پروگرام کے بعد دوروزہ سمینار کا پہلا اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت پروفیسر امتیاز حسنین اور پروفیسر محمد نسیم الدین فریس نے کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر محمد کاظم شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی، پروفیسر سید محمود کاظمی شعبہ ترجمہ مانو، پروفیسر محمد زاہد الحق شعبہ اردو حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی، ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی کرناٹک، ڈاکٹر احسن ایوبی، شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور محمد شہاب الدین ریسرچ اسکالر مانو نے مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت محترمہ حنا گلاب استاد شعبہ اردو مانو نے کی۔ سمینار کا دوسرا اجلاس پروفیسر سید علیم اشرف جائسی اور پروفیسر صدیقی محمد محمود کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں پروفیسر ادریس صدیقی کینیڈا، پروفیسر نثار احمد، ڈاکٹر آفتاب عالم نجمی، ڈاکٹر شہناز رحمن، ریسرچ اسکالرز مرجان علی، محمد محتشم اور تبسم کوثر نے مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر بدر سلطانہ استاد شعبہ اردو مانو نے کی۔ تیسرا اجلاس پروفیسر محمد کاظم اور پروفیسر شمس الہدیٰ دریابادی کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں پروفیسر عرشیہ جبیں، پروفیسر مشرف علی، جناب مرزا عبدالقیوم ندوی، ڈاکٹر صابر علی سیوانی، ڈاکٹر خواجہ مخدوم محی الدین کے علاوہ ریسرچ اسکالرز اسما امروز اور واصفہ عشرت نے بھی مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت پروفیسر احمد خاں، استاذ شعبہ اردو نے کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 30 جنوری 2026

بھارتیہ بھاشا سمیتی

حیدرآباد: نصابی کتابوں کی تیاری میں معیار کو ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ بھارتیہ بھاشا سمیتی (بی بی ایس) کے تحت مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو اعلیٰ تعلیم کی درسی کتب

کی تیاری کی جو ذمہ داری تفویض کی گئی ہے وہ اسے بخوبی نبھا رہی ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر بی جے راؤ، وائس چانسلر، یونیورسٹی آف حیدرآباد نے آج اردو مصنفین کے دوروزہ ورکشاپ کے اختتامی اجلاس میں کیا۔ پروفیسر سید عین الحسن، شیخ الجامعہ، مانو نے صدارت کی۔ پروفیسر بی جے راؤ نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے مصنفین کو مشورہ دیا کہ قابل مطالعہ کتابیں ہی تحریر کریں۔ پروفیسر این ناگاراجو، وائس چانسلر ایفلو نے اپنی تقریر میں بی بی ایس کے حوالے سے مانو کی پہل کو قابل تقلید قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں تمام ہندستانی زبانوں کے درمیان رابطہ قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ زبانیں ایک دوسرے کو متمول کرتی ہیں تاکہ ہمارے درمیان بھائی چارہ فروغ پائے۔ پروفیسر سید عین الحسن نے ورکشاپ کے شرکا کو تلقین کی کہ کتابوں کی تیاری میں تمام تر احتیاط اور معیار کو ملحوظ رکھیں۔

روزنامہ ہمارا سماج، دہلی، 12 فروری 2026

بہار

رضا نقوی واہی

بھاگلپور: انجمن باغ وبہار، برہ پورہ، بھاگلپور کے زیر اہتمام جوڑایاغ کی صدارت میں رضا نقوی واہی کے یوم پیدائش پر ادبی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقع پر انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر محمد پرویز نے

کہا کہ رضا نقوی واہی ہندو پاک کے ایک مشہور مزاحیہ شاعر تھے۔ ان کی شاعری کی بنیادی اور فکری اساس ان اصلاحی، اخلاقی اور تعمیری پہلوؤں پر ہے جو ہمارے سماج کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری سے زندگی کے ہر پہلو پر تنقید کی، زندگی کا شاید ہی ایسا گوشہ ہو جو ان کے طنز و مزاح کے نشتر سے محفوظ رہا ہو۔ ان کا اصل نام سید محمد رضا نقوی، تخلص رضا نقوی تھا۔ 17 جنوری 1914 کو کھجوا، سیوان، بہار میں پیدا ہوئے اور وفات جنوری 1962 میں ہوئی۔ انھوں نے میٹرک 1930 میں کیا۔ انٹرمیڈیٹ 1932 میں پٹنہ سے کیا۔ 1937 میں بہار لیجس لیٹو اسمبلی میں نوکری کی پھر ترقی پاکر بہار کونسل سکریٹریٹ میں اسسٹنٹ سکریٹری کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ 1928 میں انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔ ان کی تصانیف میں واہیات، طنز و تبسم، نشتر و مرہم، کلام نرم و نازک، نام بہ نام، متاع واہی، شعرستان واہی، منظومات واہی، چٹ پٹی نظمیں (ہندی) وغیرہ اہم ہیں۔ انھیں کئی ایوارڈ بھی ملے جن میں بہار اردو اکادمی ایوارڈ، غالب ایوارڈ، مولانا مظہر الحق شکھر سمان، اتر پردیش اکادمی ایوارڈ اہم ہیں۔ اس موقع پر جوڑایاغ نے کہا کہ انھوں نے اپنی ظریفانہ شاعری میں اردو کے ساتھ انگریزی الفاظ اس طرح پیوست کیا ہے کہ شاعری میں ایک نیا لطف پیدا ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر نیر حسن نے کہا کہ ان کی نظموں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے ان کے اندر فکر و فن کی بلندیاں اپنی پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ موجود ہیں۔ نشست میں دیگر ماہرین نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ ہمارا سماج، 18 جنوری 2026

فروغ اردو ورکشاپ

بہار شریف: ضلع ہیڈ کوارٹر بہار شریف کے ٹاؤن ہال میں ایک عظیم الشان ضلعی سطح کی ''فروغ اردو'' ورکشاپ،

سمینار اور مشاعرہ منعقد ہوا۔ پروگرام کا افتتاح ضلع مجسٹریٹ کندن کمار اور ایس ایم پرویز عالم، ڈائرکٹر، اردو ڈائرکٹوریٹ، کابینہ سکریٹریٹ محکمہ، حکومت بہار (پٹنہ)، مشترکہ طور پر شمع روشن کر کیا۔ پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے ضلع مجسٹریٹ کندن کمار نے کہا کہ اردو کو بہار میں دوسری حکومتی زبان کا درجہ حاصل ہے جو اس کی تاریخی، ثقافتی اور ادبی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان نے ملک اور ریاست کی مشترکہ ثقافت کے تحفظ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اردو صرف ایک زبان نہیں ہے بلکہ بھائی چارے، ہم آہنگی اور ادبی ورثے کی علامت ہے۔ ضلع انتظامیہ اردو کے فروغ کے لیے ہمیشہ تعاون کرے گی۔ اس موقع پر ڈائرکٹر ایس ایم پرویز عالم نے کہا کہ حکومت بہار اردو زبان کی ترقی کے لیے پوری طرح پرعزم ہے۔ حکومت کی طرف سے اردو کی تعلیم، ادب، تحقیق اور ثقافتی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لیے مختلف اسکیمیں چلائی جارہی ہیں، تاکہ نئی نسل اردو زبان سے منسلک ہو سکے۔ انھوں نے بتایا کہ مارچ میں تقریباً 850 افراد کو بحال کیا گیا، جبکہ تقریباً 200 آسامیوں کے لیے تجاویز کابینہ اور ایس ایس سی کو بھیجی گئی ہیں اور یہ عمل جاری ہے۔ انھوں نے کہا کہ ریاست کے تمام اضلاع میں سالانہ دو اردو پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں۔ COVID-19 کے دوران اردو سرگرمیاں بری طرح متاثر ہوئیں، لیکن نقصانات کی تلافی کے لیے مسلسل کوششیں کی جارہی ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اب اردو سے متعلق مسائل پر ضلعی سطح پر باقاعدہ میٹنگیں منعقد کی جارہی ہیں۔ اور یہ کہ غیر اردو عہدیداروں کو بھی اردو کے پروگراموں میں شامل کیا جارہا ہے تاکہ اردو کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جاسکے۔ اس پروگرام میں اردو کے ادیبوں، شاعروں، اساتذہ، طلبہ اور زبان سے محبت کرنے والے شہریوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔

روزنامہ ہمارا سماج، دہلی، 1 فروری 2026

پروفیسر لطف الرحمٰن کی یاد میں نشست

بھاگلپور: انجمن باغ وبہار برہ پورہ، بھاگلپور کے زیر اہتمام نوشین جہاں کی رہائش گاہ پر جوڑایاغ کی صدارت میں لطف الرحمٰن کے یوم پیدائش پر ایک ادبی نشست منعقد کی گئی۔ اس موقع پر انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر محمد پرویز نے پروفیسر لطف الرحمٰن کے حیات وفن کی

روشنی میں کہا کہ جدید اردو ادب کی تاریخ میں پروفیسر لطف الرحمٰن عالمی سطح کے شہرت یافتہ اردو کے ادیب تھے۔ وہ بیک وقت شاعر، تنقید نگار، محقق، افسانہ نگار، مدیر، تبصرہ نگار، ترجمہ نگار، مقبول استاد اور کامیاب سیاست داں تھے۔ میں ان سے کئی بار ملا تھا، وہ باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری اور تنقید کے ذریعے دونوں اصناف میں قابل قدر اضافہ کیا۔ ان کا اصل نام محمد لطف الرحمٰن اور قلمی نام شہاب شمسی جو بعد میں لطف الرحمٰن ہو گئے۔ 2 فروری 1941 ریوڑھا ضلع دربھنگہ بہار میں پیدا ہوئے تھے اور وفات 31 اگست 2013 بھاگلپور میں ہوئی۔ انھوں نے 1961 میں ملت کالج دربھنگہ سے بی۔ اے، 1963 میں ایم۔اے اردو اور 1964 میں پٹنہ یونیورسٹی سے فارسی میں ایم۔اے کیا۔ 1971 میں اختر اورینوی کے مشورے سے پروفیسر مطیع الرحمٰن کی نگرانی میں پی۔ایچ۔ڈی کی اور تحقیق کا موضوع راسخ عظیم آبادی کی غزل گوئی تھا۔ 1966 میں ٹی۔این۔بی۔کالج بھاگلپور میں لیکچرر ہوئے، جنوری 2001 میں صدر شعبہ اردو ہو کر سبکدوش ہوئے۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز نظم سے کیا۔ ان کی کتابوں میں تازگی برگ نوا، بوسہ نم، دشت میں خیمہ گل، صنم آشنا، راگ براگ، جدیدیت کی جمالیات، نثر کی شعریات، تنقیدی مکالمے، تعبیر و تقدیر، تنقید و تخلیق اور فنون لطیفہ وغیرہ خاص ہیں۔ انھیں کئی ایوارڈ بھی ملے جس میں فخر الدین علی احمد غالب ایوارڈ شامل ہے۔ وہ روزنامہ سنگم، قومی تنظیم، ساغر نو سے بھی جڑے تھے۔ اس موقع پر جوشر ایاغ نے کہا کہ پروفیسر لطف الرحمٰن کے ساتھ میں کئی مشاعرے میں شریک رہا، وہ ایک خوش فکر شاعر تھے اور اپنے مجموعہ کلام تازگی برگ نوا کی وجہ سے ادبی حلقوں میں کافی مشہور ہوئے۔ ڈاکٹر سید نیر حسن نے کہا کہ لطف الرحمٰن تنقید نگاری میں اپنی منفرد شناخت رکھتے تھے۔ نشست میں کئی ماہرین نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 4 فروری 2026

اساتذہ کی تربیت کا مقصد بچوں میں معیاری تعلیم کا فروغ

ویشالی: معروف استاد شمیم احمد نے تربیت پانے والے اساتذہ کرام سے کہا کہ گورنمنٹ اساتذہ کرام

کو بار بار تربیت دینے کا مقصد ایک ہے وہ یہ کہ اساتذہ کرام معیاری تعلیم بچوں میں منتقل کر سکیں اس لیے کہ کسی بھی ملک کو ترقی یافتہ ہونے کے لیے وہاں کے ہر شہری کو تعلیم یافتہ کرنا اہم ضرورت ہے وہیں معروف ٹیچر دیویش کمار نے کہا کہ کوئی بھی تربیت اساتذہ کو سیکھنے کے نئے تجربات کی طرف لے جاتی ہے اور تربیت حاصل کرنے والوں کو محکمہ تعلیم میں نئی ٹیکنالوجیز اور بدلتے ہوئے منظرناموں سے بھی روشناس کرایا جاتا ہے۔ پروفیسر عبدالغفار نے کہا کہ کسی بھی شعبے میں تربیت کا مقصد نئے پہلوؤں کو تلاش کرنا اور نتائج حاصل کرنا ہوتا ہے تاکہ تربیت حاصل کرنے والے اس مضمون میں مزید پختہ ہو سکیں۔ جیوتی کماری نے کہا کہ تربیت میں نئے ابواب شامل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس مضمون کو کیسے پڑھایا جائے، طلبا کی اخلاقی اور روزمرہ کی زندگی میں اس کے فوائد نظر آئیں۔ پروفیسر شمیم احمد نے بتایا کہ شعبہ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے بار بار ٹریننگ کا انعقاد کرتا ہے کہ اساتذہ کو سیکھنے کے بارے میں علمی تربیت، ٹھوس سے غیر محسوس کی طرف منتقلی اور سیکھنے کے نتائج کو یقینی بنایا جائے، اور وہاں سے بنیادی تعلیم سے طلبہ کی زندگیوں کو روشن کر سکیں۔ لیکچرار سنجیت کمار نے کہا کہ ہمارا ملک دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے، اور خواندگی کی شرح بہت کم ہے۔ تمام اساتذہ معلم ہیں۔ معیاری تعلیم فراہم کرنے میں وہ جتنا زیادہ پختہ ہوں گے، بچوں کو اتنی ہی معیاری تعلیم دیں گے۔ تعلیم کے چوتھے ستون کو مضبوط کرنے سے ریاستی اور مرکزی حکومتوں کی خواہشات پوری ہوں گی۔ واضح رہے کہ مظفر پور کے پوکھریرا میں پانچ روزہ رہائشی اساتذہ کی تربیت کے الوداعی دن لیکچررز نے مذکورہ بالا تمام نکات اساتذہ کو پیش کیے۔ اس تربیت میں تقریباً 300 مرد و خواتین نے حصہ لیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 4 فروری 2026

مہاراشٹر

ممبئی میں جشن اردو

ممبئی: اردو زبان و ادب کی ترویج، ثقافتی ورثے کے تحفظ اور صحافتی شعور کی بیداری کے عزم کے ساتھ ممبئی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں منعقدہ سہ روزہ جشن اردو اپنی فکری، ادبی اور ثقافتی ہمہ گیری کے باعث اہل زبان کے لیے ایک یادگار اور تاریخی موقع ثابت ہوا۔ اردو چینل اور روٹس آف کائنڈنس فاؤنڈیشن کے اشتراک سے یونیورسٹی کیمپس کے فیروز شاہ مہتا ہال میں منعقد اس شاندار جشن میں جہاں معیاری ادبی و ثقافتی پروگرام پیش کیے گئے، وہیں کل ہند سطح کے مشاعروں نے محبان اردو کے دلوں کو مسحور کر دیا۔ اس سہ روزہ جشن کے دوران اردو صحافت، ادب، شاعری اور ثقافت کے مختلف پہلوؤں پر سنجیدہ اور بامقصد سرگرمیوں کا انعقاد ہوا۔ خصوصاً 'صحافت اور نئے چیلنجز' کے موضوع پر منعقدہ مذاکرہ فکری اعتبار سے نہایت اہم اور بروقت ثابت ہوا، جس میں عصری صحافت کو درپیش مسائل پر کھل کر گفتگو کی گئی۔ اس مذاکرے میں سینئر صحافی جاوید جمال الدین، ٹائمز آف انڈیا کے سینئر مدیر محمد وجیہہ الدین شاہد، اردو چینل کے مدیر ڈاکٹر قمر صدیقی اور انیس صدیقی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا، جبکہ ناسک یونیورسٹی کے راشد اشرف خان نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ مذاکرے کے دوران مقررین نے سوشل میڈیا کے بے قابو اثرات، بریکنگ نیوز کی غیر ذمہ دارانہ دوڑ، کارپوریٹ دباؤ، صحافتی اقدار کے زوال اور صحافیوں میں بڑھتی ہوئی بے روزگاری جیسے سنگین مسائل پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ مقررین کا کہنا تھا کہ ڈیجیٹل میڈیا نے جہاں اظہار کے نئے مواقع فراہم کیے ہیں، وہیں صحافت کی ساکھ اور سنجیدگی کے لیے خطرات بھی پیدا کیے ہیں، جن سے نمٹنے کے لیے تربیت یافتہ اور ذمہ دار صحافت کی

اشد ضرورت ہے۔ جشن اردو کی ایک اہم کڑی کل ہند مشاعرہ رہی جس میں ملک کے ممتاز اور کہنہ مشق شعرا نے شرکت کر کے اپنے منتخب اور معیاری کلام سے سامعین کو دیر تک محظوظ کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 4 فروری 2026

مالیگاؤں فیسٹیول

مہاراشٹر: مالیگاؤں میں دس روزہ فیسٹیول کے اختتامی اجلاس میں بحیثیت مہمان خصوصی لمرا ریمیڈیز کے مینجنگ ڈائرکٹر محمد جلیس نے اظہار خیال کرتے

ہوئے کہا کہ ایسے پلیٹ فارم نوجوان نسل کی شخصیت سازی وخوداعتمادی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ انھوں نے مسرت آمیز لہجہ میں کہا کہ مالیگاؤں کے سابق ایم ایل اے اور مالیگاؤں فیسٹیول کے روح رواں آصف شیخ رشید کی کاوشوں کا ہی نتیجہ ہے کہ مسلسل چھ برس سے تعلیمی، ادبی وثقافتی اور تجارتی اداروں کے لیے تقریبات کا انعقاد کیا جارہا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ فیسٹیول کے ذریعے عوام الناس میں بھائی چارے باہمی احترام اور سماجی ہم آہنگی کا پیغام دیا گیا۔ واضح رہے کہ دس روزہ فیسٹیول میں تعلیم، ثقافت، صحت اور تجارت جیسے شعبہ ہائے زندگی کے اہم ترین عناصر کے یکجا ہونے سے مالیگاؤں شہر کو مشترکہ تعاون، بھائی چارے، مثبت سوچ، اجتماعی ہم آہنگی کے ساتھ معاشی طور پر ترقی حاصل ہوئی۔ فیسٹیول میں خصوصی طور پر نئی نسل کے لیے تقریبات منعقد کرنے کے بعوض طلبہ وطالبات کی حوصلہ افزائی کے لیے رنگا رنگ پروگرام شامل کیے گئے۔ اسکول کے بچوں نے ملی نغمہ، تقاریر، ڈرامہ، گروپ ڈانس، پینٹنگ، سبق آموز اسکیٹ پیش کیے۔ بچوں کی اہلیت سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مالیگاؤں کا تعلیمی ماحول نہ صرف متحرک ہے بلکہ طلبا وطالبات میں غیر معمولی صلاحیتیں بھی موجود ہیں۔ اس موقع پر مہمان خصوصی نے بچوں کو سند اور مومنٹو بھی تقسیم کیے۔ علاوہ ازیں مالیگاؤں فیسٹیول میلہ میں مختلف شعبہ جات اور اداروں نے شرکت کی۔ میلے میں کتابیں، ذائقہ دار لوازمات، دستکاری، گھریلو ساز وسامان، بجلی کی مصنوعات کے علاوہ آیورویدک ویونانی ادویات کی دھوم مچ گئی۔ تاجروں کو منافع کے ساتھ ہی صارفین کو بھی ایک ہی جگہ سے مختلف اقسام کی مصنوعات مناسب قیمت پر دستیاب ہوگئیں۔ بالخصوص لمرا ریمیڈیز کمپنی کی ادویات کو پذیرائی حاصل ہوئی۔ کثیر تعداد میں شائقین نے شرکت کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 5 فروری 2026

ہریانہ

افسانے کی تخلیق پر پروگرام

نوح، میوات: شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ میں افسانہ نویسی اور اس کی قرات کے موضوع پر ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں شعبہ کے طلبہ نے مختلف

عنوانات پر کہانیاں لکھ کر پیش کیں۔ اس موقع پر معروف فکشن نگار ڈاکٹر رینو بہل نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کرتے ہوئے کہا کہ کہانی لکھنے کے لیے ضروری ہے کہ جو بات جس زبان میں کہی جائے اس زبان کی نوک پلک درست ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی لفظیات پر بھی اچھی گرفت ہونی چاہیے۔ مختلف زبانوں کے الفاظ کہانی کو پھیکا کر دیتے ہیں۔ انھوں نے کہانی میں کہانی پن پیدا کرنے اور خبر نہ بننے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ کہانی با مقصد ہونی چاہیے لیکن وہ مقصد اس کے کردار منظر اور بیانیے میں پوشیدہ ہونا چاہیے۔ واضح ہو کہ تقریب کے آغاز میں صدر شعبہ اردو ڈاکٹر علی عباس نے اپنی تقریر میں مہمان خصوصی ڈاکٹر رینو بہل کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ اس تقریب کا مقصد طلبہ کی تخلیقی صلاحیتوں کو تحرک دینا اور فن قرات سے روشناس کرانا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ پنجاب میں اردو زبان وادب کی راہیں ہموار اور مستقبل روشن ہے۔ اس موقع پر پیش کردہ کہانیوں کی درجہ بندی بھی کی گئی جس میں کاکل سنگھ کی کہانی کو اول مہک دیپ سنگھ کی کہانی کو دوم اور ہوشیار سنگھ چوہان کی کہانی کو سوم قرار دیا گیا۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض خلیق اعوان نے انجام دیے۔

روزنامہ ہمارا سماج 24 جنوری 2026

مصنوئی ذہانت کے 'گاڈ فادر' بھی مستقبل کے اے آئی کو لے کر خوفزدہ

کیلیفورنیا: مصنوعی ذہانت آج انسانوں کی روزمرہ کی ضروریات کو پورا کرنے کا ایک اہم حصہ بنتی جارہی

ہے۔ کئی معاملوں میں لوگ اے آئی کو نہ صرف ایک معاون کے طور پر استعمال کررہے ہیں بلکہ جذباتی طور پر بھی اس پر منحصر ہوگئے ہیں۔ اس صورتحال کو دیکھ کر اے آئی کے 'گاڈ فادر' بھی خوف میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ اے آئی کے گاڈ فادر کہلائے جانے والے کمپیوٹر سائنسداں جیفری ہنٹن نے ایک انٹرویو میں کہا کہ وہ اس ٹیکنالوجی کے حوالے سے شدید فکرمند ہیں اور دنیا اس کے بڑھتے ہوئے خطرات کو سنجیدگی سے نہیں لے رہی ہے۔ ہنٹن نے 'بی بی سی نیوز نائٹ' کو دیے اس انٹرویو میں کہا کہ مستقبل میں اے آئی کی انتہائی خطرناک شکلیں سامنے آئیں گی۔ انھوں نے کہا کہ مجھے بہت دکھ ہوتا ہے کہ میں نے اپنی زندگی اس چیز کو ڈیولپ کرنے میں لگادی اور اب یہ بہت خطرناک ہوگیا ہے اور لوگ اس کے خطرات کو سنجیدگی سے نہیں لے رہے ہیں۔ غور طلب ہے کہ ہنٹن نے ماڈرن آرٹی فیشل انٹیلی جنس کی بنیاد پر نیورل نیٹ ورکس کو بنانے میں مدد کی تھی۔ انھوں نے آگاہ کیا ہے کہ اے آئی بڑے پیمانے پر ملازمتوں کو نقصان پہنچانے کے ساتھ ساتھ سماج میں بدامنی پیدا کرسکتا ہے۔ جیفری کے مطابق آخر میں اے آئی انسانوں سے بھی زیادہ ذہین ہوجائے گا۔ ہنٹن نے انٹرویو میں کہا کہ انسانیت ایک اہم موڑ پر پہنچ رہی ہے اور محققین انسانوں سے

زیادہ ذہین مشینیں بنانے کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ کئی ماہرین کا خیال ہے کہ اے آئی اگلے 20 برسوں میں انسانی ذہانت کو پیچھے چھوڑ دے گا۔ اور کئی شعبوں میں ایسا پہلے ہی ہو چکا ہے۔ ہنٹن نے کہا کہ انسانوں کو اس پر فوری توجہ دینے اور زیادہ سے زیادہ تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے خبردار کرتے ہوئے کہا کہ اگر ہم انھیں ایسا بنا دیتے ہیں تو انھیں ہماری پرواہ نہ ہو تو وہ شاید ہمیں بھی ختم کر دیں گے۔ حالانکہ اپنے خدشات کے باوجود ہنٹن نے کہا کہ وہ اے آئی پر اپنا کام جاری رکھیں گے اور تعلیم اور صحت کو بہتر بنانے کے لیے اے آئی کی صلاحیت کے استعمال پر زور دیں گے۔

روزنامہ صحافت، 23 جنوری 2026

رسم اجرا

کتاب 'ہندی افعال کا بامعنی مطالعہ' کی رسم رونمائی

نئی دہلی: خالدہ زاہدی کی مترجم کتاب 'ہندی افعال کا بامعنی مطالعہ' کا اجرا ایوان غالب آڈیٹوریم میں عمل

آیا۔ یہ معروف محقق ڈاکٹر کرشن گوپال رستوگی کی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ تقریب کی صدارت ڈاکٹر سید فاروق نے کی، جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے سابق صدر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، پروفیسر محمد صادق نے شرکت کی۔ مہمانان ذی وقار میں ڈاکٹر رنجنا رستوگی، ایڈوکیٹ خلیل الرحمٰن، غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد، ڈاکٹر رمندر سنگھ اور ڈاکٹر خلل ہما شامل تھے۔ نظامت کے فرائض ناصر امروہوی نے انجام دیے۔ ڈاکٹر سید فاروق نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ اب تک انھوں نے جتنی کتابیں پڑھی ہیں، ان میں یہ کتاب نہایت ممتاز ہے۔ مصنف نے بڑی محنت اور جانفشانی سے مواد یکجا کیا ہے، جبکہ خالدہ زاہدی نے اسے اردو قالب میں ڈھال کر استفادے کے دائرے کو وسیع کر دیا ہے۔

ایڈوکیٹ خلیل الرحمٰن نے کہا کہ انھیں اس بات کی خوشی ہے کہ یہ اہم کتاب اردو میں بھی شائع ہو گئی، جس سے اس کے قارئین کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔ ڈاکٹر خلل ہما نے کہا کہ یہ ترجمہ خالدہ زاہدی کی برسوں کی مسلسل ادبی کاوشوں کا ثمر ہے۔ یہ ایک اہم اور ذمہ دارانہ کام تھا، جسے انھوں نے اپنی چھوٹی بہن ساجدہ زاہدی کی معاونت سے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر ادریس احمد، خالدہ زاہدی، محترمہ ساجدہ زاہدی اور راجندر رستوگی وغیرہ نے کتاب پر اظہار خیال کیا۔ تقریب میں علم و ادب سے وابستہ اہم شخصیات کی کثیر تعداد موجود رہی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 فروری 2026

وفیات

پروفیسر محمد ذاکر کا سانحہ ارتحال

نئی دہلی: پروفیسر محمد ذاکر کا انتقال شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ ہی نہیں بلکہ ادبی خاندان کے لیے ایک جاں

کاہ صدمہ ہے۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز ترجمہ نگار، ادیب اور سابق صدر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر محمد ذاکر کی رحلت پر شعبے میں منعقد تعزیتی جلسے میں صدر شعبہ پروفیسر کوثر مظہری نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ درس و تدریس سے ان کی والہانہ شیفتگی، ادب فہمی کا منفرد اور ذاتی طرز، فارسی اور انگریزی تراجم اور اپنی نوعیت کی وضع دار شخصیت کے نقوش تادیر علم دوست اذہان پر مرتسم رہیں گے۔ واضح رہے کہ پروفیسر محمد ذاکر کا انتقال گزشتہ دنوں 28 دسمبر 2025 کو دہلی میں ہو گیا تھا۔ تعزیتی جلسے میں صدر شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی نے مرحوم سے اپنی کچھ ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ میں ان سے بہت متاثر ہوا۔ لفظوں سے غیر معمولی دلچسپی اور الگ زاویے سے شعر کی قرأت کے حوالے سے وہ اپنے عہد میں ممتاز نظر آتے تھے۔ صدر شعبہ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ پروفیسر اسلم جمشید پوری نے گہرے صدمے اور جذباتی کیفیت میں کہا کہ میں ان کا باقاعدہ شاگرد ہوں۔ وہ ان اساتذہ میں سے تھے، جن کے دم سے اردو کے شعبوں میں آج بھی رونق و رعنائی ہے۔ لسانیات پر ان کی گہری نظر سے ہم نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ جلسے میں رنج و ملال کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ مرحوم اپنی ہر ادا میں منفرد تھے۔ گفتگو، وضع قطع، تقریر و تحریر، سب میں ایک شائستگی اور وقار کی آمیزش تھی۔ پروفیسر احمد محفوظ نے ان سے وابستہ یادوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ میں نے انھیں کبھی علم و ادب کے علاوہ کوئی فضول بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جب بھی ملتے کسی لفظ، کسی شعر کے حوالے سے ہی باتیں کرتے۔ پروفیسر ندیم احمد نے کہا کہ ذاکر صاحب ملتے تو نہایت خلوص، شفقت اور محبت کا مظاہرہ کرتے اور یہ ضرور پوچھتے کہ آج کل کیا علمی اور ادبی مشغلہ ہے۔ پروفیسر عمران احمد عندلیب نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم صحیح معنوں میں منتخب روزگار استاذ تھے اور انھوں نے کئی نسلوں کی غیر معمولی تربیت کی۔ پروفیسر سرور الہدیٰ نے ان کی یادوں، باتوں اور ملاقاتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک مختلف سانچے میں ڈھلی ہوئی شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا ذہن ہمہ وقت علمی و ادبی کارگزاری میں سرگرداں رہتا تھا۔ ڈاکٹر شاہ عالم نے اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ مجھے باضابطہ ان کی شاگردی کا شرف حاصل ہے۔ میں نے ان جیسے باکمال اساتذہ بہت کم دیکھے ہیں۔ ڈاکٹر خالد مبشر نے اپنے تعزیتی کلمات میں کہا کہ وہ ہماری نسل کے لیے استاذ الاساتذہ کا درجہ رکھتے تھے۔ ان کی تحریریں اور تقریریں ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ ڈاکٹر سید تنویر حسین نے انھیں یاد کرتے ہوئے کہا کہ ان کی عاجزی، انکساری، عالمانہ وقار اور نازک حالات میں ان کی بردباری اور خوش اسلوبی ان کی نمایاں صفات تھیں۔ ڈاکٹر محمد مقیم نے بھی تعزیت اور اظہار افسوس کرتے ہوئے دعائے مغفرت کی۔

روزنامہ صحافت، 17 جنوری 2026

صحافی رفیق احمد کا انتقال

مہنداول، سنت کبیر نگر: مہنداول حلقہ کے سانڈا باشندہ اور روزنامہ دینک بھاسکر کے صحافی رفیق احمد کا مختصر علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ انھیں بعد نماز ظہر ان کے آبائی قبرستان سانڈا میں سیکڑوں سوگواروں کی موجودگی

میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ ان کی موت کی خبر سے تمام صحافیوں میں رنج وغم دیکھا گیا۔ صحافیوں نے کہا کہ وہ ایک صاف گو انسان تھے معاشی طور پر کمزور ضرور تھے مگر دل کے بڑے غنی تھے بڑے ہی خوش طبع اور نرم مزاج انسان تھے۔ آج غریبوں کی آواز اور عوام کے مسائل اعلیٰ افسران تک پہنچانے والی ایک عظیم آواز خاموش ہوگئی۔ صحافت کی بے لوث خدمت کرنے والوں کی اگر فہرست مرتب کی جائے تو رفیق مرحوم کا نام نامی اس میں ضرور شامل ہوگا۔ اللہ ان کے اہل خانہ متعلقین اور چاہنے والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ان کے انتقال پر امراجالا کے صحافی ونود اگر ہری، عنبر بستوی، پون صبا، پرین نرائن، کے ڈی صدیقی، اطہر الباری، محبوب پٹھان وغیرہ نے تعزیت پیش کی غم کا اظہار کرتے ہوئے اہل خانہ سے اظہار تعزیت کیا۔

روزنامہ صحافت 23 جنوری 2026

صحافی مارک ٹلی کا انتقال

نئی دھلی: معروف مصنف اور سینئر صحافی مارک ٹلی کا اتوار 25 جنوری 2026 کو نئی دہلی کے ایک پرائیویٹ

اسپتال میں انتقال ہوگیا، وہ 90 سال کے تھے۔ یہ اطلاع ان کے ایک قریبی دوست نے دی ہے۔ اپنی صحافت کے لیے متعدد قومی اور بین الاقوامی ایوارڈ جیتنے والے مارک ٹلی کچھ عرصے سے بیمار چل رہے تھے اور گزشتہ ایک ہفتے سے ساؤتھ دہلی کے ساکیت میں واقع میکس اسپتال میں زیر علاج تھے۔ 24 اکتوبر 1935 کو کولکاتا میں پیدا ہوئے مارک ٹلی 22 برسوں تک بی بی سی نئی دہلی کے بیورو چیف رہے۔ بی بی سی ریڈیو-4 کے مشہور پروگرام 'سمتھنگ انڈر اسٹوڈ' کے پریزنٹر بھی رہے۔ مارک ٹلی 4 سال کی عمر میں دارجلنگ کے ایک برٹش بورڈنگ اسکول پہنچے اور 9 سال کی عمر میں مزید تعلیم کے لیے برطانیہ چلے گئے۔ کیمبرج میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مارک ٹلی نے چرچ آف انگلینڈ میں پادری بننے کی خواہش ظاہر کی، لیکن لنکن تھیولوجیکل کالج میں 2 سمیسٹر کے بعد انھوں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ جولائی 1994 میں استعفیٰ دینے سے قبل 30 سال تک مارک ٹلی نے برٹش براڈ کاسٹنگ کارپوریشن (بی بی سی) کے ساتھ کام کیا۔ انھوں نے ہندستان کے تمام بڑے واقعات کی کوریج کی، جن میں بھوپال گیس سانحہ اور آپریشن بلیو اسٹار وغیرہ شامل ہیں۔

روزنامہ ہمارا سماج 26 جنوری 2026

معروف شاعر طاہر فراز کی رحلت

ممبئی: اردو ادب کے مشہور معتبر شاعر طاہر فراز رامپوری (72) کا کل دیر رات انتقال ہوگیا۔ رامپور سے تعلق

رکھنے والے طاہر فراز 29 جون 1953 کو اتر پردیش کے شہر بدایوں میں پیدا ہوئے تھے۔ فلموں میں کام اور مشاعروں کے سلسلے میں پوری دنیا کا سفر کرنے والے جناب فراز ممبئی میں ایک شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ وہیں ان کے سینے میں اچانک شدید درد ہوا، جس کے بعد انھیں اسپتال منتقل کیا گیا، لیکن وہ جانبر نہ ہو سکے۔ طاہر فراز اسٹیج کے انتہائی مقبول شاعر تھے۔ ان کی غزلیں براہ راست لوگوں کے دلوں میں اتر جاتی تھیں۔ انھوں نے فلموں کے لیے گیت بھی لکھے اور ان کی غزلوں کو جگجیت سنگھ جیسے گلوکاری کے اساتذہ نے اپنی آواز دی۔

دو دہائی قبل آنے والے حب الوطنی سے لبریز فلمی گیت اے وطن، اے وطن، جان جاں جان من۔۔۔ نے انھیں گھر گھر مشہور کر دیا تھا۔ تاہم مسٹر فراز کی ادبی خدمات صرف یہیں تک محدود نہیں ہیں۔ انھیں مشاعروں کی روایت کو وقار اور جدت بخشنے کے لیے جانا جاتا ہے۔ رومانوی مگر سنجیدہ اسلوب کے شاعر طاہر فراز کی شاعری میں زندگی کا فلسفہ اور محبت کی تہذیب ایک ساتھ نظر آتی ہے۔ طاہر فراز کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں اتر پردیش کا سب سے بڑا شہری اعزاز 'یش بھارتی سمان' اور ملک و بیرون ملک سے متعدد انعامات سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ دہلی لکھنؤ اور دیگر ریاستوں کی اردو اکادمیوں نے بھی انھیں اعزازات دیے۔ بین الاقوامی سطح پر امریکہ، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات وغیرہ کے ادبی اداروں نے انھیں 'لائف ٹائم اچیومنٹ' اور 'شیکھر سمان' جیسے ایوارڈز دیے۔ ان کے شعری مجموعوں میں غزلوں اور گیتوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، جن میں، کشکول اور زندگی کے موڑ پر کافی مقبول ہوئے۔

روزنامہ صحافت 26 جنوری 2026

شاعر رئیس انصاری کا انتقال

لکھنؤ: شاعر رئیس انصاری کا طویل علالت کے بعد بدھ کی صبح انتقال ہوگیا۔ وہ عرصہ سے علیل تھے اور گزشتہ

7 جنوری 2026 سے وینٹی لیٹر پر تھے۔ ان کی عمر تقریباً 74 برس تھی۔ رئیس انصاری کے انتقال کی خبر سے علمی وادبی حلقوں میں سوگ کی لہر دوڑ گئی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹے اور ایک بیٹی شامل ہے۔ بعد نماز عصر مولانا خالد رشید فرنگی محلی کی اقتدا میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور بڑی تعداد میں سوگواروں کی موجودگی میں انھیں عیش باغ قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ رئیس انصاری کا اصل نام سید عبدالقوی ہے۔ یکم مارچ 1951 میں لکھنؤ کے دریائی پاٹا نالہ میں ان کی پیدائش ہوئی۔ 1975 سے ان کی باضابطہ شاعری کی ابتدا ہوئی اور 1979 میں پہلا مجموعہ 'تجربوں کی دھوپ' نام سے منظر عام پر آیا۔ اس کے علاوہ سچائیاں، ورثہ، تہذیب اور چوپال کے ساتھ 'ہمارا لکھنؤ' نام سے نثر لکھا، جو بہت مقبول ہوا۔ مشاعروں کی دنیا میں رئیس انصاری ایک بڑا نام تھا۔ انھوں نے مشاعروں میں سرگرم کردار ادا کیا اور نظامت بھی کی۔ دبستان لکھنؤ کی نمائندگی کرنے کے لیے انھوں نے برصغیر کے علاوہ عرب ممالک بالخصوص جدہ، قطر،

مسقط، دبئی، شارجہ نیز امریکہ وغیرہ ممالک کے ادبی اسفار کیے۔ انھیں والی آسی کا شاگرد ہونے کا بھی شرف حاصل رہا۔ انھوں نے روزنامہ قومی خبروں کے چیف ایڈیٹر کے طور پر بھی خدمات انجام دیں، اس کے علاوہ محاذ جنگ نام سے اخبار بھی نکالا۔ اپنے اداریوں کو 'ردعمل' کے نام سے شائع کرنا چاہتے تھے، لیکن حالات کے سبب یہ کام مکمل نہ ہوسکا۔ رئیس انصاری کے انتقال پر اراکین سنی یوتھ فیڈریشن، عبیداللہ ناصر سمیت دیگر اہم لوگوں نے اپنی تعزیت کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 جنوری 2026

صحافی اور شاعر اسد رضا کا انتقال

نئی دھلی: روزنامہ راشٹریہ سہارا کے سابق گروپ ایڈیٹر، مشہور صحافی اور معروف شاعر اسد رضا کا ایک

پرائیویٹ اسپتال میں تقریباً 74 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ خاندانی ذرائع کے مطابق پسماندگان میں ایک بیٹا اور دو بیٹی ہیں۔ ان کی پیدائش 2 جنوری 1952 کو ضلع بجنور (یوپی) ہوئی تھی۔ ان کے والد ظفر علی نقوی ریٹائرڈ گزیٹیڈ آفیسر تھے۔ ان کی تدفین ان کے آبائی وطن بجنور میں ہوئی۔ اٹیک کی وجہ سے انھیں ایک پرائیویٹ اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا جہاں ان کا انتقال ہوگیا۔ اسد رضا نے 1991 میں راشٹریہ سہارا جوائن کیا تھا جہاں سے وہ گروپ ایڈیٹر کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے تھے۔ ان کا اصل نام سید اسد رضا نقوی تھا لیکن اسد رضا کے نام سے لکھتے تھے اور اسی نام سے مشہور بھی تھے۔ وہ مضامین لکھنے کے ساتھ شاعری بھی کرتے تھے خاص طور پر مزاحیہ اور طنزیہ شاعری کرتے تھے۔ ان کی مطبوعات میں (1) آئینے احساس کے (شعری مجموعہ) (2) شوخی قلم (طنزیہ ومزاحیہ مضامین کا مجموعہ) (3) چاند نگر کی سیر (بچوں کے لیے بامقصد مزاحیہ کہانیوں کا مجموعہ) (4) شہر احساس (شعری مجموعہ) (5) ادبی اسپتال (مزاحیہ وطنزیہ مضامین) اور شوشے (طنزیہ ومزاحیہ مضامین کا مجموعہ) شامل ہیں۔ ان کی متعدد کتابوں پر بہار اور اتر پردیش اردو اکادمی نے انعام سے نوازا تھا۔ ان کی تخلیقات آل انڈیا ریڈیو، دوردرشن، برطانوی ریڈیو، ای ٹی وی وغیرہ سے ٹیلی کاسٹ ہوئیں، اردو، ہندی اور انگریزی میں دو ہزار کالم ومضامین شائع ہوئے۔ عالمی سہارا ٹی وی چینل پر سیاسی مبصر کے طور پر بھی مدعو کیے جاتے رہے تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 2 فروری 2026

جیتندر بلّو کا انتقال

ممبئی: اُردو کے مشہور فکشن نگار (89 سالہ) جیتندر

بلّو لندن میں انتقال کر گئے۔ اردو کے استاد الیاس شوقی نے یہ اطلاع دیتے ہوئے بتایا کہ جیتندر دیو لامبا المعروف جیتندر بلّو 18 نومبر 1937ء کو پیشاور میں پیدا ہوئے، انہوں نے دہلی یونیورسٹی سے گریجویشن کیا تھا، وہ 1975 تک ممبئی میں رہے، 1976 میں جیتندر بلو انگلینڈ ہجرت کر گئے، جہاں کل انہوں نے آخری سانسیں لیں۔ سینئر شاعر اور مترجم یعقوب راہی نے جیتندر بلو کی قلمی نگارشات پر بات کرتے ہوئے کہا کہ اُن کے کئی ناول اور افسانوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں سے چند نام اس طرح ہیں: پرائی دھرتی، اپنے لوگ، مہانگر، جزیرہ، وشواس گھات، پہچان کی نوک پر، انجانا کھیل، اپنے دیس میں، چکّر، درد کی حد سے پرے اور آخری پڑاؤ۔ ان کا سوانحی کولاژ دو حصوں میں 'دیکھو ہم نے کیسے بسر کی' ہی نہیں 'مَیں اور میری شخصیت' نامی کتاب بھی منظر عام پر آچکی ہے۔ ممبئی کے 'نیا ورق' جیسے ممتاز رسالے میں ان کی تخلیقات تواتر سے شائع ہوتی رہی ہیں۔ وہ لاولد تھے ان کے پسماندگان میں صرف بیوہ ہے۔

عالمی اخبار، ممبئی، 10 فروری 2026

کرشن کمار طور کا انتقال

نئی دہلی: اردو کے ممتاز شاعر وادیب کرشن کمار طور کا آج صبح چنڈی گڑھ میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 93 برس تھی۔

وہ کچھ دنوں سے بیمار تھے اور یہاں چنڈی گڑھ میں اپنی بیٹی کے یہاں رہ کر علاج کرا رہے تھے۔ پسماندگان میں ان کی اہلیہ، ایک بیٹا جو آسٹریلیا میں مقیم ہے، اور ایک بیٹی ہیں۔ آج ہی چنڈی گڑھ کے سیکٹر 25 میں واقع شمشان میں اُن کا انتم سنسکار کردیا گیا۔ کئی شعری مجموعوں کے خالق کرشن کمار طور نے تقسیم ہند کے بعد بھارت آکر ہماچل پردیش کے شہر دھرم شالہ میں رہائش اختیار کی تھی۔ یہیں سے انھوں نے 'سرسبز' نامی رسالے کو جاری کیا جو وہ آخری عمر تک شائع کرتے رہے۔ ملک وبیرون ملک مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، غالب ایوارڈ، مولانا حالی ایوارڈ سمیت کئی اعزازات وانعامات سے نوازا جاچکا تھا۔ ان کے انتقال پر اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر اور معروف شاعر چندر بھان خیال نے انتہائی دکھ ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ طور صاحب بے حد شریف، نیک دل اور انسان دوست شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک سچے عاشق اردو تھے اور تمام عمر اردو زبان وادب کی خدمت کرتے رہے۔ انہوں نے کہا کہ طور صاحب جدید اردو غزل کے بڑے شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی محبتیں، کرم فرمائیں کبھی بھی فراموش نہیں ہوں گی۔ اظہار تعزیت کرنے والوں میں ادیب و شاعر ڈاکٹر زاہد ابرول (جدید فکر وفن) کے ایڈیٹر، ڈاکٹر زاہد ابرول، ڈاکٹر حبیب سیفی، محمد ہارون اردو اکادمی دہلی، انصاری اطہر حسین، فلاح الدین فلاحی، محمد یوسف انصاری، محمد شریف ریاضی، ایڈوکیٹ عمران عظیم، عرفان راہی صیدپوری، ایس ٹی رضا، ثناء اللہ، واجد علی انصاری قابل ذکر ہیں۔

میرا وطن، دہلی، 11 فروری 2026

عالمی اردو کانفرنس 2026 کے شرکا

उर्दू दुनिया, मार्च–2026, वर्ष:28, अंक:03
URDU DUNIYA Monthly, March-2026, Vol.28, Issue:03
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/02/2026**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326، A/C: IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 040 - 24415194

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Md Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Salasar Imaging Systems, A-97, Sector-58 Noida-201301(UP)
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6